مکسیم گورکی

بچپن

گورکی کے نانا جہازی تھے۔ سال سے لدے ہوئے جہاز لےکر والگا کی لہروں پر نکلا کرتے تھے۔ باپ فرنیچر بنانے والے تھے۔ لڑکے نے امیر سوداگر کی جوتوں کی دوکان میں کام کیا، مقدس شبیہوں کی دوکان میں کام سیکھا، نان بائی کے یہاں ملازم کی خدمت انجام دی، لوہار کا کام کیا — یہ تھا زندگی کا وہ راستہ جس پر خود گورکی کو چلنا پڑا (۱۹۳۶ء—۱۸٦۸ء)، ہاں اس پیچ و خم سے نیژنی نووگورود کے اس کاریگر الیکسئی پیشکوف کو گزرنا پڑا جو بعد میں عظیم پرولتاری ادیب بنا۔

ناول ''بچپن،، اس لڑکے الیوشا کی کہانی ہے — اس لڑکے کی کہانی جو باپ کی موت کے بعد اپنے بگڑےدل نانا کے گھر نیژنی نووگورود آتا ہے۔ اس کہانی میں اس زمانے کے روس کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ اس میں ادیب کی ماں کا اسیج پیش کیا گیا ہے اور الیوشا کے عزیزوں اور دوستوں کی تصویر — کاریگر تسیگانوک اور کرایہ‌دار ''بہت خوب،، کی تصویر۔ کتاب میں اس ہستی کا دل دھڑکتا ہے جو لڑکے کو سب سے زیادہ عزیز تھی — زندہ‌دل اور زندگی سے سرشار نانی کا دل اور ان کی ''رنگارنگ،، کہانیوں کی جادو بھری دنیا۔ ''بچپن،، (۱۹۱۳ء) مصنف کی تین جلدوں پر مشتمل آپ بیتی کی پہلی جلد ہے۔ باقی دو ہیں — ''زندگی کی شاہراہ پر،، اور ''منزل کی تلاش،،۔ ہر جلد بجائے خود ایک ناول ہے۔

منتخب سوویت ادب کی لائبریری

میکسم گورکی

بچپن

دوسرا ایڈیشن

دارالاشاعت ترقی
ماسکو ۱۹۷۳ء

ترجمہ : رضیہ سجاد ظہیر

نظرثانی اور آخری چار باب کا ترجمہ : انور عظیم

پڑھنے والوں سے

دارالاشاعت ترقی آپ کا بہت شکر گذار ہوگا اگر آپ ہمیں اس کتاب، اس کے ترجمے، ڈیزائن اور طباعت کے بارے میں اپنی رائے لکھیں۔ اس کے علاوہ بھی اگر آپ کوئی مشورہ دے سکیں تو ہم ممنون ہوں گے۔

ہمارا پتہ : زوبوفسکی بلوار۔ نمبر ۲۱
ماسکو، سوویت یونین
21, Zubovsky Boulevard, Moscow, USSR

М. ГОРЬКИЙ

Детство

на языке урду

اپنے بیٹے کے نام

۱

چھوٹے سے نیم تاریک کمرے کی کھڑکی کے نیچے فرش پر میرے اباسیدھے سید ھے لیٹے ہوئے تھے۔ ان کا جسم سفید لباس میں ڈھکا ہوا تھا اور بہت لمبا لگ رہا تھا۔ ننگے پاؤں کی انگلیاں عجیب طرح سے پھیلی ہوئی تھیں اور ان کے شفیق ہاتھوں کی انگلیاں بھی، جو سینے پر آڑی رکھی ہوئی تھیں، ٹیڑھی میڑھی نظر آ رہی تھیں۔ ان کی آنکھیں جن میں ہمیشہ ہنسی ناچتی رہتی تھی تانبے کے گہرے رنگ کے سکوں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ شفیق چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی اور بیٹھی ہوئی بتیسی کی چمک سے مجھے ڈر لگ رہا تھا۔

میری ماں صرف سرخ رنگ کا لہنگا پہنے ان کے پاس سر نہوڑائے دوزانو بیٹھی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں وہ سیاہ کنگھی تھی جس سے میں کبھی کبھی آری کی طرح تربوز کاٹا کرتا تھا۔ کنگھی سے وہ باربار میرے ابا کے نرم بالوں کو پیچھے کی طرف سنوارتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں، مدھم لہجے سے کچھ بین کرتی جاتی تھیں۔ ان کی سرمئی نیلی آنکھیں روتے روتے سوج گئی تھیں اور لگتا تھا جیسے آنسوؤں میں گھل کر بہہ جائیں گی۔

میری نانی میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھیں۔ میری نانی گدبدے جسم کی عورت تھیں، بڑا سا سر، کٹورا سی آنکھیں اور کچھ عجیب پکوڑا سی ناک۔ ان کا رنگ سنولایا ہوا تھا مگر

نرم و نازک اور بےحد دلکش۔ وہ بھی رو رہی تھیں اور کچھ عجیب انداز سے بین کرنے میں میری ماں کا ساتھ دے رہی تھیں جیسے ان سے سر ملا رہی ہوں۔ ان کا سارا جسم ہچکیوں سے ہل رہا تھا۔ وہ باربار مجھے ابا کی طرف دھکیلتی تھیں لیکن میں جھجک کر پیچھے کو ہٹ جاتا تھا اور ان کے لہنگے کے گھیر میں چھپنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے بہت گھبراہٹ اور خوف محسوس ہو رہا تھا۔

اس سے پہلے میں نے کبھی بڑوں کو روتے نہیں دیکھا تھا اور اپنی نانی کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔

''جاؤ بیٹا، جاؤ،، وہ آہستہ آہستہ کہتی جا رہی تھیں۔ ''اپنے ابا سے رخصت ہو لو۔ اب وہ تمہیں کبھی نہیں ملینگے۔ کبھی نہیں۔ وہ چل بسے میرے بچے۔ چل بسے! ہائے ابھی کیا ان کے مرنے کے دن تھے! اس کا وقت تھوڑا ہی آیا تھا!!،،

میں حال ہی میں ایک سخت بیماری سے اٹھا تھا جس کے دوران میں میرے والد اکثر میرے پاس بیٹھے رہتے تھے اور ہم دونوں مزے میں کھیلا کرتے تھے۔ یہ بات میرے ذہن پر اچھی طرح نقش ہے۔ لیکن یکایک ابا غائب ہوگئے اور ان کی جگہ میری نانی نے لے لی، جو میرے لئے بالکل اجنبی تھیں۔

''نانی کہاں سے آئیں؟ بہت دور سے نا؟ آپ تو چلتے چلتے تھک گئی ہوں‌گی؟،، میں نے پوچھا۔

''ارے نہیں، بدھو۔ پانی پر بھی کوئی چلتا ہے؟ اسٹیمر سے آئی ہوں! نیژنی * سے اوپر آنا تھا نا!،،

میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اوپر؟ اوپر تو ہمارے گھر میں کچھ اور لوگ رہتے تھے — کچھ ایرانی لوگ جن کی داڑھیاں رنگی ہوئی تھیں۔ اور نیچے تہہ خانے میں ایک زرد رنگ کا بڈھا کالمیک رہتا تھا جو بھیڑ کی کھالیں بیچتا تھا۔ ویسے جو زینہ تھا اس کے کٹھرے ریلنگ پر سے پھسل کر بھی نیچے اتر سکتے تھے۔

---

* نیژنی نوو گورود — ایک شہر جس کا نام اب گورکی ہے۔ روسی زبان میں ''نیژنی،، کے معنی نیچے ہیں۔ (ایڈیٹر۔)

قلابازی کھاتے ہوئے بھی اترا جا سکتا تھا۔ لیکن اس میں پانی کا کیا سوال تھا؟ ضرور وہ کچھ گڑبڑا رہی تھیں!

''مجھے بدھو کیوں کہتی ہو نانی؟''

''کیونکہ تم اتنے بڑے دھانگڑ ہو گئے ہو اور کھوپڑی میں عقل ذرا نہیں'' وہ ہنس پڑیں۔

میری نانی کے بات کرنے کے انداز میں شفقت تھی، ذہانت تھی اور جب وہ الفاظ کو کھینچ کر بولتی تھیں تو مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ پہلے ہی دن سے میری ان کی گاڑھی چھننے لگی۔ اور اس وقت میری سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ ہم دونوں اس کمرے سے باھر نکل جائیں۔

اپنی ماں کو دیکھ دیکھ کر میرا جی گھبرا رہا تھا۔ ان کے آنسوؤں اور بین نے میرے دل میں ایک نئی آگ لگادی، ایک نئی کسک پیدا کردی۔ اس سے پہلے میں نے ان کی یہ کیفیت کبھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ ویسے ہمیشہ رکھ رکھاؤ کی عورت تھیں، ادھر ادھر کی گپاسٹک کرنا ان کو پسند نہ تھا۔ ہمیشہ صاف ستھری رھتیں، ان کا بھاری گٹھا ہوا جسم گھوڑی کی طرح سڈول اور پھرتیلا تھا، ان کے ہاتھ بہت بڑے بڑے اور غضب کے مضبوط تھے۔ لیکن اس وقت ان کا پورا وجود جگہ جگہ سے چٹخا ہوا معلوم ہوتا تھا، آنکھیں سوجی ہوئی تھیں، کپڑے تارتار تھے اور گھنے بال جو ہمیشہ کھنچے ہوئے، سنہرے گول جوڑے کی شکل میں گردن کے پیچھے اکٹھے رہتے تھے، اس وقت ان کے ننگے کندھوں اور آنکھوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ ایک لمبی لٹ میرے باپ کے مردہ چہرے پر پڑی ہوئی تھی۔ میں دیر سے کمرے میں کھڑا تھا لیکن وہ میرے باپ کے بالوں کو سنوارنے اور رونے پیٹنے میں اتنی کھوئی ہوئی تھیں کہ انہوں نے ایک بار بھی نظر اٹھا کر میری طرف نہیں دیکھا۔

پہرے کے سپاہی اور چند کسانوں نے جھانک کر دیکھا جن کے چہرے دھکتے ہوئے لگ رہے تھے۔

''ارے جلدی کرو نا۔ جلدی باھر نکالو'' سپاہی نے کچھ بگڑ کے کہا۔

کھڑکی پر ایک سیاہ شال ڈال دی گئی تھی جو اندر آتی ہوئی

هوا سے بادبان کی طرح پھول کر اڑ رہی تھی۔ ایک بار میں نے اپنے ابا کے ساتھه ایک بادبانی کشتی میں سفر کیا تھا۔ ایک دم سے بجلی بڑے زور سے کڑکی تھی۔ میرے باپ نے هنس کر مجھے اپنے زانوؤں میں دبا لیا تھا اور چلائے:

''ڈرو نہیں بیٹا! ڈر کی کیا بات ہے!''

یکایک میری ماں اپنی جگہ سے اٹھه کھڑی ہوئیں، پھر ایک دم اسی جگہ سلسلا کے بیٹھه گئیں۔ ان کے لمبے لمبے بال زمین پر جھاڑو دے رہے تھے، چہرے پر مردنی چھا گئی تھی، آنکھیں پتھرا گئی تھیں اور ابا کی طرح ان کی بھی بتیسی بیٹھنے لگی۔

'دروازہ بند کرو...''، انہوں نے ڈراؤنی آواز میں کہا۔ ''الیکسئی کو باهر لے جاؤ۔''

میری نانی نے مجھے باهر دھکیلا اور دروازہ بند کرنے دوڑیں۔ ''ارے بھلے لوگو، ڈرو نہیں!''، وہ چیخنے لگیں۔ ''اس کو هاتھه مت لگاؤ! باهر جاؤ، تمہیں یسوع مسیح کا واسطه! یه هیضه نہیں ہے، یه تو درد ہے، درد! ترس کھاؤ لوگو ـــ هٹ جاؤ!''

میں ایک اندھیرے کونے میں صندوق کے پیچھے چھپ گیا اور وهیں سے ماں کو زمین پر لوٹتے دیکھنے لگا۔ وہ اپنے دانت کچکچا کر فرش پر تڑپ رہی تھیں اور آهیں بھر بھر کے کراہ رہی تھیں۔ میری نانی ادھر ادھر کھسکتی کھسکتی خوشی اور نرمی سے بڑبڑاتی ہوئی ان کو باربار کہتی جا رہی تھیں:

''یسوع مسیح کے لئے، وریوشا * ذرا تو درد کماؤ! ذرا تو صبر سے کام لو، تمہیں خدا اور اس کے بیٹے کا واسطه! ذرا پاک مریم کو یاد کرو نا جو بڑی رحیم ہے، بڑی...''

میرا خوف کے مارے برا حال تھا۔ اور وہ دونوں اسی طرح میرے ابا کے پاس فرش پر ادھر ادھر ڈھلکتی پھر رہی تھیں، کراهتی، آهیں

---

* روسی میں قاعدہ یه ہے که محبت اور قربت کے اظہار کے لئے نام کا آخری ٹکڑا بدل دیا جاتا ہے، مثلاً میخائل میشا بن جاتا ہے، وروارا ـــ واریا، وریوشا، الیکسئی ـــ الیوشا ـــ (ایڈیٹر۔)

بھرتی وہ کبھی کبھی بالکل ان سے لپٹ جاتیں۔ لیکن وہ اسی طرح خاموش لیٹے تھے، بے حس و حرکت، جیسے ان دونوں کی ان حرکتوں پر چپکے چپکے ھنس رہے ھوں! وہ فرش پر دیر تک تڑپتی رھیں۔ میری ماں نے کئی بار کھڑے ھونے کی کوشش کی لیکن پھر گر پڑیں! میری نانی سیاہ گیند کی طرح اپنے کالے لباس میں لپٹی سٹاسٹ کبھی اندر آتیں کبھی باھر جاتیں۔ پھر یکایک اندھیرے میں سے ایک ننھے بچے کے رونے کی آواز بلند ھوئی۔

''یاخدا، تیرا شکر ھے،، میری نانی نے اطمینان کی سانس لی۔ ''بیٹا ھوا!،،

پھر انھوں نے شمع روشن کی۔

میں غالباً سو گیا ھوں گا کیونکہ اس کے بعد مجھے کچھ یاد نہیں کہ کیا ھوا۔

اس واقعہ کے بعد میری دوسری گہری یاد یہ ھے کہ پانی برس رہا تھا اور ھم لوگ قبرستان کے ایک اجاڑ کونے میں تھے۔ لوگ میرے ابا کے تابوت کو ایک گہرے گڑھے میں اتار رھے تھے جو غار کی طرح منہ پھاڑے ھوئے تھا اور اس گڑھے کے کنارے مٹی اکٹھی ھونے سے جو ٹیلہ بن گیا تھا میں اس پر کھڑا تھا اور غار کے اندر جھانک رہا تھا۔ گڑھے میں پانی تھا اور پانی میں مینڈک تیر رھے تھے۔ دو مینڈک اچھل کر اس تابوت کے بادامی ڈھکنے پر بیٹھ گئے جس میں میرے ابا کی لاش تھی۔

اس وقت قبر کے آس پاس گنتی کے لوگ تھے — ایک قبرستان کا چوکیدار جس کے کپڑوں سے پانی ٹپک رہا تھا، دو گورکن، جو منہ بنائے اور ھاتھوں میں بیلچے اٹھائے کھڑے تھے، نانی اور میں۔ ھم سب ھی گرم بارش کی پھواروں سے بھیگ رھے تھے۔

قبرستان کا چوکیدار بولا:

''چلو، مٹی ڈالو۔،،

میری نانی اپنی شال کا سرا آنکھوں پر رکھ کر زار وقطار رونے لگیں۔ گورکن جھکے اور بیلچے بھر بھر کر جلدی جلدی مٹی قبر میں ڈالنے لگے۔ پانی میں مٹی سے چھپا چھپ ھونے لگی اور دونوں مینڈک گھبرا گھبرا کر قبر کی دیواروں پر اچھلنے لگے لیکن گرتی ھوئی مٹی

کے جھونکے میں وہ بھی نیچے دب گئے اور ان کے اوپر اور مٹی پڑتی چلی گئی۔

'الیوشا، ادھر آ جاؤ بیٹا،، نانی نے میرے کندھے پکڑ کر مجھ کو کھینچا۔ لیکن میں نکل گیا، میرا وہاں سے ہٹنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔

''اے پروردگار!،، انہوں نے ایک آہ بھری۔ اس آہ سے یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ مجھ سے شکوہ تھا یا پروردگار سے۔ پھر وہ بڑی دیر تک سر جھکائے ساکت کھڑی رہیں، یہاں تک کہ جب قبر مونہا منہ بھر گئی تب بھی وہ وہیں کھڑی رہیں۔

گورکنوں نے الٹے بیلچوں سے قبر کو پیٹ پاٹ کے برابر کر دیا۔ پھر یکایک ہوا بڑی تیزی سے چلنے لگی اور بارش کی پھوار اپنے ساتھ اڑا لے گئی۔ نانی نے میرا ہاتھ پکڑا اور دور ایک گرجے کی طرف لے چلیں جو سیاہ صلیبوں کے جنگل میں گھرا کھڑا تھا۔ جب ہم قبرستان سے باہر نکل آئے تو انہوں نے مجھ سے پوچھا:

''تم روتے کیوں نہیں؟ تمہیں رونا چاہئے۔،،

''جی نہیں چاہتا۔،،

''اچھا، اگر جی نہیں چاہتا تو جانے دو، نہ روؤ،، وہ دھیمے سے بولیں۔

مجھے اس بات پر بہت تعجب ہوا تھا کہ انہوں نے مجھ سے رونے کو کہا کیونکہ میں شائد ہی کبھی روتا تھا۔ جب میرے دل پر کوئی چوٹ لگتی تھی تب ہی میں روتا تھا ورنہ جسمانی تکلیف پر کبھی نہیں۔ میرے ابا تو میرے رونے پر اکثر ہنس پڑتے تھے لیکن اماں بڑے زور سے خفا ہوتی تھیں:

''خبردار جو رویا!،،

پھر ہم دونوں گھوڑا گاڑی میں بیٹھے اور ایک چوڑی سی کیچڑ سے بھری ہوئی سڑک سے گذرے جس کے دونوں طرف سرخ سرخ عمارتیں تھیں۔

''نانی اماں! وہ مینڈک اب کیسے نکلیں گے؟،، میں نے پوچھا۔

''اب وہ بیچارے کیا نکلیں گے — اب خدا ہی حافظ ہے ان کا،، نانی نے جواب دیا۔

میرے ابا اور میری اماں کبھی خدا کا نام اس قدر دھڑلے سے نہیں لیا کرتے تھے اور نہ اتنے اپنے پن سے۔

چند دن بعد میری ماں، نانی اور میں اسٹیمر کے ایک چھوٹے سے کیبن میں بیٹھے تھے۔ میرا ننھا بھائی میکسم مر چکا تھا اور ایک سفید کپڑے میں بنڈل کی طرح لپٹا لپٹایا اور سرخ فیتے سے بندھا جھندا ، کونے میں رکھی ہوئی میز پر پڑا تھا۔

میں صندوقوں اور گٹھریوں پر چڑھا بیٹھا تھا اور باہر نکلی ہوئی چھوٹی سی گول کھڑکی میں سے سیر کر رہا تھا۔ یہ کھڑکی مجھے بالکل گھوڑے کی پھولی ہوئی آنکھ کی طرح لگتی تھی۔ جھاگ سے بھرے ہوئے گدلے پانی کا ریلا بار بار آ کر شیشے میں لگتا۔ کبھی کبھی تو اس زور سے لگتا کہ شیشہ بالکل ڈھک جاتا اور میں بو کھلا کر نیچے کود جاتا۔

"ارے ڈرست"، میری نانی کہتیں اور مجھے اپنے نرم بازوؤں میں اٹھا کر پھر گٹھریوں پر بٹھا دیتی تھیں۔

پانی کی سطح پر دور تک نمناک سرمئی دھند چھائی ہوئی تھی۔ کبھی کبھار ، دور، زمین کی ایک تاریک سی لکیر کہر میں سے ابھرتی اور پھر کہر میں گھل جاتی۔ ہمارے چاروں طرف ہر چیز ہل رہی تھی۔ صرف میری ماں ساکت اور خاموش تھیں۔ وہ ضبط اور تحمل کے ساتھ دیوار کے سہارے کھڑی ہوئی تھیں، دونوں ہاتھوں کو ملا کر سر کے پیچھے رکھے، آنکھیں بھینچ کے بند کئے۔ ان کا چہرہ سنولا گیا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ ان میں نہ جان باقی ہے نہ احساس۔ ایک لفظ ان کے منہ سے نہیں نکلتا تھا جیسے یکایک ان کی کایا پلٹ ہو گئی ہو — وہ کچھ سے کچھ ہو گئی ہوں، یہاں تک کہ جو لباس وہ پہنے تھیں وہ بھی جانا پہچانا نہیں لگتا تھا۔

میری نانی ہر پھر کے ان سے آہستہ سے کہتی تھیں:

"اگر تم کچھ کھا لیتیں تو... وریوشا... کچھ تھوڑا سا تو کھا لو بیٹی۔"

لیکن میری ماں اسی طرح خاموش اور ساکت رہیں۔

نانی مجھ سے جب بات کرتی تھیں تو بہت ہی مدھم لہجے میں کہ کسی کو سنائی نہ دے۔ میری ماں سے بات کرتیں تو آواز

کسی قدر اونچا کرکے، مگر بہت ہی احتیاط سے، رک رک کر، سنبھل سنبھل کر۔ مجھے ہمیشہ ایسا لگتا تھا کہ وہ میری ماں سے کچھ ڈرتی ہیں۔ میں بھی اپنی ماں سے ڈرتا تھا۔ اس لئے میں اور میری نانی بہت جلد ایک دوسرے کے نزدیک آ گئے۔

یکایک میری ماں بولی ''ساراتوف۔ کہاں ہے وہ ملاح؟،،

ان کی آواز میں بڑی تیزی اور تلخی تھی۔ جیسے ان کے الفاظ تک بدل گئے ہوں، ان کا لہجہ تک اجنبی ہو گیا ہو۔ کیا کہہ رہی تھیں وہ؟ کیا ساراتوف، کون ملاح؟

پھر ہمارے کیبن میں ایک بوڑھا آدمی داخل ہوا، چوڑا چکلا، نیلے کپڑے پہنے، ہاتھ میں ایک بکس لئے۔ نانی نے اس سے وہ بکس لے لیا اور میرے ننھے بھائی کی لاش اس میں رکھنے لگیں۔ رکھنے کے بعد وہ اسے دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر باہر چلیں۔ لیکن وہ اتنی موٹی تھیں کہ آڑی ہوئے بغیر دروازے سے نکلنا ان کے لئے ممکن نہ تھا۔ چنانچہ وہ وہیں کھڑی ہو گئیں اور بوکھلاکے چاروں طرف دیکھنے لگیں۔

''افوہ اماں،، میری ماں نے عاجز ہوکے کہا اور ان کے ہاتھوں سے تابوت گھسیٹ لیا۔ پھر وہ دونوں کی دونوں چلی گئیں اور میں اس نیلے کپڑےوالے ملاح کے ساتھ کیبن میں اکیلا رہ گیا۔ وہ پھر جھکا اور آہستہ سے بولا:

''تو تمہارا بھائی مر گیا، ہم لوگوں کو چھوڑکر چلا گیا؟،،

''آپ کون ہیں؟،،

''ملاح۔،،

''اور ساراتوف کون ہے؟،،

''ایک شہر ہے۔ دیکھو، کھڑکی سے باہر دیکھو، وہ رہا۔،،

اب کنارہ کھڑکی کے پاس سے گذرتا چلا جا رہا تھا۔ تاریک، جابجا سے اکھڑا ہوا اور دھند میں لپٹا جیسے کسی نے تازی ڈبل روٹی سے ایک موٹا سا توس تراش کر رکھ‌دیا ہو۔

''نانی اماں کہاں گئیں؟،،

''اپنے نواسے کو دفنانے۔،،

''تو کیا اس کو مٹی میں دبایا جائے گا؟،،

''ہاں اور کیا - مٹی میں تو دبایا ہی جائے گا - ،،

پھر میں نے اس ملاح کو بتایا کہ کس طرح جب میرے باپ کی لاش دفنائی گئی تو لوگوں نے اس کے ساتھہ دو زندہ مینڈکوں کو بھی دفنا دیا تھا - ملاح نے مجھے گود میں اٹھا لیا، بھینچ کر مجھے گلے لگایا اور پیار کرتے ہوئے بولا:

''ارے بیٹا، تم ابھی کیا جانو ان باتوں کو! ان مینڈکوں پر کیا ترس کھاتے ہو - ترس کے لائق تو تمہاری ماں ہے بیچاری - ان کمبختوں پر لعنت بھیجو - اپنی ماں کو تو دیکھو کہ صدمے کے مارے اس کی کیا درگت ہو گئی ہے - ،،

یکایک اوپر سے بڑے زوروں سے چیخم دھاڑ کی آوازیں آنے لگیں لیکن میں سمجھہ گیا کہ یہ اسٹیمر کی آواز ہے، اس لئے ڈرا نہیں - ملاح نے مجھے گود سے اتار دیا اور تیزی سے یہ کہتا ہوا باہر نکل گیا:

''لو بھئی — اب ہم تو چل دئے - ،،

چل تو میں بھی دینا چاہتا تھا اس لئے میں بھی کیبن سے باہر نکل آیا - تنگ و تاریک گیلری میں کوئی نہیں تھا - اور دروازے کے قریب سے مجھے زینے کا پیتل چمکتا نظر آ رہا تھا - میں نے اوپر نظر اٹھائی تو دیکھا کہ لوگ اپنا اپنا سامان اٹھائے، گٹھریاں سنبھالے، اترتے چلے جا رہے ہیں - اس کے معنی یہ تھے کہ سب لوگ اسٹیمر سے اتر رہے تھے — تو پھر مجھے بھی اترنا چاہئے تھا -

جب میں اسٹیمر سے اترنےوالے پٹروں کے نزدیک پہونچا جہاں دیہاتیوں کی بھیڑ تھی، تو سب مجھہ پر چلانے لگے:

''کون ہے بھئی تو؟ کس کا لڑکا ہے؟ کہاں سے آیا؟،،

''پتہ نہیں،، میں نے جواب دیا -

بہت دیر تک میں اس دھکم پیل میں پھنسا رہا - کسی نے مجھے دھکا دیا، کسی نے ٹٹولا، کسی نے کھینچا - آخرکار وہ نیلے کپڑوں والا بوڑھا ملاح وہاں آپہونچا اور بولا:

''ارے یہ وہاں سے آیا ہے - استراخان سے، اپنے کیبن سے نکل بھاگا - ،،

اس نے مجھے گود میں اٹھا لیا اور کیبن کی طرف دوڑا۔ وہاں اس نے مجھے پھر وہیں گٹھریوں پر بٹھا دیا اور جاتے جاتے انگلی ہلا کر دھمکاتے ہوئے بولا:

''اب جو یہاں سے ہلا تو ایسا دوں گا کہ یاد ہی کرے گا۔،،

رفتہ رفتہ اوپر کا شور دب گیا، اسٹیمر کی تھرتھراہٹ رک گئی، پانی کی چھپا چھاپ بند ہو گئی۔ ایک بھیگی ہوئی دیوار کیبن کی کھڑکی کے آگے آ گئی، اندھیرا ہو گیا اور گھٹن پیدا ہو گئی۔ لگتا تھا کہ گٹھریاں اور سامان سامنے سے گذرنے لگے اور میں ان میں گھر سا گیا۔ میں بہت گھبرا رہا تھا۔ اگر سب چلے گئے اور میں یہیں رہ گیا تو کیا ہوگا۔ اٹھ کر دروازہ دیکھا تو جکڑبند تھا۔ اور اس میں لگی ہوئی پیتل کی موٹھ مجھ سے گھومتی تک نہیں تھی۔ میں نے دودھ سے بھری ہوئی ایک بوتل جو وہیں رکھی ہوئی تھی اٹھائی اور پوری طاقت سے موٹھ پر دے ماری۔ بوتل کے ریزے ریزے ہو گئے اور دودھ میرے پیروں پر سے بہتا ہوا میرے جوتوں میں گھسنے لگا۔ اپنی ناکامیابی سے مایوس ہو کر میں گٹھریوں پر لیٹ گیا اور روتے روتے سو گیا۔

جب میری آنکھ کھلی تو اسٹیمر پھر تھرتھرا رہا تھا، پانی پھر چھپ چھپا رہا تھا اور کیبن کی کھڑکی سورج کی طرح چمکدار اور روشن تھی۔ میری نانی میرے پاس بیٹھی ہوئی کنگھی کر رہی تھیں اور منہ سکوڑ سکوڑ کے نہ جانے کیا بڑبڑاتی جا رہی تھیں۔ ان کے بال بہت لمبے، سیاہ اور بے حد گھنے تھے اور ان کے کندھوں اور سینے اور گھٹنوں پر سے ہوتے ہوئے فرش پر لوٹ رہے تھے۔ ایک ہاتھ سے وہ ان کو فرش پر سے اٹھاتیں، کس کے مٹھی میں پکڑتیں اور دوسرے ہاتھ سے لکڑی کی ایک بھدی سی کنگھی سے زور زور سے جھاڑتیں۔ ان کے لب سکڑے ہوئے تھے، آنکھوں سے جھلاہٹ اور بیزاری ظاہر ہو رہی تھی، ان کا چھوٹا سا چہرہ بالوں کی ان گھنی گھٹاؤں سے گھرا ہوا کچھ عجیب مضحکہ خیز سا لگتا تھا۔

آج ان کا موڈ کچھ بگڑا ہوا تھا لیکن جب میں نے ان سے پوچھا کہ ان کے بال اتنے لمبے کیوں ہیں تو ان کی آواز میں وہی نرمی آ گئی، وہی دوستانہ گھلاوٹ جو ایک دن پہلے تھی۔

''بس خدا کی پھٹکار اور کیا - اب دیکھو نا ان جھونٹوں کو سلجھاتے ھی سلجھاتے زمانہ گذر جاتا ھے - جب جوان تھی تو ان بالوں کے لئے دعائیں مانگا کرتی تھی اور اب ھاتھہ پیر تھک گئے تو ان ھی کو کوستی ھوں - تم سوؤ میرے بچے - تم کیوں اٹھہ بیٹھے؟ ابھی تو بہت سویرا ھے — سورج بھی پوری طرح نہیں نکلا - ،،

''نانی اماں، اب سونے کو میرا جی نہیں چاھتا - ،،

''اچھا، اگر جی نہیں چاھتا تو نہ سوؤ، جانے دو ،، انہوں نے میری ھاں میں ھاں ملائی اور اپنے بالوں کی چوٹیاں گوندھنے لگیں - پھر کنکھیوں سے ادھر دیکھا جدھر میری ماں صوفے پر لمبی لمبی تیر کی مانند لیٹی تھیں اور مجھہ سے مدھم لہجے میں کہنے لگیں :

''کل تم نے وہ بوتل کیسے توڑی؟ آھستہ سے بتاؤ - ،،

جب وہ بولتی تھیں تو ان کے الفاظ میں ایک ایسا عجیب و غریب ترنم ھوتا تھا کہ وہ الفاظ میرے دماغ میں بڑی آسانی سے بیٹھہ جاتے تھے - ایسے صاف ستھرے اور مزیدار ھوتے تھے وہ جیسے پھول ھوں - جب وہ مسکراتی تھیں تو ان کی آنکھوں کی سیاہ جھیلیں جیسے اور بھی وسیع ھو جاتی تھیں اور ان میں ایک ناقابل بیان نور جھلکنے لگتا تھا - مضبوط اور چمکتے ھوئے سفید دانت مسکراھٹ میں جیسے کھل پڑتے تھے اور جھاسے ھوئے رخساروں پر بہت سی جھریوں کے باوجود ان کا پورا چہرہ چمک اٹھتا تھا اور اس پر دوشیزگی کی شاداب کیفیت طاری ھو جاتی تھی - ھاں البتہ ان کی پھولی پھولی ناک، جس کی نوک ھمیشہ سرخ رھتی تھی، ذرا معاملے کو بگاڑ دیتی تھی - ان کے نتھنے پھیلے ھوئے تھے اور وہ ھر گھڑی ایک کالی سی چاندی کے کام والی ڈبیہ میں سے نسوار نکال کر سڑکا لگایا کرتی تھیں - ان کی ھر چیز سے تاریکی اور اداسی جھلکتی تھی لیکن ان کی روح میں جو روشنی تھی اس کی مسرت، تابندگی اور گرمی ان کی آنکھوں سے ھمیشہ چھنتی رھتی تھی - ان کا جسم بھاری تھا، کمر کچھہ اس طرح جھک گئی تھی کہ کبڑی لگتی تھیں لیکن وہ اس تیزی اور پھرتی سے چلتی پھرتی تھیں جیسے کوئی بڑی سی بھاری بلی ھوں - اور وہ بلی ھی کی طرح نرم اور محبت‌شعار بھی تھیں -

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب تک وہ میری زندگی میں نہیں آئی تھیں میں سو رہا تھا، تاریکی میں کہیں گم تھا - لیکن جب وہ آئیں تو مجھے جگا کر روشنی میں لے گئیں - انہوں نے میرے ماحول کے تمام بکھرے ہوئے تاروں کو جمع کر کے ایک لمبے دھاگے کی طرح بنا دیا جو کہیں سے ٹوٹا ہوا نہیں تھا - پھر اس دھاگے سے انہوں نے طرح طرح کے خوبصورت پھول اور بیلیں کاڑھیں، ایک رنگا رنگ جھالر بنائی - وہ آتے کے ساتھ ہی میری زندگی کی ہمدم ورفیق بن گئیں — ایک ایسی رفیق جو مجھے سب سے زیادہ محبوب تھیں، جو مجھ سے سب سے زیادہ نزدیک تھیں اور جنہیں میں سب سے زیادہ سمجھتا، پہچانتا اور جانتا تھا - انہیں زندگی سے جو بے لوث محبت تھی اس نے میری زندگی کو مالامال کر دیا اور مجھے وہ طاقت بخشی جس کے سہارے میں نے اپنے سخت مستقبل کا مقابلہ کیا -

آج سے چالیس برس پہلے اسٹیمر بہت مدھم رفتار سے چلا کرتے تھے - ہم کو نیژنی نووگورود پہنچتے پہنچتے کافی دیر لگ گئی اور مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہیں — کس قدر حسن سے بھرپور تھے وہ دن، خوبصورتی میں ڈوبے ہوئے -

موسم بڑا اچھا تھا اور صبح سے رات تک میں اپنی نانی کے ساتھ عرشے پر ٹہلا کرتا تھا — صاف شفاف چمکدار آسمان کے نیچے بہتا ہوا، والگا کے دو کناروں کے بیچ میں، جن پر خزاں کی زرد چمک دار ریشمی جھالر لگی ہوئی تھی - زنگ کے رنگ کا اسٹیمر جس کے آخری سرے پر ایک بڑی سی کشتی بندھی تھی، آہستہ آہستہ مزے سے پانی کے رخ کے خلاف چلا جا رہا تھا، آگے کو سر اٹھائے، اس کے چپو دونوں طرف سرمئی اور نیلے پانی کو کاٹتے ہوئے - نیچے بندھی ہوئی کشتی بھورے رنگ کی تھی اور پانی کے کھٹمل کی طرح لگتی تھی - ہر گھڑی ہمارے سامنے نئے نئے مناظر آتے اور نکلتے جاتے، چاروں طرف ماحول بدلتا جاتا — سبز سبز پہاڑ ایسے لگتے تھے جیسے زمین کے حسین ورنگین لباس میں شکنیں پڑ گئی ہوں، آبادیاں اور بستیاں دور سے خوب ادرک بھری ہوئی ڈبل روٹیوں کی مانند لگتی تھیں، پانی پر خزاں کی سوکھی ہوئی زرد زرد پتیاں تیر رہی تھیں -

''واہ واہ وا - دیکھو تو ذرا کیا بہار ہے،، میری نانی بار بار کہتیں اور عرشے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ٹہلتی جاتیں - ان کی آنکھیں خوشی کے مارے اور بھی بڑی بڑی لگنے لگتیں اور چہرے پر کیف کا نور سا چھا جاتا -

اکثر وہ عرشے کے کنارے پر کھڑی ہوتیں تو ان کو یہ احساس بھی نہ رہتا کہ میں موجود ہوں، ان کے ہاتھہ سینے پر بندھے ہوتے، لب ایک مسکراتے ہوئے انداز کے ساتھہ مڑے جاتے اور آنکھوں میں آنسو بھر بھر آتے - پھر میں ان کے گہرے رنگ کے پھول دار سایے کو پکڑ کر کھینچتا اور وہ ایک دم چونک پڑتیں :

''اوہ! ہوں - ایسا لگتا ہے جیسے مجھے نیند آ گئی تھی اور کوئی خواب دکھائی دے رہا تھا مجھے!،،

''لیکن آپ رو کیوں رہی ہیں نانی؟،،

''وہ تو خوشی کے مارے - خوشی کے مارے میرے بچے، کمزوری کے مارے،، وہ مسکراکے کہتیں - ''میں اب بہت سٹھیا گئی ہوں نا - میں اب تین بیسی سے اوپر تو ہو گئی ہوں - ،،

پھر وہ نسوار کی ایک چٹکی لے کر سونگھتیں اور مجھے اولیا اور جانوروں، نیک دل ڈاکوؤں اور بھوتوں پریتوں کی بڑی عجیب عجیب سی کہانیاں سنانے لگتیں - یہ کہانیاں وہ ایک خاص ٹھیراؤ کے ساتھہ بڑی پراسرار آواز میں بیان کرتیں - ان کا چہرہ مجھہ سے نزدیک آجاتا اور جب وہ میری آنکھوں میں جھانکتیں تو ان کی پتلیاں مجھے پھیلتی ہوئی معلوم ہوتیں — جیسے وہ مجھے سہارا دینے کے لئے آنکھوں کے رستے میرے دل میں قوت کا ایک ابلتا ہوا چشمہ انڈیل رہی ہوں - ان کی آواز میں بات کرتے وقت بڑا ترنم ہوتا تھا جیسے وہ الفاظ بولتی نہ ہوں راگوں میں ڈھالتی ہوں - اور جوں جوں وہ بات کرتی جاتیں، ان کے طرزبیان میں زیادہ موسیقی پیدا ہوتی جاتی - ان کی باتیں سن کر مسرت کا وہ احساس ہوتا جو بیان سے باہر ہے - چنانچہ جب وہ کوئی کہانی ختم کرتیں تو میں ہمیشہ کہتا :

''اور، اور کہو نانی اماں - ،،

''ہاں تو پھر یہ ہوا کہ وہ جو بونا تھا نا تو وہ بیچارہ تندور کے نیچے بیٹھا تھا اور اس کے پاؤں میں لکڑی کی ایک پھانس چبھہ گئی

تھی - تو وہ بس لوٹ رہا تھا اور رو رہا تھا اور ادھر سے ادھر ھل رہا تھا کہ ارے بھائی چوھو! ارے میرے ننھے چوھو! ارے میں مرا! ارے مر گیا! ننھے چوھو! کوئی مدد کو دوڑو - ارے رے رے...''

وہ اپنا پنجہ پکڑ لیتیں اور اسے ادھر سے ادھر ھلانے لگتیں اور طرح طرح سے منہ بناتیں جیسے وھی تو بونا ھوں، جیسے ان کو ھی تکلیف ھو رھی ھو -

ملاح چاروں طرف اکٹھے ھوجاتے، سیدھے سادے، داڑھیاں رکھے ھوئے ملاح - وہ سن سن کر خوب ھنستے اور ان کی تعریفیں کرتے اور اور کہانیوں کی فرمائشیں ھوتیں اور اس کے بعد کہتے:

''آؤ ھمارے ساتھ کھانا کھاؤ - ''

رات کے کھانے پر وہ ان کو وادکا پینے کی دعوت دیتے اور میری تواضع خربوزوں اور تربوزوں سے کی جاتی - لیکن یہ سب باتیں چھپا کر ھوتیں کیونکہ اسٹیمر پر ایک افسر ایسا تھا جو لوگوں کو پھل کھانے سے روکا کرتا تھا - اگر کسی کو کھاتے دیکھ لیتا تو اس کے ھاتھ سے چھین کر دریا میں پھینک دیتا - وہ سپاھیوں کے سے کپڑے پہنے رھتا تھا، اس کی وردی میں نیچے سے اوپر تک پیتل کے بٹن لگے تھے اور وہ ھر وقت شراب کے نشے میں دھت رھتا تھا - لوگ اس سے پناہ مانگتے اور چھپتے پھرتے تھے -

میری ماں کبھی کبھار ھی عرشے پر آتی تھیں، عموماً ھم سے الگ تھلگ رھتیں اور حسب دستور چپ چپ رھتیں - ان کا لمبا قد، خوبصورت سڈول جسم اور سنہرے بالوں کی گھنی چوٹیاں — ان کی شخصیت کی تمام قوت اور طاقت آج بھی مجھے دکھائی دیتی ھے - ھاں البتہ اب لگتا ھے کہ میں کہر کے پردے یا کوئی چمکدار شفاف بادل کے پیچھے انھیں دیکھ رھا ھوں - بہتے ھوئے سالوں کی آڑ سے اب تک مجھے ان کی وہ سرمئی نیلی آنکھیں نظر آتی ھیں جو میری نانی کی آنکھوں کی طرح کٹورا سی تھیں لیکن جن میں ایک عجیب طرح کی بیگانگی تھی -

ایک دن انھوں نے بڑی سختی سے کہا تھا:

''اماں تم خواہ مخواہ اپنے آپ کو ھنسواتی رھتی ھو - ''

میری نانی نے بڑے مزے میں جواب دیا:

''اچھا بھائی، اگر لوگوں کو ہنسی آتی ہے تو ضرور ہنسیں! ہنستے ہی گھر بستے ہیں! ان کا کچھ بھلا ہی ہوجائے گا۔،،

اور مجھے یاد ہے کہ جب نیژنی دکھائی دینے لگا تو میری نانی بچوں کی طرح خوشی کے مارے بیقرار ہوگئیں۔

''دیکھو، دیکھو، کیا اچھا لگ رہا ہے،، وہ زور زور سے چلانے لگیں، میرا ہاتھ کس کے دبا لیا اور مجھ کو دھکیلتی ہوئی عرشے کی منڈیر تک لے گئیں۔

''دیکھو وہ رہا تمہارا نیژنی! کیا ہی حسن ہے! گرجوں کی برجیوں کو دیکھو جیسے اڑ رہے ہوں۔،،

پھر وہ آنکھوں میں آنسو بھرے میری ماں کی طرف مڑیں:

''دیکھو! وریوشا! ارے ایک نظر تو دیکھو! ارے تم تو بھول بھی گئی ہوں گی! دیکھو، آنکھیں تو ٹھنڈی کرلو! مسرت کے دو چار گھونٹ تو پیو!،،

میری ماں کے لبوں پر ایک اداس مسکراہٹ آئی۔

اسٹیمر اس حسین شہر کے بالکل سامنے جاکر کھڑا ہوا۔ دریا کے بیچوں بیچ جہاں چاروں طرف جہاز ہی جہاز پھیلے ہوئے تھے اور سینکڑوں مستول ساھی کے کانٹوں کی طرح ابھرے نظر آرہے تھے۔ ایک بڑی سی کشتی آئی جس میں بہت سے آدمی بھرے تھے اور ہمارے اسٹیمر کے نزدیک آکر اس کے نچلے حصے میں اٹک گئی۔ پھر اس میں سے بہت سے لوگ اسٹیمر پر چڑھنے لگے۔ ان میں آگے آگے ایک ناٹا، دبلا پتلا، بوڑھا آدمی تھا، لمبا سا سیاہ کوٹ پہنے سبزی مائل آنکھیں، طوطے کی سی ناک اور کندن کئے ہوئے سونے کی سی سرخی مائل سنہری ڈاڑھی۔

''ابا!،، میری ماں زور سے چیخیں اور دوڑ کر اس کی گود میں گر پڑیں۔ بڈھے نے ان کا سر اپنے دبلے پتلے سرخ ہاتھوں میں پکڑلیا اور ان کے گال تھپتھپاتے ہوئے منمناتی ہوئی تیز آواز میں کہنے لگا

''اوھو ھو ھو، ارے واہ بیوقوف! اچھا اچھا تو تو آگئی — ہیں؟ تھو... و... و، کیا لوگ ہیں!!..،،

نانی نے جلدی جلدی سب کو باری باری سے گلے لگایا اور پیار کیا، وہ پھرکی کی طرح گھوم رہی تھیں - انہوں نے مجھے سب رشتہ داروں کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا:

''لو یہ لو - جلدی کرو نا - یہ تمہارے میخائل ماموں ہیں، یہ یاکوف ہیں اور یہ ممانی نتالیا - اور یہ جو لڑکے ہیں نا... یہ ہیں تمہارے ممیرے بھائی - دونوں کا نام ساشا ہے اور یہ کاتیرینا آپا ہیں — سب اپنا ہی کنبہ ہے - کتنے بہت سے! ہیں نا؟،،

''اور تم کیسی ہو بڑی بی،، میرے نانانے نانی سے پوچھا اور پھر دونوں نے ایک دوسرے کو تین بار پیار کیا -

پھر میرے نانا نے بھیڑ میں سے مجھے کھینچا اور میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے:

''اچھا! یہ تو بتاؤ تم کون ہو؟،،

''میں استراخان سے آیا ہوں، کیبن سے نکل بھاگا - ،،

میرے نانا ماں کی طرف مڑے:

''یہ کیا کہہ رہا ہے؟،، اور جواب کا انتظار کئے بغیر مجھے ہٹایا اور بولے:

''کلے تو بالکل باپ جیسے ہیں، چوڑے چکلے - چلو کشتی میں سوار ہو جاؤ!،،

ہم کشتی میں بیٹھ کر کنارے پہنچے - پھر ہم اجڑی پجڑی سڑک پر نکل آئے جس کے دونوں طرف بند بنے ہوئے تھے - بندوں پر چھدری چھدری سی گھاس اگی ہوئی تھی -

میرے نانا اور میری ماں سب سے آگے آگے چل رہے تھے - نانا میری ماں کے کندھوں تک پہونچتے تھے اور چھوٹے چھوٹے تیز قدم اٹھاتے ہوئے چل رہے تھے - ایسا لگتا تھا جیسے میری ماں ان کو بلندی سے دیکھتی ہوئی ہوا میں تیرتی جا رہی ہوں - ان کے پیچھے میرے دونوں ماموں خاموشی سے چل رہے تھے - میخائل ماموں کے بال سیاہ اور چمک دار تھے، جسم نانا کی طرح دبلا پتلا تھا، یاکوف ماموں کے بال سنہرے اور گھنگھریالے تھے - پھر کچھ عورتیں تھیں، موٹی موٹی، بھڑکیلے رنگوں کے کپڑے پہنے - اور کوئی چھ بچے رہے ہوں گے، مجھ سے بڑے لیکن بہت خاموش - میں اپنی نانی اور

بوڑاسی ممانی نتالیا کے ساتھه چل رہا تھا - ان کی آنکھیں نیلی تھیں، رنگت پیلی اور پیٹ بڑھا ہوا تھا - ذرا ذرا دیر بعد وہ رک جاتیں اور سانس کھینچ کر کہتیں:

''افوہ! اب تو میں ایک قدم نہیں چل سکتی - ''

''لیکن ان لوگوں کو تمہیں ساتھه لانے کی کیا پڑ گئی تھی!''

میری نانی نے بیزاری سے بڑبڑاکے کہا ''آوے کا آوا ھی کچا ہے - ''

مجھے نہ تو وہ بچے اچھے لگ رہے تھے نہ بڑے - ان لوگوں کے درمیان مجھے سخت اجنبیت کا احساس ہو رہا تھا - یہاں تک معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے میری نانی بھی غائب ہو کر مجھه سے دور ہٹ گئی ہیں -

خاص طور پر مجھه کو نانا ابا بہت برے لگ رہے تھے اور ایک دم سے جیسے کسی دشمن کی موجودگی کا احساس پیدا ہو گیا تھا - میں خاص طور پر ان کا جائزہ لے رہا تھا اور دل میں عجیب سی کرید ہو رہی تھی جس میں سراسیمگی بھی شامل تھی -

ہم لوگ چڑھائی کے آخر میں پہنچ گئے - اس کے اوپر داھنے ہاتھه کی منڈیر سے ملا ہوا ایک نیچا سا ایک‌منزلہ مکان تھا جہاں سے گلی شروع ہوتی تھی - مکان کا رنگ میلا گلابی تھا اور باہر کو کئی کھڑکیاں نکلی ہوئی تھیں جن پر نیچے نیچے چھجے تھے - باہر سے دیکھنے میں تو وہ مکان کافی بڑا لگتا تھا، لیکن اندر کمرے بہت تنگ و تاریک تھے اور بڑی ٹھونسم ٹھانس تھی - بہت سے لوگ ان کمروں میں گھسے ہوئے، ناک بھوؤں چڑھائے ادھر ادھر کام کرتے پھر رہے تھے اور ویسا ماحول تھا جیسا اسٹیمر میں کنارے پر لگنے سے پہلے پیدا ہوگیا تھا - بچے اس طرح ادھر ادھر چپکے چپکے پھر رہے تھے جیسے گوریاں دانہ چرانے کی فکر میں پھدکتی پھر رہی ہوں - پورے مکان پر ایک عجیب چڑچڑی سی جھلائی ہوئی اجنبی فضا طاری تھی -

میں باہر احاطے میں نکل آیا لیکن یہاں بھی ماحول کچھه زیادہ خوشگوار نہ تھا - الگنیوں پر بڑے بڑے کپڑے سوکھنے کو پھیلے ہوئے تھے، رنگین پانی سے بھرے ہوئے کنڈال اور ٹنکیاں جگہ جگہ رکھی ہوئی تھیں - ان میں بھی کپڑے پڑے ہوئے تھے - ایک طرف کو ایک ٹوٹا پھوٹا سا چھپر تھا جس کے نیچے چولھے میں

لکڑیوں کی آگ جل رہی تھی اور اس آ گ پر کوئی چیز کھدبد کھدبد پک رہی تھی اور اس سے ابلتے ہوئے بلبلے چھوٹ رہے تھے - بھاپ اور دھوئیں کی آڑ میں سے کوئی شخص جو دکھائی نہیں دے رہا تھا عجیب عجیب طرح کے الفاظ زور زور سے بولتا جا رہا تھا:

''صندل — عنابی — تیزاب...''

۲

یہ ایک ناقابل بیان حد تک عجیب و غریب نئی زندگی کی ابتدا تھی، بھانت بھانت کے واقعات سے بھرپور اور بڑی برق رفتار - اب تو مجھے اس کی یادیں اس طرح آتی ہیں جیسے کوئی عقلمند گھاگ انسان ایک ایسی کہانی کہہ رہا ہو جو دردناک بھی ہو اور جس میں حقیقت بیانی بھی ہو - اب جو میں ان بیتے دنوں کو یاد کرتا ہوں تو یقین کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ سچ ایسا ہی تھا - اس ''احمق آوے کے آوے'' کی زندگی میں اتنی تاریکی اور اتنے مصائب تھے کہ دل چاہتا ہے بہت سی حقیقتوں کو ماننے ہی سے انکار کر دوں -

لیکن حقیقت اور سچائی ہر قسم کے لحاظ سے بلندتر ہے - اور یہ داستان صرف میری داستان نہیں بلکہ یہ تو اس اندوھناک ماحول کی گھٹن کو اجاگر کرتی ہے جس میں اس زمانہ کا معمولی روسی انسان اپنی زندگی بسر کرتا تھا اور اب بھی کرتا ہے - *

میرے نانا کے گھر میں سب ایک دوسرے کے خلاف رہتے تھے اور مخالفت اور ناچاقی کے جیسے دھویں سے سارے گھر میں اٹھتے رہتے تھے - بڑوں کے تو خیر رگ و پے میں وہ زھر سرایت ہی کر گیا تھا لیکن بچے بھی اس سے محفوظ نہ تھے - بعد کو اپنی نانی کے قصوں سے مجھے معلوم ہوا کہ میری ماں ایسے وقت میں اپنے میکے پہونچی تھیں جبکہ ان کے بھائی اپنے باپ سے یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ جائداد تقسیم کردی جائے - اور اسی بیچ میں میری ماں جو آ گئیں

---

* گورکی نے ''اب بھی'' انقلاب سے پہلے ہی کے زمانے کے لئے لکھا ہے اس لئے کہ ''بچپن'' ۱۹۱۳ء میں مکمل ہو چکا تھا - (ایڈیٹر -)

تو یہ مطالبہ اور بھی شدت اختیار کر گیا۔ میری ماں نے اپنی مرضی سے شادی کی تھی اور اس بنا پر نانا نے ان کا جہیز روک لیا تھا۔ اب میرے ماموں ڈرے کہ کہیں وہ سوال پھر نہ اٹھ کھڑا ہو۔ میرے ماموؤں کا کہنا تھا کہ وہ جہیز ان لوگوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ کئی دن سے آپس میں بڑی تلخ بحث چل رہی تھی کہ میرے ماموؤں میں سے کون شہر میں دوکان کھولے گا اور کون دریا اوکا کے پاروالی بستی کوناوینو میں کھولے گا۔

آنے کے فوراً ہی بعد ہم لوگ باورچی خانے میں کھانا کھا رہے تھے کہ یکایک توتو میں میں ہونے لگی۔ میرے دونوں ماموں ایک دم سے اٹھ کھڑے ہوئے اور میز پر سے جھک جھک کر میرے نانا کے منہ پر زور زور سے چیخنے لگے۔ دانت نکال نکال کر وہ ایسا گرجتے اور ایسا کانپتے جیسے جھبرے کتے جمع ہوگئے ہوں۔ میرے نانا زور زور سے میز پر چمچے سے مارنے لگے، ان کا چہرہ سرخ ہوگیا اور وہ بھی زور زور سے چیخنے لگے:

''میں تم لوگوں کو نکال باہر کروں گا! گلی گلی بھیک مانگوگے تم لوگ!،،

میری نانی دکھ بھرے انداز اور آواز میں بولیں:

''دے دو کمبختوں کو جو کچھ مانگتے ہیں۔ سب دے دو۔ جان تو چھوٹے کسی طرح۔ چین تو پائیں ہم۔،،

''دھت تیری کی! تو بھی ان لوگوں سے مل گئی ہے!،، نانا زور سے چیخے۔ ان کو دیکھ کر حیرت یہ ہوتی تھی کہ اتنا مختصر سا آدمی اس قدر زور سے کیسے چیخ سکتا ہے۔

میری ماں اٹھیں اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی سب کی طرف پیٹھ کرکے کھڑکی کے نزدیک کھڑی ہوگئیں۔ ایک دم سے میخائل ماموں نے اپنے بھائی کے منہ پر ایک زور کا مکا رسید کیا۔ وہ زور سے ڈکارے اور لپک کے بھائی کی گردن پکڑ لی اور پھر دونوں گتھم گتھا، لوٹتے، ہانپتے، ہنکارتے، گالیاں بکتے، زمین پر لوٹنے لگے۔

بچوں نے رونا شروع کر دیا۔ میری ممانی نتالیا نے جو پیٹ سے تھیں الگ چیخ چیخ کر رونا شروع کردیا۔ میری ماں نے ان کو اپنے دونوں ہاتھوں میں سمیٹ لیا اور کمرے سے باہر لے گئیں۔ ایوگینیا

بوانے، جو بچوں کی دیکھ بھال کرتی تھیں اور جن کے چہرے پر ماتا کے داغ تھے اور جو ہمیشہ ہنستی رہتی تھیں جلدی سے بچوں کو نکال دیا۔ کرسیاں ایک دوسرے پر گر رہی تھیں، سامان سب الٹ پلٹ ہورہا تھا۔ چوڑے شانوں‌والا نوجوان تسیگانوک جو نانا کا شاگرد تھا، دوڑا اور میخائل ماموں کی پیٹھ پر سوار ہو گیا اور داڑھی‌والے گنجے مستری گریگوری ایوانووچ سیاہ عینک لگائے آگے بڑھے اور بڑے اطمینان سے تولیہ سے میخائل ماموں کے ہاتھ باندھنے لگے۔

میخائل ماموں کی چھدری سیاہ ڈاڑھی فرش پر رگڑ رہی تھی اور وہ گلا پھاڑ پھاڑ کے زور زور سے چیخ رہے تھے۔

"ہائے ہائے! یہ بھائی ہیں! یہ سگے بھائی ہیں۔ تھو... و.. و، کیا لوگ ہیں!"، میرے نانا غصے میں بھرے میز کے چکر لگائے جا رہے تھے۔

لڑائی شروع ہوتے ہی میں ڈر کے مارے تندور پر چڑھ گیا تھا اور وہیں سے میں نے دیکھا کہ نانی اماں یاکوف ماموں کے جگہ جگہ سے کچلے ہوئے منہ کو پانی سے دھو رہی ہیں۔ وہ بھوں بھوں روتے اور پیر ٹپکتے جاتے اور وہ افسوس کرتی جاتیں:

"توبہ ہے کمبخت! کچھ تو عقل کے ناخن لے۔ توبہ ہے! جنگلی جانور! کیا وحشی خاندان ہے!"

میرے نانا غصے کے مارے اپنی پھٹی ہوئی قمیص کو کندھوں پر کھینچتے اور چلاتے جاتے:

"دیکھ لے! ایسے بچے جنے ہیں تو نے! جنگلی جانور! چڑیل کہیں کی!"

جب یاکوف ماموں باہر چلے گئے تو نانی اماں ایک کونے میں چھپ کے زور زور سے رونے لگیں:

"اے یسوع مسیح کی پاک دامن ماں! رحم کر اور میرے بچوں کو کچھ عقل دے!"

میرے نانا میز پر نظریں جمائے کھڑے تھے جس پر تمام چیزیں بکھری ہوئی الٹی سیدھی پڑی تھیں۔

"اب ان لونڈوں پر نظر رکھنا بڑی‌بی!"، وہ مدھم لہجے میں بولے۔ "نہیں تو یہ سب وروارا کا خاتمہ کر دیں گے۔ ہاں۔"

نانی بولیں ''خدا جانے کیا کہہ رہے ہو ! اب قمیص تو اتار دو جو اسے سی دوں۔ ''

پھر انھوں نے نانا کا سر اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور ان کے ماتھے پر پیار کیا اور نانانے جو قد میں ان سے کافی چھوٹے تھے ان کے کندھے پر سر رکھہ دیا۔

''ایسا لگتا ہے بہتری اسی میں ہے کہ بٹوارہ کر دیا جائے۔ ''

''ہاں، وروارا کے ابا!''

وہ دونوں بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پہلے ان کی باتیں گھل مل کے ہوتی رہیں لیکن جلد ہی میرے نانا اس طرح ادھر ادھر پھنپھناتے ہوئے ٹہلنے لگے جیسے لڑائی سے پہلے مرغا۔ وہ باربار نانی کی طرف انگلی اٹھاتے۔

''میں تمہیں خوب جانتا ہوں! تمہیں بس انہیں کی فکر ہے، ان ہی کو چاہتی ہو !'' وہ شکایت بھرے لہجے میں کہہ رہے تھے۔ ''لیکن وہ جو تمہارا میخائل ہے وہ اتنا بڑا ریاکار ہے کہ کیا کہوں اور وہ جو یاکوف ہے بے ایمان۔ جو کچھہ میں نے کمایا سب خاک سیاہ کردیں گے یہ لوگ، ایک سرے سے برباد کر دیں گے۔ ''

یکایک گڑبڑ میں میرا ایک کندھا ایک استری میں لگا اور وہ کھٹ پٹ کرتی، کھڑبڑاتی تندور پر سے گری اور لڑھکتی ہوئی پانی کی بالٹی میں جاپہونچی۔ نانا اچھل پڑے، مجھے کھینچا اور کچھہ ایسی نظروں سے دیکھنے لگے جیسے مجھے پہلی بار دیکھہ رہے ہوں۔

''کس نے تندور پر تمہیں چڑھایا؟ تمہاری ماں نے؟''

''نہیں، میں خود چڑھا!''

''تم جھوٹ بولتے ہو۔ ''

''نہیں، میں جھوٹ نہیں کہتا۔ مجھے ڈر لگ رہا تھا۔ ''

انہوں نے مجھے ایک دھکا دیا اور سر پر ایک چپت رسید کی۔

''بالکل اپنے باپ پر پڑا ہے! چل نکل یہاں سے۔ ''

میں وہاں سے نکل بھاگنا تو چاہتا ہی تھا۔ فوراً چل دیا۔

البتہ میں خوب جانتا تھا کہ میرے نانا کی سبز آنکھیں برابر میرا پیچھا کررہی ہیں اور مجھے ان سے بے حد ڈر لگ رہا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میں ان نگاہوں سے چھپنے کی مستقل کوشش کرتا رہتا تھا

اور مجھے ایسا لگتا تھا جیسے نانا بڑے کمینے آدمی ھیں - وہ ھر ایک سے سختی اور طنز کے ساتھہ بات کرتے تھے - لوگوں کو پریشان کرکے، دکھہ پھونچا کے جیسے ان کو کوئی خوشی ھوتی تھی - ''تھو... و... و، کیا لوگ ھیں!..،، وہ کہتے رھتے - جب وہ زور سے کہتے ''تھو،، اور ''و،، کو کھینچتے تو میرا خون جمنے لگتا اور مجھے ایسا لگتا جیسے دنیا میں میرا کوئی نہیں، میں بالکل اکیلا ھوں، تن تنہا -

شام کو چائے کا وقت خاص طور پر بڑا خطرناک ھوتا تھا - اس وقت میرے نانا، دونوں ماموں اور سب مزدور تھکے ماندے باورچی خانے میں آتے، ھاتھہ رنگ اور تیزاب سے جلے ھوئے، پیشانی پر بالوں کو سمیٹنے کے لئے فیتے بند ھے ھوئے - اس وقت وہ لوگ باورچی خانے کے کونے میں لگی ھوئی مقدس شبیھوں کی مانند لگتے - اس خطرناک موقع پر میرے نانا میرے سامنے ھی بیٹھتے اور مجھہ سے اتنا مخاطب رھتے کہ پوتوں کو جلن ھونے لگتی - وہ ھمیشہ بالکل ٹھیک ٹھاک رھتے، نوک پلک سے درست، چکنے، ستھرے اور تراش خراش کے ساتھہ - ھاں البتہ ان کی سائن کی نیم‌آستین بالکل بوسیدہ اور پرانی ھو گئی تھی، سوتی قمیص جگہ جگہ سے سکڑ گئی تھی، پتلون میں گھٹنوں پر پیوند تھے لیکن پھر بھی ان کو دیکھہ کر یہ اندازہ ھوتا تھا کہ وھاں سب سے زیادہ خوش شکل اور خوش پوش وھی ھیں - وہ اپنے بیٹوں سے زیادہ اچھے لگتے تھے جو سوٹ پہنے رھتے تھے، کفوں پر کلف اور گلے میں ریشمی رومال -

ھمارے پھونچنے کے چند دن بعد نانا نے مجھے دعا مانگنے کا طریقہ سکھانا شروع کیا - باقی سب بچے مجھہ سے بڑے تھے اور جس گرجے کے سنہری گنبد ھماری کھڑکی سے دکھائی دیتے تھے، اس کے پادری صاحب سے لکھنا پڑھنا سیکھہ چکے تھے - اس گرجے کا نام اوسپینسکی گرجا تھا -

مجھے میری ممانی نتالیا نے پڑھانا شروع کیا جو خاموش مزاج اور دبو تھیں - نتالیا ممانی کا چہرہ بچوں کی طرح بھولابھولا تھا اور ان کی آنکھیں اس قدر شفاف تھیں کہ معلوم ھوتا تھا ان میں نگاھیں ڈال کے ان کی کھوپڑی کا پچھلا حصہ تک دیکھا جاسکتا ھے -

مجھے ان کے پاس بیٹھ کر، پلک جھپکائے بغیر ان کو گھورتے رہنے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ لیکن ان کو اس بات سے بہت گھبراہٹ ہوتی تھی، وہ اپنی آنکھیں میچتیں، سر جھٹکتیں اور بہت مدھم لہجے میں کہتیں ''کہو نا — ''ہمارا باپ جو دائم ہے...''

''لیکن یہ اس ''دائم ہے'' کے کیا معنی؟...''

وہ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھتیں اور جواب دیتیں ''مت سوال پوچھو! پوچھنے سے اور گڑبڑ ہوتی ہے! میرے ساتھ ساتھ کہتے جاؤ ''ہمارا باپ جو...'' ہوں ہوں کہو — کیوں؟''

لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ پوچھنے سے اور گڑبڑ کیا ہوتی ہے اور کیوں ہوتی ہے۔ یہ الفاظ ''دائم ہے'' اب مجھ میں ایک کرید سی پیدا کرنے لگے، میرے لئے پراسرار بن گئے اور میں جان بوجھ کر ان کو بگاڑنے لگا ''جو دوئم ہے'' ''جس کا دوئم ہے...''

لیکن میری ممانی بیچاری پریشان حال، رنگ اڑا ہوا، بڑے صبر واستقلال سے مجھے صحیح کرتی رہتیں:

''نہیں، نہیں، ایسے نہیں۔ بس سیدھے سے کہو نا — ''جو دائم ہے...''

لیکن نہ تو الفاظ آسان تھے نہ ممانی کا وجود کوئی معمولی بات تھی۔ میں جھنجلا جاتا اور پھر دعا کا یاد رکھنا مشکل ہو جاتا۔

ایک دن میرے نانا نے مجھ سے پوچھا: ''کیوں الیکسئی! آج کیا کرتے رہے؟ کھیلتے رہے؟ ہاں وہ تو تمہارے سر میں جو گومڑا پڑا ہوا ہے اسی سے ظاہر ہے۔ ماتھے پر گومڑا ڈال لینا کون سی شیخی کی بات ہے؟ اور وہ اس کا کیا ہوا وہ جو سیکھ رہے تھے ''ہمارا باپ جو...؟''

''اس کا حافظہ بڑا خراب ہے'' میری ممانی آہستہ سے بولیں۔

میرے نانا ہنسنے لگے اور اپنی سرخ بھویں اٹھاتے ہوئے بولے:

''اگر یہ معاملہ ہے تو پھر اس کو چاٹ دینی پڑے گی! تمہارے باپ نے تمہیں کبھی چاٹ دی تھی؟'' وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ کیا کہہ رہے ہیں۔ چپ رہا۔

''میکسم بچے کو کبھی نہیں مارتے تھے اور انہوں نے مجھے بھی منع کر رکھا تھا،، میری ماں نے جواب دیا۔
''اچھا وہ کیوں؟،،
''وہ کہتے کہ مار سے نہ کبھی کسی نے سیکھا ہے نہ سیکھے گا۔،،
''میکسم تو احمق تھا۔ خدا اسے غریق رحمت کرے۔،،
نانا کی یہ بات مجھے بھی ناگوار گزری اور میری ناگواری کا احساس ان کو بھی ہوا۔
''کیوں منہ بنا رہا ہے؟ ذرا ہوش میں رہ! سنبھل کے چل سنبھل کے! سنیچر کو وہ انگشتانے والی بات پر ساشا کی ''دھلائی،، ہوگی،، وہ اپنے سنہری سرخ اور سفید بال پیچھے کو چپکاتے ہوئے بولے۔
''آپ کیسے کیجئے گا ''دھلائی،،؟،، میں نے پوچھا۔
سب لوگ ہنسنے لگے اور میرے نانا نے جواب دیا:
''ٹھہر جاؤ، گھبراؤ مت، تم کو بھی پتہ لگ جائے گا۔،،
میں ایک کونے میں دبک گیا اور سوچنے لگا کہ جو کپڑے رنگنے کے لئے آتے تھے ان کو الگ الگ کرنے کے لئے تو ''دھلائی،، کا لفظ استعمال ہوتا تھا لیکن ''چاٹ،، اور مار تو غالباً ایک ہی معنی رکھتے تھے۔ لوگ گھوڑوں اور کتوں بلیوں کو مارتے ہیں، استراخان میں سپاہی لوگ ایرانیوں کو مارتے تھے — یہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ لیکن میں نے کسی کو چھوٹے بچوں کو مارتے نہیں دیکھا تھا۔ بے شک میرے ماموں کبھی کبھی اپنے بچوں کے سروں پر آگے یا پیچھے چپت رسید کر دیا کرتے تھے لیکن ایسا لگتا تھا کہ ان بچوں پر کوئی خاص اثر نہیں ہوتا تھا۔ بس چوٹ کی جگہ ذرا سا سہلائی اور بات آئی گئی ہو گئی۔ کبھی کبھی میں ان سے پوچھتا کہ کیا درد ہوتا ہے تو وہ بڑی ہمت سے جواب دیتے:
''ارے نہیں، ذرا بھی نہیں۔،،
انگشتانے والا قصہ مجھے بھی معلوم تھا۔ شام کی چائے اور رات کے کھانے کے درمیان میرے ماموں اور بڑے مستری جی رنگے ہوئے کپڑوں کو جوڑ جوڑ کر سیا کرتے تھے۔ اور جب ایک لمبا سا کپڑا بن جاتا تھا تو اس کے آخر میں گتے کی چٹیں لگائی جاتی تھیں۔ مستری گریگوری کو کم سوجھتا تھا اور میخائل ماموں کو جو دل لگی سوجھی

تو انہوں نے اپنے نوسالہ بھتیجے سے کہا کہ مستری جی کے انگشتانے کو موم بتی پر رکھہ کر خوب گرم کردے۔ ساشا نے انگشتانے کو چمٹے میں پکڑ کر شمع پر رکھا یہاں تک کہ وہ لال انگارہ ہو گیا، پھر اس نے وہ انگشتانہ گریگوری کے قریب ھی رکھہ دیا اور خود تندور کی آڑ میں ہو گیا۔ لیکن اسی وقت نانا ابا آ گئے اور کام کرنے بیٹھے تو انہوں نے وہی گرم انگشتانہ اٹھا لیا۔ مجھے یاد ھے کہ میں بھاگا ھوا باورچی خانے میں پہونچا تھا، یہ دیکھنے کے لئے کہ یہ کیا شور مچ رہا ھے تو دیکھتا کیا ھوں کہ نانا ابا بڑے ھی مضحکہ خیز طریقے پر ناچ رہے ھیں۔ انہوں نے اپنی جلی ہوئی انگلی سے اپنا کان پکڑ رکھا تھا اور زور زور سے چلارہے تھے:

''یہ کس کی حرکت ھے، حرامزادو؟ آخور کہیں کے...،،

میخائل ماموں نے میز پر جھکتے ہوئے انگشتانے کو انگلی سے ٹھوکے لگائے اور اس پر پھونک ماری۔ مستری نے بےنیازی سے اپنی سلائی جاری رکھی۔ اس کے بڑے سے گنجے سر پر پرچھائیاں لرزتی رھیں۔ یاکوف ماموں دوڑتے ہوئے اندر آئے اور تندور کے پیچھے چھپ کر چپکے چپکے ھنسنے لگے۔ نانی کدوکش پر کچے آلو رگڑ رھی تھیں۔

میخائل ماموں ایک دم سے بول پڑے:

''یہ اس یاکوف والے ساشا نے کیا ھے۔،،

''یہ جھوٹ ھے،، یاکوف ماموں چیخے اور اچھل کر تندور کی آڑ سے آگے نکل آئے۔

لیکن پھر کسی کونے سے ان کے بیٹے ساشا نے رونا شروع کیا:

''ابا، ان کی بات نہ مانئے گا۔ انہوں ھی نے مجھہ سے یہ کرنے کو کہا تھا۔،،

میرے ماموں آپس میں جھگڑنے لگے۔ فوراً میرے نانا کا غصہ ٹھنڈا پڑگیا۔ انہوں نے انگلی پر پولٹیس باندھی اور ایک لفظ کہے بغیر مجھہ کو ساتھہ لے کر باھر نکل گئے۔

سب نے یہی کہا کہ قصور میخائل ماموں کا تھا۔ تو پھر اگر میں نے چائے کے وقت پوچھا کہ کیا میخائل ماموں کو بھی مار پڑےگی اور ان کی بھی ''دھلائی،، ھوگی تو یہ بات بالکل فطری تھی۔

''ھاں ھونا تو چاھئے،، میرے نانا دھیرے سے بولے اور غور سے مجھ کو دیکھنے لگے۔

میخائل ماموں نے زور سے میز پر ایک مکا مارا:

''ورواراء اگر تم اپنے اس پلے کو قابو میں نہیں رکھوگی تو یاد رکھنا اس کی گردن مروڑ دونگا!،،

''تم ذرا انگلی سے چھوکر تو دیکھو اسے،، میری ماں نے جواب دیا۔

سب لوگ چپ ھوگئے۔

میری ماں اپنے چند الفاظ سے بعض اوقات لوگوں کو بالکل پسپا کرکے رکھ دیتی تھیں۔

مجھے یہ بھی نظر آرھا تھا کہ گھر میں ھر شخص میری ماں سے مرعوب تھا۔ یہاں تک کہ جب میرے نانا بھی ان سے بات کرتے تھے تو لہجہ بدل کر اور ان کی آواز میں بھی، دوسروں سے بات کرنے کے مقابلے میں، میری ماں سے بات کرنے میں نرمی اور دھیماپن آجاتا تھا۔ مجھے اس سے خوشی ھوتی تھی اور پھر میں اپنے ممیرے بھائیوں میں خوب شیخی بگھارتا:

''میری ماں یہاں سب سے زیادہ زوردار ھیں جناب۔،،

اور وہ لوگ بھی اس بات کو مانتے تھے اور کبھی انکار نہیں کرتے تھے۔ لیکن اگلے سنیچر کو جو کچھ ھوا اس سے اپنی ماں کے متعلق میری رائے کو یکایک سخت صدمہ پھونچا۔

سنیچر ھوتے ھوتے میں بھی ایک آفت میں پھنس گیا۔ بڑے لوگ جس طرح کپڑوں کے رنگ بدلا کرتے تھے وہ دیکھ کر مجھے بہت ھی شوق پیدا ھوتا تھا۔ وہ لوگ کبھی زرد رنگ کا کوئی کپڑا لیتے، اس کو کالے رنگ کے پانی میں ڈبوتے اور نکالتے تو وہ بالکل گھرا نیلا ھوتا۔ یا کوئی بھورا کپڑا لے کر سرخ پانی میں ڈبوتے تو وہ گھرا سرخ ھوکر نکلتا — ''عنابی،،۔ دیکھنے میں تو یہ سب بہت آسان لگتا تھا لیکن ھوتا کیسے تھا۔

میرے دل میں اندر ھی اندر جوش اٹھتا کہ ذرا میں بھی رنگائی پر ھاتھ صاف کروں اور میں نے یہ بات یاکوف ماموں والے ساشا سے کہی۔ ساشا سنجیدہ خاموش سا لڑکا تھا جو ھمیشہ بڑوں کی دم کے

2—1705

پیچھے لگا ہوا، ان کو اپنی خدمات پیش کرتا رہتا تھا۔ میرے نانا کے سوا سب ہی اس کی تعریف کیا کرتے تھے کہ بہت تیز ہے، سب کا کام کرتا ہے وغیرہ۔ لیکن میرے نانا کہتے ''تھو ... چاپلوس کہیں کا،، اور وہ حقارت کی نظر سے اس کو دیکھا کرتے۔

ساشا دبلا پتلا، سانولے رنگ کا تھا، آنکھیں کیکڑے کی طرح باہر کو ابلی ہوئی۔ وہ مدھم لہجے میں جلدی جلدی بات کرتا اور آدھے الفاظ کھا جاتا تھا۔ بات کرنے میں وہ ادھر ادھر دیکھتا جیسے بس اب نوک دم بھاگے گا اور کہیں چھپ جائے گا۔ عام طور پر اس کی بھوری آنکھیں ساکت رہتی تھیں لیکن جب اس کو کسی بات پر جوش آتا تو اس کی آنکھوں کے ڈھیلے تک ہلنے لگتے۔

مجھے وہ اچھا نہیں لگتا تھا۔ مجھ کو میخائل ماموں والا ساشا زیادہ اچھا لگتا تھا، چھوٹا موٹاسا لڑکا، اداس اداس سی آنکھیں، دل میں گھر کر لینے والی مسکراہٹ۔ کتنا ملتا جلتا تھا اپنی بوٹا سی ماں سے۔ اس کے دانت بہت بھدے تھے، باہر کو نکلے ہوئے اور اوپر کے جبڑوں میں دانتوں کی قطار دوہری تھی۔ وہ ہر وقت اپنے دانتوں سے الجھا رہتا تھا اور مستقل طور پر منہ میں انگلیاں ڈالتا اور پچھلے دانتوں کو جھٹکے دے دے کر ڈھیلا کرتا رہتا تھا۔ اگر کوئی اور دیکھنا چاہتا تو بڑی سعادت‌مندی سے اسے بھی دیکھنے دیتا۔ لیکن اس میں اور کوئی دلچسپی کی بات نہ تھی۔ گھر میں اتنے آدمی تھے لیکن وہ اکثر تنہا ہی دکھائی دیتا، کسی اندھیرے کونے میں اکیلا بیٹھا رہتا یا کھڑکی کے نزدیک بیٹھ کر اپنی شامیں گزارتا۔ اس کے پاس بیٹھ کر بات کرنے کی بھی ضرورت نہیں تھی اور یہ چیز مجھے اچھی لگتی تھی — بس کھڑکی کے پاس اس سے چپک کر بیٹھ جاؤ، چاہے گھنٹے بھر تک زبان نہ کھولو اور مزے سے ڈوبتے ہوئے سورج کی سرخ روشنی میں دیکھتے ہوئے اوسپینسکی گرجا کے میناروں پر منڈلاتے چکر کاٹتے کوؤں کا نظارہ کرتے رہو۔ یہ پرندے کبھی دور اوپر اٹھ جاتے، کبھی غوطہ لگا جاتے، پھر ایک سیاہ جال کی طرح مدھم پڑتے ہوئے آسمان پر پھیلتے پھیلتے غائب ہوجاتے۔ غائب ہوجانے کے بعد ایک عجیب طرح کا پھیلا ہوا خلا باقی رہ جاتا۔ اور جب انسان اس طرح کا منظر دیکھ رہا ہو تو پھر اس

کا باتیں کرنے کو کیا جی چاہے گا کہ دل تو ایک عجیب غم‌آمیز انبساط کے احساس سے لبالب ہوتا ہے۔

اس کے بمقابلہ یاکوف ماموں کا ساشا جو تھا، وہ بڑوں کی طرح کسی چیز کے متعلق بھی بڑے موثر انداز میں کافی طویل بات‌چیت کر سکتا تھا۔ اس کو یہ پتہ چلا کہ میں رنگریزی کا کام سیکھنے کے لئے کافی بےچین ہوں، تو اس نے مجھ کو صلاح دی کہ جو میزپوش اتوار کے دن بچھایا جاتا تھا وہ الماری سے لے لوں اور اس کو گہرا نیلا رنگ دوں۔

''سفید چیزوں پر رنگ زیادہ اچھا چڑھتا ہے — میں جانتا ہوں،، اس نے نہایت سنجیدگی سے کہا تھا۔

میں نے بھاری میزپوش گھسیٹ کے نکالا اور اسے لے کر دوڑتا ہوا احاطے میں پہونچا۔ لیکن ابھی میں نے اس کا ایک کونہ ہی ''نیل،، میں ڈبویا تھا کہ تسیگانوک مجھ پر ٹوٹ پڑا، میزپزش میرے ھاتھوں سے چھین لیا اور اسے اپنے بڑے پنجوں سے نچوڑ کر میرے ممیرے بھائی سے، جو چھپر سے سب ماجرا دیکھ رہا تھا، بولا:

''جاؤ، دوڑ کر نانی کو بلا لاؤ!،،

پھر میری طرف مڑا اور اپنا الجھے بالوں والا سر ھلاکر بولا:

''اب دیکھنا — اس حرکت کے لئے کیسی پڑتی ہے۔،،

میری نانی جلدی سے باھر نکلیں۔ یہ شرارت دیکھ کر ان کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا بلکہ جب وہ مجھے اپنے مخصوص عجیب و غریب طریقے سے ڈانٹنے لگیں تو ان کے دو چار آنسو بھی گر پڑے:

''ارے کمبخت۔ تیرے دماغ میں کیا سمائی۔ ارے تجھے پکڑ کر اتنا پیٹے، اتنا پیٹے تو اس پار جا پڑے!،،

پھر وہ تسیگانوک کی خوشامد کرنے لگیں:

''دیکھ بیٹا وانیا۔ نانا سے نہ کہنا۔ میں اسے چھپا دونگی۔ شاید کسی طرح بات بن ہی جائے۔،،

وانیا نے رنگ برنگ کے دھبوں سے بھرے ہوئے گمچھے سے بھیگے ہوئے ھاتھ خشک کرتے ہوئے کہا:

''تم میری فکر نہ کرو - لیکن اس کا خیال رکھنا کہ یہ ساشا کہیں لگائی بجھائی نہ کرے - ''

''میں اسے پیسے دے دونگی، پھر وہ چپ رہےگا''، میری نانی مجھہ کو لے کر اندر چلی گئیں -

سنیچر کے دن شام کے وقت، رات کی عبادت سے پہلے، کوئی مجھے باورچی خانے میں لے گیا - وهاں اندھیرا تھا اور سناٹا - مجھے یاد ھے کہ جو دروازے دوسرے کمروں میں یا باھر کی طرف کھلتے تھے وہ سب بند تھے - کھڑکیوں سے دور تک خزاں کی شام کی بھوری اور سرمئی دھند چھائی ھوئی تھی اور پانی رم جھم رم جھم برس رھا تھا - تندور کے سیاہ دھانے کے سامنے ایک بنچ پر تسیگانوک بیٹھا تھا اور غیر معمولی طور پر اداس اور خاموش نظر آ رھا تھا - میرے نانا کونے میں رکھے ھوئے ایک ٹب کے نزدیک کھڑے ھوئے، اس میں سے پانی میں بھیگی ھوئی بیدیں نکال کر ناپ جوکھہ کے ایک جگہ اکٹھی کرتے جارہے تھے اور اکثر بیدوں کو زور سے ھوا میں گھماتے جس سے شائیں شائیں آواز نکلتی - میری نانی کسی کونے میں اندھیرے میں کھڑی تھیں، باربار زور سے نسوار لیتیں اور بڑبڑاتی جاتیں :

''اس کو مزہ آتا ھے اس میں، ظالم کہیں کا - ''

یاکوف ماموں والا ساشا باورچی خانے کے بیچوں بیچ ایک کرسی پر بیٹھا تھا، مٹھیوں سے اپنی آنکھہ ملتا جاتا اور اس طرح روتا جاتا جیسے کوئی بڈھا فقیر ھو :

''معاف کر دو، یسوع مسیح کے واسطے مجھے معاف کردو - ''

میخائل ماموں کا ساشا اور اس کی بہن، کھمبوں کی طرح ساکت، کرسی کی دوسری طرف کھڑے تھے -

''ھاں ھاں معاف تو کر ھی دوں گا - مگر تم پہلے اپنا ناشتہ تو کر لو''، میرے نانا نے جواب دیا اور ایک لمبی بھیگی ھوئی بید کو اپنی ھتیلی پر کھینچتے ھوئے بولے - ''اچھا، پتلون اتارو - ''

وہ بڑے سکون کے ساتھہ باتیں کر رھے تھے - ان کی آواز آتی رھی - بیقرار قدموں کی چاپ بھی سنائی دی - لیکن ان آوازوں سے وہ سناٹا کم نہ ھوا، وہ ناقابل‌فراموش سناٹا اور وحشت جو اس وقت اس

اندھیرے، نیچی چھت والے، دھویں سے تاریک باورچی خانے پر چھائی ہوئی تھی۔

ساشا اٹھا، پتلون کھول کر گھٹنوں پر لٹکا دئے اور جھک کے لڑکھڑاتا ہوا بنچ کی طرف بڑھا۔ اس کو دیکھ کر کس قدر وحشت ہوتی تھی۔ میرے اپنے گھٹنے کانپنے لگے اور اس سے بھی بدتر کیفیت اس وقت ہوئی جب وہ نہایت بودے پن کے ساتھ اوندھے منہ بنچ پر لیٹ گیا اور وانیا نے اس کو گردن اور بغلوں کے پاس ایک لمبی تولیہ سے باندھ دیا اور پھر جھک کر اسے ٹخنوں کے پاس سے پکڑ لیا۔

میرے نانا چلائے:

''الیکسئی! یہاں آؤ، قریب!.. میں کس سے کہہ رہا ہوں؟ دیکھو یہ مطلب ہوتا ہے ''دھلائی،، کا۔ اچھی طرح دیکھ لو، سمجھے!،،

پھر انہوں نے اپنا ہاتھ گھمایا، شائیں کی آواز آئی اور بید ساشا کے ننگے جسم پر پڑی۔ اس نے زور کی چیخ ماری۔

''ابے بن مت۔ ابھی کہاں پڑی ہے!،، نانا نے کہا۔

انہوں نے پھر ایک سڑا کا دیا جس سے فوراً ھی پیٹھ سرخ ہو گئی اور ایک بڑی سی بدھی پڑگئی۔ ساشا زور زور سے چیخنے لگا۔

''ھوں۔ نہیں آیا مزہ؟ یہ ھے انگشتانے کا مزہ!،،

جب بھی وہ اپنا ھاتھ اونچا کرتے تو اس کے ساتھ ساتھ میرے سینے میں کچھ اوپر کو اٹھنے لگتا اور جب ھاتھ گرتا تو ایسا لگتا کہ میں بھی اس کے ساتھ ساتھ اوندھے منہ گر پڑا۔

ساشا باریک آواز میں زور زور سے چلا رہا تھا اور اس کی آواز سن سن کر دل بیٹھا جا رہا تھا۔

''اب نہیں کروں گا... ارے اب نہیں... میں نے تو آپ کو وہ میزپوش کا قصہ بتایا تھا... ایک تو میں نے آپ کو بتایا...،،

''کہنے سننے سے تمہاری جان نہیں بچ سکتی! لگائی بجھائی کرنے والے تو پہلے پٹتے ھیں۔ چل بے لے اب میزپوش کا مزا...،،

میری نانی نے جھپٹ کر مجھے گود میں سمیٹ لیا۔

''تم الیکسئی کو ھاتھ نہیں لگاؤ گے۔ میں تمہیں نہیں مارنے دوں گی، ظالم بے درد!،،

اور وہ زور زور سے دروازہ پر لاتیں مار مار کے چلانے لگیں:
''وروارا، وروارا!،،

میرے نانا لپکے، نانی کی ٹانگ میں ٹانگ اڑاکے ان کو گرادیا، مجھے دبوچا اور بنچ کی طرف دھکیلا۔ میں ان کے بازوؤں میں تڑپا، ان کی سرخ داڑھی نوچ لی اور ان کی انگلی میں کاٹ کھایا۔ وہ زور سے گرجے اور مجھے دبوچ کے بھینچتے رہے یہاں تک کہ انہوں نے مجھ کو بنچ پر اس زور سے گرا دیا کہ میرا منہ بنچ سے ٹکرا گیا۔ مجھے یاد ہے کہ اس وقت وہ کتنی زور سے چلا رہے تھے:

''باندھو اسے! میں اسے مار ڈالوں گا!،،

اور مجھے اپنی ماں کا ستا ہو چہرہ یاد ہے اور خوف سے پھیلی ہوئی ان کی کٹورا سی آنکھیں۔ وہ بنچ کے آس پاس بیقراری سے دوڑ رہی تھیں:

''ابا جانے دیجئے..! ابا چھوڑ دیجئے...،،

میرے نانا نے مجھے اتنا مارا کہ میں بےہوش ہوگیا۔ اس کے بعد میں کئی دن تک بیمار رہا۔ میں اوندھے منہ ایک چوڑے، نرم گرم بستر پر لٹا دیا گیا تھا۔ جس چھوٹے کمرے میں یہ پلنگ تھا اس میں صرف ایک کھڑکی تھی، کونے میں مقدس شبیہوں کے سامنے چھوٹا سا سرخ چراغ مستقل جلتا رہتا تھا۔

بیماری کے یہ دن میری زندگی کے اہم دن تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ ان چند دنوں میں میری عمر یکایک بڑھ گئی اور مجھ میں ایک خاص صفت یہ پیدا ہوگئی کہ مجھے ان تمام انسانوں کے دکھ کا گہرا احساس پیدا ہوگیا، جیسے میرے دل کو کسی نے چھیل کر رکھ دیا ہو اور وہ ہر اپنے پرائے دکھ کو اپنانے کے لئے زیادہ حساس ہو گیا ہو۔

سب سے پہلے تو مجھے اس لڑائی سے بےحد صدمہ پہونچا جو میری ماں اور نانی کے درمیان ہوئی۔ جیسے ہی میں اس چھوٹے سے کمرے میں پہونچایا گیا، میری لمبی چوڑی سانولی نانی میری ماں پر پل پڑیں۔ میری ماں پیچھے ہٹتے ہٹتے اس کونے میں پہونچ گئیں جہاں مقدس شبیہیں رکھی تھیں۔

''ارے، تونے اسے کیوں نہیں چھینا؟ ہیں؟ ہیں؟،،

''مجھے ڈر لگ رہا تھا۔،،

''اتنی لمبی چوڑی اور ڈر لگ رہا تھا۔ ڈوب مر۔ شرم کر وروارا! میں تو بڑھیا تھی پھر بھی نہیں ڈری! ڈوب مر!،،

''اچھا اب میری جان چھوڑ دو اماں۔ میں خود ھی اپنی جان سے عاجز ہوں...،،

''ارے تجھے اس کی محبت ھی نہیں ھے۔ اس غریب بیکس یتیم پر ترس نہ آیا تجھے۔،،

''میں خود ھی یتیم ہوں۔ جنم جنم کو یتیم ہوں،، میری ماں نے ایک دردناک آواز میں سے کہا۔ پھر دونوں ایک کونے میں پڑے ہوئے ٹرنک پر بیٹھ گئیں اور ایک ساتھ رونا شروع کردیا۔

''اگر الیکسئی نہ ہوتا تو میں کہیں نکل جاتی، کہیں دور اپنا منہ کالا کرتی،، میری ماں کہہ رہی تھیں۔ ''میں اس جہنم میں نہیں رہ سکتی، نہیں رہ سکتی! امی اب مجھ میں بالکل دم نہیں...،،

''آہ میری بچی، میرے کلیجے کا ٹکڑا، میری دل و جان،، نانی آہستہ آہستہ کہہ رہی تھیں۔

اب مجھ پر یہ حقیقت کھلی کہ میری ماں دراصل کچھ ایسی مضبوط نہ تھیں۔ وہ بھی دوسروں کی طرح میرے نانا سے ڈرتی تھیں۔ اور میں اس بات کا ذمہ‌دار تھا کہ وہ یہاں اس گھر میں رہنے پر مجبور ہوں جہاں رہنا ان کے لئے ناقابل‌برداشت تھا۔ اور حقیقت بھی یہ ھے کہ اس واقعہ کے بعد میری ماں غائب ہوگئیں، یہ کہہ کر کہ کہیں کسی سے ملنے جا رہی ہیں۔

ایک دن میرے نانا یکایک مجھ سے ملنے آ گئے۔ ایسا لگا جیسے وہ چھت میں سے کہیں سے ٹپک پڑے ہوں۔ وہ پٹی پر بیٹھ گئے اور اپنی برف سی ٹھنڈی انگلیاں میرے سر پر پھیرنے لگے۔

''کیسے ہو جوان؟ کیا حال چال ھے؟ جواب دو نا..! میری طرف سے دل میں شکایت نہ رکھو۔ ہاں، تو پھر کیا بات ھے؟،،

میرا دل چاہا ان کو ایک لات رسید کردوں۔ لیکن ہلنے جلنے میں تکلیف ہوتی تھی۔ نانا کے بال پہلے سے زیادہ سرخ نظر آرہے تھے، ان کی بےقرار نگاہیں دیواروں کا جائزہ لے رہی تھیں اور سر برابر ہلتا جا رہا تھا۔ انہوں نے اپنی جیب سے کھجور کے آٹے کی بنی ہوئی ایک

بکری نکالی، مٹھائی کے دو بگل نکالے، ایک سیب اور تھوڑی سی کشمش اور ان چیزوں کو تکئے کے پاس میری ناک کے بالکل قریب رکھہ دیا۔

''لو بھئی۔ ہم تمہارے لئے کچھہ تحفے لائے ھیں۔،،

پھر وہ جھکے، میرے ماتھے پر پیار کیا اور سر پر ھاتھہ پھیرتے ہوئے مجھہ سے باتیں کرنے لگے۔ ان کے ھاتھہ چھوٹے چھوٹے اور بہت کھردرے اور سخت تھے، رنگ کے اثر سے بالکل پیلے اور یہ رنگ ان کے ٹیڑھے میڑھے پرندوں جیسے ناخنوں کے پاس خاص طور پر نمایاں تھا۔

''اب کی بار تمہیں اپنے حصے سے ذرا زیادہ ھی مل گئی بیٹے! مجھہ پر جیسے کچھہ پاگل پن سوار ھو گیا تھا۔ لیکن تم نے بھی تو مجھہ کو کاٹا اور نوچا تو اس سے میرا غصہ اور بھی قابو کے باھر ھو گیا۔ لیکن اس مرتبہ اتنی پڑگئی تو کوئی ایسی بری بات بھی نہیں ہوئی۔ آئندہ کبھی موقع ھوا تو یہ زیادہ حساب میں جوڑ لی جائے گی۔ بس ایک بات یاد رکھو کہ جب تمہارے اپنے تمہیں مارتے ھیں تو یہ کوئی بگڑنے کی بات نہیں۔ اس سے سبق حاصل ھوتا ھے۔ لیکن کسی دوسرے کو یہ موقع نہ دینا کہ تمہیں ھاتھہ لگائے — صرف اپنے عزیزوں کو۔ کیونکہ ان کا کیا حساب کتاب بھلا! تم کیا سمجھتے ھو، ھم نے اپنے زمانے میں اپنے حصے کی بہت بھگتی ھے۔ ھم جس طرح سے پیٹے جاتے تھے وہ تمہارے خواب و خیال میں بھی نہیں آسکتا! الیوشا! مجھہ کو تو اس بری طرح پیٹا جاتا تھا کہ اگر خود خدا بھی دیکھتا تو آنسو بہانے لگتا۔ لیکن اس کا جو نتیجہ ھوا وہ ظاھر ھے۔ اب مجھے دیکھو! میں یتیم تھا، میری ماں بھیک منگنی تھی لیکن اب میں ایک پوری دوکان کا مالک ھوں، میرے نوکر چاکر ھیں جن سے میں رعب کے ساتھہ کام لیتا ھوں!،،

وہ مجھہ سے اور قریب آتے چلے گئے۔ ان کا دبلا سڈول جسم مجھہ پر جھکتا چلا گیا اور وہ مجھے اپنے بچپن کے بارے میں بتانے لگے۔ آھستہ آھستہ، وہ اپنے سخت الفاظ کو ایک کے بعد ایک زبان سے نکالتے۔ ان کی سبز آنکھوں میں چمک آ گئی تھی اور سر کے جھٹکے کے ساتھہ بالوں کی سرخی میں سنہراپن جھلملاتا نظر آرھاتھا۔ میرے منہ کے نزدیک اپنا منہ لاکر وہ اپنی باتیں اڑا رھے تھے:

''تم یہاں اسٹیمر پر بیٹھ کر آئے تھے نا، بھاپ کی قوت تمہیں یہاں تک اٹھا کر لائی - لیکن جب میں چھوٹا تھا تو والگا پر میں اپنی طاقت سے کشتیاں کھینچتا تھا - کشتی پانی میں ہوتی تھی، ہم کنارے پر ہوتے تھے، ننگے پاؤں، پتھروں اور چٹانوں پر قدم رکھتے، صبح سورج نکلنے سے لیکر رات کے تارے نکلنے تک ہم کشتیوں کو چالو رکھتے تھے - کبھی کبھی سورج کی تپش اتنی تیز ہوتی تھی کہ بھیجا ہنڈیا کی طرح کھدبد کھدبد پکنے لگتا تھا، کمر کمان کی طرح جھکائے، ہڈیاں چٹخنے لگتی تھیں - دل فریاد کرتا تھا، لب فریاد کرتے تھے - آہ الیوشا! تم کو بھلا کیا دکھ ہے! پھر اسی طرح چلتے رہنا ہوتا تھا یہاں تک کہ تھک کر طاقت کی طنابیں ٹوٹ جاتی تھیں، رسیاں چھٹ جاتیں اور ہم اوندھے منہ گر پڑتے - اس وقت اتنی خوشی ضرور ہوتی تھی کہ چلو اب ذرہ برابر بھی دم باقی نہیں ہے اور جہاں تک اٹھا سکتے تھے مشقت اٹھائی! اور پھر اسی حالت میں پڑے رہتے یہاں تک کہ یا تو سرجاتے یا پھر چل پڑتے - اور ان دونوں میں کوئی خاص فرق بھی نہیں تھا - ہمارا خدا اور ہمارا مہربان یسوع مسیح اس بات کا گواہ ہے کہ ہم اس طرح کی زندگی بسر کرتے تھے! ہم نے پوری والگا کو تین دفعہ اس طرح ناپا ہے - سمبرسک سے لے کر ریبینسک تک، ساراتوف سے لے کر یہاں تک اور استراخان سے لے کر مکارئیف تک، جب میلہ لگا کرتا تھا - اور اس کے معنی ہیں کہ میں نے اس طرح کئی ہزار میل طے کئے ہیں - لیکن چوتھے سال مجھ کو ایک نیا کام دے دیا گیا - میرا کام جہاز سے پانی پھینکنے والوں کا تھا، کیونکہ مالک پر یہ ثابت ہوگیا تھا کہ میں ایک غیرمعمولی آدمی ہوں - ''

جیسے جیسے وہ بات کرتے جاتے مجھے ایسا لگتا کہ وہ بادل کی طرح پھیلتے جا رہے ہیں - ایک دبلے پتلے سوکھے سہمے آدمی کے بجائے وہ ایک ایسے زبردست ہیرو لگنے لگے جس کی بہادری کی زبردست داستانیں ہوں اور جو ایک ہاتھ سے بڑی سے بڑی کشتی اٹھا کر دریائے والگا کے مخالف بہاؤ پر پھینک سکتا ہو -

بات کرتے کرتے وہ پلنگ پر سے اچھل پڑتے اور یہ دکھاتے کہ کشتی کھینچنے والے مزدوروں پر جب ساز کس دیا جاتا تھا تو

وہ کس طرح قدم اٹھاتے تھے اور کس طرح پانی نکالتے تھے۔ کبھی بھاری دردناک آواز میں کوئی ایسا گانا گاتے جو میں نے کبھی نہیں سنا تھا، دریائے والگا پر کشتیاں کھینچنے والوں کا گانا۔ پھر ایک دم سے جوانوں کی طرح اچھل کر میرے پلنگ پر آ بیٹھتے۔ اس وقت وہ ایک عجیب و غریب ہستی لگ رہے تھے اور ان کی آواز برابر گہری اور گہری ہوتی جا رہی تھی اور انداز ایسا ہو گیا تھا کہ ان کی سب باتوں پر یقین آتا جاتا تھا۔

''مگر الیکسئی! اتنی محنت اور مصیبت کے ساتھ بھی — وہ کیا ہی دن تھے! گرمیوں کی شام ہوتی، ژیگولی پہاڑوں کی سرزمین ہوتی اور ہم اپنا پڑاؤ ڈالتے، کسی سرسبز پہاڑ کے نیچے الاؤ جمتا۔ آہ وہ دن! وہ بیتے ہوئے دن، الیکسئی! الاؤ پر دلیہ پکتا رہتا اور کوئی کشتی کھینچنے والا بانکا اپنے دل کی گہرائیوں سے کوئی درد بھرا گیت شروع کرتا اور پھر ہم سب اس میں شریک ہوجاتے۔ لیکن تم یہ گیت سنو تو تمہارا رواں رواں کھڑا ہو جائے، ہمارے گیت سن کر خود والگا کی رفتار بڑھ جاتی تھی جیسے کوئی منہ‌زور گھوڑا ہو جو اپنی تیزی کی دھن میں آسمان کی سرحدوں کو چھو لینے کے لئے تڑپتا ہوا سرپٹ اڑا جا رہا ہو! اس وقت ہماری ساری کلفت اس طرح دھل جاتی تھی جیسے بادتند کے آگے مٹھی بھر خاک۔ ہم اپنے گانے میں ایسے محو ہو جاتے کہ دلئے کا خیال بھی ہمارے ذہن سے اتر جاتا۔ یہاں تک کہ دیگچی چھنچھنانے لگتی اور پھر تو پکانے والے کو خوب چپتیں پڑتیں ''تجھے گانا گانے کو کوئی منع نہیں کرتا لیکن اپنے کام کا بھی تو دھیان رکھہ!،،

کئی بار لوگوں نے دروازے سے نانا کو بلایا لیکن میں ہر بار ان کو روک لیتا:

''ابھی نہیں! ابھی نہ جائیے نانا۔،،

وہ ہنستے اور ہاتھہ ہلاکر زور سے آواز دیتے:

''آرہے ہیں، آرہے ہیں۔ کہو ذرا ٹھہریں۔،،

اور وہ مجھہ سے قصے کہتے رہے یہاں تک کہ شام ہوگئی، پھر انہوں نے مجھے بڑی محبت سے خدا حافظ کہا اور چلے گئے۔ تب مجھے یہ معلوم ہوا کہ نانا ابا نہ تو کمینے ہیں اور نہ خطرناک۔ اگرچہ

یہ یاد کرکے دل دکھتا تھا کہ انہوں نے ھی مجھ کو اتنی بےدردی سے پیٹا تھا۔

نانا کے آنے کے بعد پھر اوروں کے لئے راستہ کھل گیا اور صبح سے شام تک کوئی نہ کوئی میرے پلنگ کے پاس بیٹھا رہتا اور ہر ممکن کوشش کی جاتی کہ میں خوش رہوں۔ مجھے یاد ھے کہ یہ کوششیں ہمیشہ کامیاب نہ ھوتیں۔ نانی اماں سب سے زیادہ میرے پاس آتی رہتی تھیں بلکہ میرے ھی پاس سوتی بھی تھیں۔ لیکن جس شخص نے میرے ذھن پر سب سے گہرا اثر چھوڑا وہ تھا تسیگانوک۔ وہ شام کو آیا کرتاتھا۔ بھاری بھرکم، چوڑے کندھے، بڑا سا سر جس پر سیاہ گھنگھریالے بالوں کا ڈھیر تھا۔ وہ اپنا اتوار کو پہننے والا جوڑا پہنے رہتا تھا — شہد کے رنگ کی ریشمی قمیص، چوڑی مہری کا اطلسی پتلون اور جوتے جو چوں چوں بولتے ہوئے ایسے لگتے تھے جیسے اس کے گھٹنوں میں باجہ بندھا ھو۔ اس کے بال خوب چمکتے تھے، گھنی بھوؤں کے نیچے سے ترچھی آنکھیں ہمیشہ مسرت سے بھری نظر آتی تھیں، نئی نویلی مونچھوں کی سیاہ لکیر کے نیچے سے سفید سفید دانت جھلکا کرتے تھے۔ اس کی قمیص خوب جھلملایا کرتی اور اس میں شبیہوں کے پاس رکھی ہوئی روشنی کی نرم پرچھائیاں چمکتی نظر آتیں۔

''دیکھو، یہ دیکھو!،، اس نے اپنی آستین چڑھا کر اپنے بازو کو ننگا کر دیا اور اس پر سرخ سرخ بدھیوں کا جال سا بچھا ہوا نظر آیا۔ ''دیکھو کیسی سوجی ہوئی لگتی ھیں نا۔ لیکن اب تو یہ بہتر ھو گئی ھیں ورنہ اس سے بھی بدتر لگتی تھیں۔ بات یہ ھے کہ مجھ کو یہ نظر آرہا تھا کہ تمہارے نانا غصے میں ھوش حواس تو بالکل کھو چکے ھیں، کہیں تمہارا دم نہ نکال دیں مارتے مارتے۔ تو میں نے اپنا بازو بید کے نیچے رکھ دیا تھا کہ شاید بید ٹوٹ جائے تو اچھا ھو اور پھر جب تک تمہارے نانا دوسری بید تلاش کریں تمہاری ماں یا نانی تم کو کھینچ نکالیں۔ مگر وہ کمبخت ٹوٹی ھی نہیں، بہت اچھی طرح بھگوئی ہوئی تھی نا۔ بہرحال تم کچھ سڑاکوں سے تو بچ ھی گئے! دیکھو اتنے بہتسوں سے! میں بڑا چلتا ہوا آدمی ہوں۔ ھیں نا؟،،

وہ آہستہ سے بڑے ریشمی انداز میں ہنسنے لگا، پھر اپنی سوجی ہوئی بانہہ کی طرف دیکھ کر بولا:

''افوہ! مجھے تمہارے اوپر اتنا ترس آ رہا تھا کہ میرا دم گھٹا جا رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کا انجام برا ہوگا لیکن وہ مارتے ہی چلے جا رہے تھے، مارتے ہی چلے جا رہے تھے...''

وہ گھوڑے کی طرح فوں فوں کرنے لگا اور سر ہلا کر کچھ اس معصوم اور طفلانہ انداز میں میرے نانا کا ذکر کرنے لگا کہ مجھے اس سے فوراً ہمدردی ہوگئی۔ میں نے اس سے کہا کہ میں اس سے بہت محبت کرتا ہوں اور اس نے بھی ایسی سادگی سے اس بات کا جواب دیا جیسے میں کبھی نہ بھول سکوں گا:

''میں بھی تمہیں چاہتا ہوں — اسی لئے میں نے یہ درد اپنے اوپر لے لیا۔ تمہاری محبت میں! کیا سمجھتے ہو، میں کسی اور کے لئے بھلا ایسا کرسکتا تھا؟ میں تھوکتا بھی نہیں کسی پر! سمجھ میں آیا؟''

پھر دروازے کی طرف ذرا محتاط نظروں سے دیکھتے ہوئے مجھے نصیحت کرنے لگا:

''دیکھو، ابکے پٹائی ہو تو اکڑنا بالکل مت۔ سن رہے ہو؟ اگر بید پڑتے وقت انسان اکڑ جائے تو چوٹ دگنی لگتی ہے۔ جسم کو بالکل ڈھیلا چھوڑ دینا چاہئے تاکہ بالکل نرم ہوجائے حلوے کی طرح۔ اور سانس کبھی نہ روکو، خوب سانس لو جتنا بن پڑے اور پھیپھڑوں کا سارا زور لگاکے چیخو! یاد رکھنا۔ سمجھے؟''

''کیوں، کیا پھر ماریں گے مجھے؟''

''تو اور کیا خیال ہے؟'' تسیگانوک نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ ''ضرور ماریں گے۔ ابھی تو جانے کتنی بار مار پڑے گی۔''

''مگر کیوں؟''

''فکر نہ کرو، تمہارے نانا خود ہی کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ لیں گے۔''

اور پھر وہ مجھے بڑی توجہ کے ساتھ مار کھانے کی ٹکنیک سکھانے لگا:

''اور اگر وہ برابر سیدھے مارتے جائیں نا تو تم بس اسی

طرح لیٹے رہو، جسم کو ڈھیلا چھوڑے، بے حس و حرکت! لیکن اگر وہ بید مار کر بید کو اپنی طرف گھسیٹیں کہ تمہارا چمڑا اس کے ساتھ ادھڑتا چلا آئے تو یہ کرنا چاہئے کہ ان ہی کی طرف لوٹ جاؤ — یعنی جدھر بید اٹھ رہی ہو، سنا؟ اس طرح ذرا ٹھیک رہتا ہے۔"

اس نے میری طرف دیکھ کر آنکھ ماری:

"جہاں تک پٹائی کا سوال ہے میری معلومات پولیس والوں سے بھی زیادہ ہیں کیونکہ میں تو پٹائی میں اپنا اتنا چمڑا ادھڑوا چکا ہوں کہ جوڑا جائے تو ایک عدد پتلون تیار ہوجائے۔"

جب میں اس کے مسرت سے کھلے ہوئے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا مجھے وہ کہانیاں یاد آئیں جو نانی اماں نے مجھے سنائی تھیں — ایوان شہزادے اور ایوانوشکا مسخرے کی کہانیاں۔

۳

جب میں اچھا ہو گیا تو مجھ پر یہ کھلا کہ تسیگانوک کو ہمارے گھر میں کافی عزت حاصل تھی۔ میرے نانا اس پر کبھی اس طرح خفا نہیں ہوتے تھے اور اس سختی سے اس سے پیش نہیں آتے تھے، جس سختی سے وہ میرے ماموؤں سے پیش آیا کرتے تھے۔ جب کبھی اس کی پیٹھ پیچھے اس کے متعلق بات کرتے تو آنکھیں مار کے اور سر ہلا ہلا کر کہتے:

"ارے یہ ایوان شیطان کہیں کا۔ اس کی انگلیاں تو سونے کی ہیں، سونے کی۔ میری بات یاد رکھنا، یہ اس خاندان میں جو پل رہا ہے یہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔"

میرے ماموؤں کی بھی تسیگانوک سے دوستی تھی اور وہ اس کے ساتھ اس طرح کی شرارتیں کبھی نہیں کرتے تھے جیسی وہ بڑے مستری جی گریگوری کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ قریب قریب ہر شام وہ کوئی کمینی قسم کی شرارت سوچ کر مستری گریگوری کو پریشان کرتے تھے۔ کبھی ان کی قینچی کے دستے کو آگ میں تپا دیتے، کبھی ان کی کرسی میں پن لگا دیتے یا مختلف رنگوں کے ٹکڑے ان کے سلائی کے ٹکڑوں میں ملا دیتے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ بینائی

کی کمزوری کی وجہ سے وہ ان سب کو ملا ملا کر سی دیتے اور پھر ان پر میرے نانا کی خوب ڈانٹ پڑتی۔

ایک بار کھانے کے بعد مستری جی باورچی خانے میں تندور کے اوپر والے تختے سے لگ کر سو گئے تو ان لوگوں نے ان کے چہرے پر عنابی رنگ پوت دیا اور وہ بڑی دیر تک یوں ہی مضحکہ خیز اور بھیانک شکل بنائے گھومتے رہے۔ لمبی، سرخ ناک عینک کے سیاہ شیشوں کے بیچ میں اس طرح لٹک رہی تھی جیسے زبان ہو اور سفید داڑھی کے پس منظر میں عینک کے دونوں شیشے دھندلے چمک رہے تھے۔

میرے ماموؤں کی شرارتوں کا خزانہ کبھی خالی نہیں ہوتا تھا لیکن مستری جی بیچارے ایک لفظ کہے بغیر یہ سب کچھ برداشت کر لیتے تھے۔ بس ذرا سا بڑبڑاتے اور رہ جاتے البتہ اتنی احتیاط کرنے لگے تھے کہ چمٹا یا انگشتانہ یا قینچی پکڑنے سے پہلے اپنے ہاتھ پر خوب تھوک لگا لیتے تھے۔ اور اب یہ عادت اتنی پرانی ہو گئی تھی کہ کھانا کھانے بیٹھتے تو چھری یا کانٹا اٹھانے سے پہلے بھی ہاتھ پر تھوک لیتے جس سے سب بچوں کو خوب مذاق اڑانے کا موقع ہاتھ آتا۔ جب انہیں کوئی دکھ ہوتا تو ان کے چوڑے چکلے چہرے پر سکڑن کی لہریں سی بہنے لگتیں جو ایک عجیب طریقے سے ماتھے تک پہونچتیں۔ وہ باربار اپنی بھویں اٹھاتے اور وہ لہریں ان کے گنجے سر میں غائب ہوتی جاتیں۔

مجھے معلوم نہیں کہ ان شرارتوں کے متعلق میرے نانا کا کیا خیال تھا لیکن میری نانی ہمیشہ ان لوگوں کی طرف مکا تان کر کہتیں:

''بے شرم شیطانو! ظالمو، بے دردو تم!،،

تسیگانوک کے پیٹھ پیچھے میرے ماموں اس کے متعلق کمینہ پن کے ساتھ بات کرتے اور طنز سے اس کا ذکر کرتے، اس کے کام میں عیب نکالتے اور اسے نکما اور چوٹا کہتے۔

میں نے ایک دفعہ اپنی نانی سے پوچھا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔

''وہ اس لئے کہ ان میں سے ہرایک کی خواہش ہے کہ تسیگانوک میری دوکان میں کام کرے،، نانی نے بہت صاف اور سیدھے سادے ڈھنگ سے جواب دیا۔ ''اس لئے یہ ایک دوسرے کے سامنے اس کی

برائی کرتے رہتے ہیں ''ذرا دیکھو — کتنا برا کاریگر ہے،،۔ کمینے، چالاک ہیں نا! لیکن ڈر دونوں کو یہ ہے کہ وانیا ان میں سے کسی بھی دوکان پر کام نہیں کرے گا بلکہ تمہارے نانا کے پاس رہے گا۔ اور تمہارے نانا اپنی مرضی کے مختار ٹھہرے۔ وہ یہ چاہیں گے کہ وانیا کے ساتھ مل کر ایک تیسری دوکان کھولیں۔ اور یہ بات تمہارے ماموؤں کے حق میں بہت بری ہوگی۔ سمجھے؟،،

وہ ہنسنے لگیں:

''جیسی چال یہ لوگ چل رہے ہیں نا، اس پر تو خدا کو بھی ہنسی آتی ہوگی۔ اور تمہارے نانا ان کی چالا کیوں کو دیکھتے ہیں، سمجھتے ہیں اور پھر جان بوجھ کر ان کو چھیڑتے ہیں۔ کہتے ہیں ''میں وانیا کے لئے ایک رنگروٹی کا سرٹیفکٹ خریدوں گا تا کہ لوگ اسے فوج میں نہ لے جا سکیں۔ اس کے بغیر میرا کام نہیں چل سکتا۔،، اب یہ سب وہ سنتے ہیں تو اور ان کا دماغ خراب ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ لوگ یہ نہیں چاہتے۔ روپئے کی بھی ان کو فکر ہے۔ رنگروٹی کا سرٹیفکٹ کافی مہنگا ہوتا ہے۔،،

میرا اور نانی اماں کا پھر اسی طرح سے ساتھہ ہو گیا جس طرح اسٹیمر پر ہوا تھا۔ روز رات کو سونے سے پہلے وہ مجھے پریوں کی کہانیاں سنایا کرتیں یا اپنی زندگی کے واقعات جو پریوں کی کہانیوں ھی کی طرح دلچسپ ہوتے۔ لیکن جب کبھی وہ گھر کے روزمرہ کے مسائل پر بات کرتیں — جیسے میرے نانا کی جائداد کی تقسیم، میرے نانا کا ایک نیا مکان خریدنے کا ارادہ — تو پھر وہ بڑے طنز سے بات کرتیں جیسے ان کا دل سب باتوں سے کھٹا ہو گیا ہو اور وہ اس گھر کی بڑی ہونے کے بجائے کوئی پڑوسن ہوں۔

نانی اماں ھی سے مجھے یہ معلوم ہوا کہ تسیگانوک لے پالک تھا۔ ایک رات جب موسم بہار کا آغاز تھا اور بارش ہورھی تھی تو ہمارے گھروالوں نے اسے پھاٹک کے پاس ایک بنڈل میں لپٹا ہوا بنچ پر پڑا پایا تھا۔

میری نانی نے مجھے بتایا:

''بس وہ وہاں پڑا تھا۔ ایک چادر میں لپٹا سردی سے ایسا جکڑا ہوا کہ آنکھیں تک نہیں کھل رہی تھیں۔،،

''لوگ اپنے بچوں کو کیوں پھینک دیتے ھیں؟،،

''ارے بیٹا، جب ماں کے پاس نہ دودھ ھو نہ اتنے پیسے کہ اپنے بچوں کو کچھ کھلا سکے تو پھر وہ کوئی ایسا گھرانا تلاش کرتی ھے جہاں کوئی ننھا بچہ اسی وقت پیدا ھوکر مرا ھو اور اپنے بچے کو لیجاکر اس کی جگہ رکھہ دیتی ھے - ،،

وہ اپنے بالوں میں کنگھی کرتے کرتے ایک پل کے لئے رکیں -

''یہ سب غریبی کے کھیل ھیں الیوشا،، انھوں نے ٹھنڈی سانس بھر کر چھت کی طرف دیکھتے ھوئے کہا - ''بعض لوگ اتنے غریب ھوتے ھیں کہ بس کچھ مت پوچھو - اور یہ بھی ایک شرم کی بات ھے کہ کسی کنواری کے بچہ ھوجائے! تمہارے نانا تو کہنے لگے کہ وانیا کو پولیس میں دیا جائے پر میں نے بات بنا کر ان کو راضی کرلیا - میں نے کہا ''نہیں - ھم ھی جو پال لیں گے اسے - خدا نے اسے ھمارے مرے ھوئے بچوں کے عوض میں بھیجا ھے - ،، بیٹا! میں نے اس دنیا میں اٹھارہ جانوں کو جنم دیا ھے - اگر جیتے رھتے تو اٹھارہ گھر بستے — ایک پوری گلی کی گلی آباد ھوجاتی - دیکھو میں چودہ برس کی تھی جب تو میری شادی کردی گئی، پوری پندرہ کی بھی نہیں تھی کہ پہلا بچہ پیدا ھوگیا - لیکن میری کوکھہ سے پیدا ھونے والے خدا کو اتنے پیارے تھے کہ خدا نے ان کو اپنے پاس بلا لیا اور ان کو اپنا فرشتہ بنا لیا - ھائے کتنی خوشی ھوتی تھی اور پھر کتنا دکھہ ھوتا تھا!،،

وہ اپنا نائٹ گاؤن پہنے پلنگ کی پٹی پر بیٹھی کنگھی کررھی تھیں - ان کا سارا جسم بالوں سے ڈھکا ھوا تھا — اور اپنے بھاری بھر کم جسم کی وجہ سے وہ اس ریچھنی کی طرح لگ رھی تھیں جو ایک کسان ابھی حال ھی میں سرگاچ کے جنگلوں سے پکڑ کر ھمارے احاطے میں لایا تھا -

''تو خدا نے میرے سب اچھے پھلوں کو مجھہ سے لے لیا، بس لے لیا اس نے اور بدترین کو میرے حوالے کر دیا،، وہ ھنسنے لگیں اور اپنے سفید چٹے سینے پر صلیب کا نشان بنایا - ''جب وانیا مجھے ملا تو مجھے بے حد خوشی ھوئی - اصل میں مجھے تمہارے ایسے چھوٹے بچوں سے بہت ھی پیار ھے - میں نے اسے اپنے گھر میں رکھہ لیا اور

پھر اس کا بپتسما کروایا اور اب دیکھو وہ کیسا گبرو جوان نکلا ہے۔ پہلے میں اس کو مکھی کہتی تھی، کیونکہ وہ بس ہر وقت بھن بھن کیا کرتا تھا۔ ادھر لوٹتا، ادھر لوٹتا اور بس بھن بھن کرتا رہتا۔ الیکسئی تم اس سے ضرور پیار کرنا، بڑا سیدھا بچہ ہے!،،

مجھے سچ مچ وانیا سے بہت پیار ہوگیا تھا اور اس کے کمالات پر تو میں حیران ہوکر خاموش رہ رہ جاتا تھا۔

سنیچر کے دن جب نانا ابا ان بچوں کو مار پیٹ چکتے جنھوں نے اس ہفتے کوئی گناہ کیا ہوتا تو وہ رات کی عبارت کے لئے گرجے کی طرف نکل جاتے اور پھر باورچی خانے میں ایک ایسی زندگی شروع ہوتی جس کی دلچسپی ناقابل بیان ہوتی۔ تسیگانوک تندور کے پیچھے سے دو چار تل چٹے پکڑ لیتا، کاغذ کی گاڑی بناتا، دھاگے کی اس میں لگامیں لگاتا اور چاروں مشکی گھوڑوں کی گاڑی صاف ستھرے زرد چکنے میز پر ادھر سے ادھر دوڑتی پھرتی۔ اس کے ہاتھ میں ایک لکڑی ہوتی جس سے وہ گاڑی کو ہنکاتا اور بڑے جوش میں زور زور سے پکارتا جاتا:

''ہٹ جاؤ۔ ہٹ جاؤ۔ بڑے پادری صاحب کو لینے جا رہی ہے سواری!،،

ایک اور تل چٹے کی پیٹھ پر وہ کاغذ کا ایک ننھا سا ٹکڑا لگا دیتا اور اسے گاڑی کے پیچھے دوڑاتا:

''لو بھئی وہ اپنا بستہ بھول گئے تو یہ چھوٹے راھب صاحب بستہ لئے دوڑے جا رہے ہیں۔،،

ایک اور تل چٹے کی ٹانگیں باندھ دیتا۔ وہ بیچارہ لنگڑا لنگڑا کے چلتا، لڑکھڑاتا، مٹکتا، گھسٹتا اور وانیا بڑے مزے میں زور زور سے تالی پیٹتا:

''لو بھئی یہ راھب صاحب نکلے شراب خانے سے اور چلے رات کی نماز پڑھانے۔،،

کبھی کبھی وہ ہم لوگوں کو اپنے چوہوں کا تماشہ دکھاتا۔ اس کے چوہے خوب سدھے ہوئے تھے۔ وہ جب چاہتا ان کو پچھلی ٹانگوں پر کھڑا کر دیتا۔ اور جب وہ اس طرح کھڑے ہوکر چلتے تو ان کی لمبی لمبی پتلی پتلی دمیں ان کے پیچھے پیچھے گھسٹتی جاتیں اور چھوٹی چھوٹی موتی سی آنکھیں باربار جھپکتی ہوئی بڑی مضحکہ

3—1705

خیز لگتیں - وہ اپنے چوھوں سے بڑے شفقت سے پیش آتا تھا، انہیں اپنے کوٹ کے گریبان کے اندر لئے پھرتا اور اپنی زبان پر شکر رکھه کر کھلایا کرتا، ان کو پیار کرتا اور بڑے یقین اور اعتبار کے ساتھه کہتا:

''چوھا نہایت عقلمند دوست ھوتا ھے اور محبت شعار بھی - پریزاد لوگ جو ھوتے ھیں وہ چوھوں کو بہت پسند کرتے ھیں اور جو چوھوں کو کھلائے پلائے اس سے بہت خوش رہتے ھیں - ''

تسیگانوک کو تاش کے پتوں اور سکوں سے بہت سے کرتب کرنے آتے تھے، چیخنے اور شور مچانے پر آتا تو بچوں سے بھی بازی لے جاتا اور اس وقت اس میں اور ننھے بچوں میں کوئی فرق باقی نہ رھتا - ایک دن وہ بچوں کے ساتھه تاش کھیل رھا تھا - اسے مسلسل کئی بار ''گدھا'' بننا پڑا تو بہت خفا ھوا اور منہ پھلا، کھیل چھوڑ اٹھه کھڑا ھوا - پھر بعد میں اس نے بہت پھنپھنا کر مجھه سے شکایت کی:

''سب بناوٹی کھیل تھا - مجھے سب پتہ ھے - ایک دوسرے کو آنکھه مارتے تھے وہ لوگ اور میز کے نیچے ھاتھه ڈال ڈال کر پتے بدل لیتے تھے - یہ بھلا کھیل ھوا؟ ویسے بےایمانی کرنا چاھتا تو میں بھی کرسکتا تھا - ''

تسیگانوک کی عمر انیس سال تھی لیکن وہ اتنا لمبا چوڑا تھا کہ ھم چاروں میرے ممیرے بھائی بہن ملائے جاتے تب بھی وہ بڑا نکلتا -

اس کی ایک بات بہت اچھی طرح سے میرے ذھن پر نقش ھے - جب چھٹیوں کی کسی شام کو میرے نانا اور میخائل ماموں باھر کسی سے ملنے چلے جاتے تھے تو یاکوف ماموں اپنے گھنگھریالے بال بکھیرے، اپنا چھتارا لئے باورچی خانے میں آجاتے اور نانی اماں میز پر کھانے پینے کی چیزیں سجا دیتیں - کھانے کو بہت سی چیزیں ھوتی تھیں اور ایک سبز جگ میں سے جس کی تہہ میں لال پھول بنے ھوئے تھے وادکا انڈیلی جاتی - تسیگانوک اتوار کے کپڑے پہنے پھرکی کی طرح ادھر ادھر مٹکتا پھرتا - مستری گریگوری آھستہ ھلتے ڈولتے آتے عینک چمکاتے اور شامل ھو جاتے - ھماری بوا ایوگینیا بھی آ پہونچتیں - ان کے چہرے پر ماتا کے داغ تھے، وہ مٹکے کی طرح گول

سول تھیں، بھاری آواز، ننھی ننھی تیز آنکھیں - کبھی اوسپینسکی گرجا کے گیسو دراز پادری صاحب بھی آ کے شریک ہوجاتے اور کچھہ اور لوگ بھی، سانولے سانولے رنگ، چکنے سکنے جو دیکھنے میں مچھلیوں کی طرح لگتے -

ہر شخص خوب جی بھر کر کھاتا، جی بھر کر پیتا اور گہری گہری ٹھنڈی سانسیں لیتا جاتا - بچوں کی بھی تواضع ہوتی اور ان کو ان کا حصہ ملتا — چھوٹے چھوٹے گلاسوں میں میٹھی شراب - اور پھر رفتہ رفتہ ایک عجیب ترنگ کی سی کیفیت پیدا ہونے لگتی -

یاکوف ماموں محبت بھرے ہاتھہ سے اپنے چھتارے کو الٹتے پلٹتے اور باربار وہی ایک بات کہتے جاتے :

''لو بھئی تیار ہوجاؤ - اب میں شروع ہوتا ہوں - ،،

سر کو جھٹکا دے کر وہ بالوں کے ڈھیر کو پیچھے پھینکتے، ساز پر جھک جاتے اور راج ہنس کی طرح آگے کو گردن بڑھاتے - ان کے گول بےفکر چہرے پر ایک خواب کی سی کیفیت چھا جاتی، آنکھوں میں ایک چکنی چمکدار سی دھند آجاتی - دھیمے سے وہ ساز کے تاروں کو چھوتے جاتے - اور پھر ایک ایسی دھن بجانے لگتے جو لوگوں میں آگ لگا دیتی -

ان کی موسیقی کا تقاضہ تھا کہ بالکل خاموشی ہو جائے - وہ اس طرح بڑھتی تھی جیسے دور کہیں کوئی چشمہ ابل رہا ہو، پھر جیسے موسیقی دیواروں اور فرش اور چھت سے پھوٹنے لگتی تھی اور دل میں ایک عجیب سی غمناک بیقراری ابھار دیتی تھی - انسان کو اپنے سارے دکھوں کا احساس ہونے لگتا تھا اور دوسروں کے دکھوں کا بھی - بڑوں پر یہ اثر ہوتا کہ وہ بھی بچے بن جاتے تھے اور ہر شخص ساکت بیٹھا رہتا تھا - مکمل خاموشی طاری ہوجاتی تھی -

میخائل ماموں‌والا ساشا خاص طور پر بڑے غور سے سنتا تھا - وہ اپنا پورا جسم اپنے چچا کی طرف جھکا دیتا، آنکھیں چھتارے پر جم جاتیں، منہ کھلا ہوتا اور منہ کے کونوں سے رال ٹپکتی ہوتی تھی - کبھی کبھی تو وہ اتنا محو ہو جاتا کہ کرسی سے پھسل پڑتا مگر ایسے موقع پر بھی جہاں وہ گرتا وہیں چاروں ہاتھہ پاؤں کے بل رکا رہتا، آنکھیں اسی طرح چھتارے پر جمی رہتیں -

موسیقی کے افسوں سے ہر شخص سانس روکے بیٹھا رہتا۔ صرف سماوار مدھم مدھم گنگناتا رہتا لیکن اس سے ہماری محویت میں کوئی فرق نہ پڑتا۔ خزاں کی رات چھوٹی چھوٹی کھڑکیوں کو گھورتی رہتی تھی، کبھی کبھی کوئی آتا تو آہستہ سے کھڑکی کے شیشوں پر دستک دیتا۔ میز پر دو شمعیں جلتی رہتیں اور ان کے زرد پیکان کے سے نوکدار شعلے تھرتھراتے رہتے۔

یاکوف ماموں بےخودی کے عالم میں اور کھوتے جاتے۔ ان کے دانت بھنچ جاتے اور ایسا لگتا کہ گہری نیند سو رہے ہیں۔ لیکن ان کے ہاتھوں میں ایک اور ہی زندگی کی لہر بڑھتی جاتی۔ ان کے داھنے ہاتھ کی بل کھاتی ہوئی انگلیاں ساز کے تھرتھراتے ہوئے تاروں کو چھیڑ رہی تھیں اور بائیں ہاتھ کی انگلیاں پرندے کی طرح تاروں پر دوڑ رہی تھیں۔

جب وہ ایک دو جام پی چکتے تو گانا شروع کرتے۔ ان کی آواز ناگوارسی لگتی تھی جیسے وہ سسکیاں بھر بھر کے رو رہے ہوں:

یاکوف میاں پلے کی طرح گر یوں ہی روتے جائیں گے
ہمسائے بیچارے چین سے پھر کاھے کو سونے پائیں گے
او... ووو پروردگار عالم!
او... ووو مرا ناک میں ہوگیا دم!
وہ دیکھو ادھر گلی میں نن ایک بیچاری آتی ھے
اور کاؤں کاؤں اک
کوے کی، اس کی چاپ سے تال ملاتی ھے
او... ووو، مرا ناک میں ہو گیا دم
اک جھینگر اوٹ میں چولھے کی، مدھم سر میں کچھ گاتا ھے
اور دور کہیں پیڑوں تلے، مینڈک کوئی ٹراتا ھے
او... ووو، مرا ناک میں ہو گیا دم
دھوپ میں ڈالی اپنی نیکر ایک کسی بھک منگے نے
آتے جاتے اس کو چرایا جانے کس رہ چلتے نے
او... ووو مرا ناک میں ہو گیا دم
بالکل ناک میں ہو گیا دم
او... ووو پروردگار عالم

مجھ سے یہ گانا بالکل برداشت نہیں ہوتا تھا۔ اور جب میرے ماموں فقیروں کا ذکر کرتے تو میرے دل کو کسی طرح صبر نہ آتا اور میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا۔

تسیگانوک بھی اوروں کی طرح موسیقی بڑی توجہ سے سنتا، اپنے گھنگھریالے بالوں کے گچھوں میں وہ اپنی انگلیاں پھنسا لیتا اور زور زور سے سانس لیتا ہوا ایک طرف کو کونے میں گھورنے لگتا۔ کبھی کبھی وہ بڑے دردبھرے انداز میں کہتا:

''آہ، کاش خدا نے مجھے آواز دی ہوتی! تو پھر میں کیا گاتا! کیا ہی گاتا!،،

''اچھا اب زیادہ کچوکے نہ لگاؤ یاکوف!،، میری نانی ٹھنڈی سانس بھر کر کہتیں ''چلو اٹھو، ایک ناچ ہوجائے وانیا...،،

نانی اماں کی بات ہمیشہ تو نہیں پوری کی جاتی تھی لیکن بعض بعض وقت سازنواز ایک پل کے لئے زور سے تاروں پر جھکتا، مٹھیاں بھینچتا اور ایک وحشت کے عالم میں جیسے ایک چیز زمین پر پٹختا — ایک ایسی چیز جو خاموش اور ساکت ہوتے ہوتے نظروں سے اوجھل ہوجاتی۔ پھر وہ شہدوں کی طرح زور سے چلاتا:

''بس۔ ختم کرو اس اداسی کو! کھڑے ہوجاؤ وانیا!،،

وانیا اس طرح کھڑا ہوجاتا جیسے پرجھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا ہو، اپنی زرد قمیص کو کھینچ کر سیدھی کرتا اور یوں چلتا ہوا کمرے کے بیچوں بیچ آ کھڑا ہوتا جیسے شیشے پر چل رہا ہو۔ پھر ذرا جھینپتا ہوا، شرماتا ہوا بڑی لجاجت سے کہتا:

''یاکوف، ذرا تیزی سے!،،

چھتارے سے تیز گتیں پھوٹنے لگتیں، فرش پر تسیگانوک کے پیر تال دینے لگتے، میز اور الماری پر برتن کھڑکنے لگتے اور تسیگانوک پھرکی کی طرح کمرے کے بیچوں بیچ چکر کاٹنے لگتا۔ ایک بڑی سی پر پھیلائے ہوئے چڑیا کی طرح وہ ادھر ادھر جھکتا اور اپنے شہپر کے سے بازو ہلاتا ہوا اپنے پیروں کو اتنی تیزی سے حرکت دیتا کہ نگاہیں ان پر جم نہیں سکتی تھیں۔ ایک دم سے وہ اکڑوں بیٹھ جاتا اور سونے کے لٹو کی طرح گول گول چکرانے لگتا۔ اس کی ریشمی

قمیص کی چھوٹ کپکپی اور تھرتھراہٹ شعلہ کی مانند دمکتی اور تمام چیزوں پر روشنی چھٹکتی جاتی۔

تسیگانوک کبھی ناچتے نہیں تھکتا تھا۔ اور ناچتے ناچتے بالکل بے خود ہو جاتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اگر دروازہ کھول دیا جائے تو وہ ناچتے ناچتے گلی میں نکل جائے، وہاں سے شہر میں اور پھر وہاں سے ہوتا ہوا کسی نا معلوم دیس کی طرف...

''مڑ جاؤ، مڑ جاؤ،، یاکوف ماموں چیخے اور برابر پاؤں سے تال دیتے گئے۔

اور انہوں نے زور کی سیٹی بجائی اور اپنی ناگوار آواز میں شعر پڑھا:

آہ ماں! اگر مجھے اپنے جوتوں کا خیال نہ ہوتا
تو کب کا بیوی بچے چھوڑ نو دو گیارہ ہوگیا ہوتا

میز پر بیٹھے ہوئے لوگ بھی مزے میں آگئے، کبھی چلاتے، کبھی سیٹی بجاتے، کبھی ''آئی،، ''اوئی،، کرتے جیسے ان کو کوئی گرم لوہے سے داغ رہا ہو۔ بوڑھے مستری جی اپنی صاف چندیا پر انگلیوں سے تال دے رہے تھے اور منہ ھی منہ میں کچھہ بڑبڑاتے جاتے تھے۔

ایک بار وہ بالکل مجھہ پر جھک پڑے، لمبی داڑھی میرے کندھوں پر چھا گئی، دھیمے سے اس طرح مجھہ سے بولے جیسے میں کوئی بڑا بوڑھا ہوں:

''اگر تمہارے باپ یہاں ہوتے الیکسئی، تو وہ تو اور کمال دکھاتے، وہ بڑے خوش باش آدمی تھے۔ یاد ھیں؟،،

''نہیں۔،،

''آہ! بس ان کی تو تمہاری نانی سے خوب نبھتی تھی... ٹھہرو۔ ایک منٹ ٹھہرو!،،

مستری گریگوری کھڑے ہوگئے — لمبا قد، دبلا پتلا جسم، لمبے جیسے کوئی ولی اللہ ہو۔ پھر وہ میری نانی کے سامنے جھکے اور غیر معمولی جذباتی آواز میں بولے:

''اکولینا ایوانوونا، ذرا ہم لوگوں کو ایک ناچ دکھاؤ۔

جیسا تم میکسم سواتیئوچ کے ساتھ ناچتی تھیں نا... آؤ، آؤ نا۔ مہربانی کرکے!،،

''ارے کیا کہہ رہے ہو گریگوری؟ ذرا ہوش کی دوا کرو۔ ارے توبہ میں سرجاؤں!،، نانی پیچھے کھسکتی ہوئی ہنسنے لگیں۔ ''میں ناچوں؟ کیا لوگوں کو مجھ پر ہنسوانا ہے؟،،

لیکن پھر ہر شخص نے ان سے اصرار کرنا شروع کر دیا۔ اور یکایک وہ کسی دوشیزہ کی طرح اٹھ کھڑی ہوئیں، اپنا لہنگا وغیرہ ٹھیک کیا، سر کو پیچھے کی طرف جھٹکا دیا اور جیسے بہتی ہوئی نکل کھڑی ہوئیں۔

''اگر لوگ ہنسنا چاہتے ہیں تو ہنسیں! چلو یاکوف! گت تال ٹھیک کرو!،،

میرے ماموں بھی پیچھے کو ہو بیٹھے، اپنے پاؤں پھیلا لئے، آنکھیں ذرا بند کرلیں اور ایک مدھم سی تان بجانی شروع کی۔ تسیگانوک ایک لمحہ کے لئے رک گیا، پھر اچھلا اور مارے خوشی کے نانی اماں کے چاروں طرف کودنے لگا۔ وہ بالکل خاموشی سے فرش پر اس طرح قدم اٹھا رہی تھیں جیسے ہوا میں تیر رہی ہوں اور ساتھ ہی ساتھ بڑے دلکش انداز میں ہاتھوں کو گھما رہی تھیں۔ ان کی بھویں تن گئی تھیں اور بڑی بڑی سیاہ آنکھیں کہیں دور خلا میں جمی ہوئی تھیں۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ بڑی مضحکہ‌خیز معلوم ہو رہی ہیں اور میں نے ''کھی،، سے کیا ہی تھا کہ مستری گریگوری نے مجھکو انگلی دکھائی اور سب بڑے غصے سے گھورنے لگے۔

''ہٹ ایوان،، مستری گریگوری ہنس کے بولے۔ ایوان بڑی سعادت مندی سے ہٹ گیا اور ایک کونے میں جاکے بیٹھ گیا۔ ایوگینیا بوا نے گال پھلائے اور بڑی ہی نفیس اور گہری آواز میں گانا شروع کیا:

لڑکی ایک پاؤں پر ناچتی رہی
پورے سات دن کام کرتی رہی
ہائے کام کے بوجھ سے
وہ تو مرتے مرتے بچی

نانی اماں کا ناچ ناچ تو لگتا ہی نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا وہ کوئی کہانی کہہ رہی ہیں۔ کبھی ان کی رفتار مدھم ہوجاتی، کبھی ایک طرف کو جھکتیں، کبھی دوسری طرف کو، کبھی اٹھے ہوئے ہاتھہ کے نیچے سے جھانکتیں۔ بڑی احتیاط سے رک رک کے قدم اٹھاتیں۔ پھر یکایک تھم جاتیں جیسے ڈر گئی ہوں، چہرے پر بل پڑجاتے، تھرتھری طاری ہوجاتی۔ ایک دم سے ان کے چہرے پر ایک شفیق دوستانہ گھلاوٹ والی مسکراہٹ کی روشنی دمکنے لگتی، اچھل کر وہ ایک طرف کو ہو جاتیں جیسے سب کوٹھیل کر کسی کے آنے کے لئے جگہ بنا رہی ہوں۔ پھر سر جھکائے خاموش کھڑی ہوجاتیں جیسے بڑے غور سے کوئی آہٹ سن رہی ہوں۔ اور ان کے چہرے پر خوشی کی روشنی جھلملانے لگتی۔ یکایک پھر تیزی سے رقص کرنے لگتیں، گول گول پھرتے ہوئے وہ اتنی سیدھی اور سروقد لگتیں، ویسی تو عام طور پر کبھی نہ لگتی تھیں — اور اس کیفیت میں ان پر جوانی لوٹ آتی اور اس قدر دلکش و دلربا دکھائی دیتیں کہ ان پر سے نظریں ہٹانا ناممکن ہوتا۔

اس دوران میں ایوگینیا بوا بگل کی طرح گلا پھاڑتی رہتیں۔

اتوار کو دن سے رات تک
ناچتی رہی وہ، ناچتی رہی وہ
سڑک سے وہ سب سے آخر میں لوٹی،
ہائے چھٹی کا دن کس طرح گزر گیا پلک جھپکتے

جب رقص ختم ہو جاتا تو نانی اماں سماوار کے پاس اپنی جگہ پر جابیٹھتیں۔ سب ان کی تعریفیں کرتے پر وہ بڑی خاکساری کے انداز میں برا مانتیں:

''اچھا، اچھا۔ بس ہوا، بس ہوا۔ تم نے کبھی سچ مچ کسی رقاص کو دیکھا ہو تو جانو،، وہ اپنے منتشربالوں کو سمیٹتے ہوئے کہتیں۔ ''جہاں ہم رہتے تھے نا بالاخنا میں تو وہاں ایک لڑکی رہتی تھی — لو میں اس کا نام بھی بھول گئی، یہ بھی بھول گئی کس کی تھی — وہ ایسا ناچتی تھی کہ مارے خوشی کے لوگوں کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑتے تھے۔ اس کو دیکھنا ہی بس جشن سے

کم نہ تھا۔ پھر کسی اور بات کو جی ھی نہیں چاھتا تھا۔ تبھی مجھے اس سے بڑی جلن ھوتی تھی — مجھ گنہ‌گار کو!،،

ایوگینیا بوا جوش میں آ کر کہتیں ”گانے اور ناچنے والوں ھی سے دنیا کا مزا ھے جیسے کھانے کا نمک سے،، اور پھر وہ حضرت داؤد کے متعلق کوئی گانا شروع کر دیتیں۔

یاکوف ماموں تسیگانوک کے گلے میں باھیں ڈالتے۔ ”ارے تجھے تو کسی شراب خانے میں رقاص کی جگہ ملنی چاھئے۔ ایسا لوگوں کا جی خوش کرے گا کہ کیا کہنا!..،،

”ارے نہیں،، تسیگانوک شکوہ‌آمیز لہجے میں کہتا ”میرا تو دراصل گانے کو جی چاھتا ھے، کاش خدا مجھے آواز بخش دیتا تو دس برس بغیر رکے گاتا جاتا۔ پھر چاھے میرا جو کچھ حشر ھوتا — چاھے میں پھر خانقاہ کا راھب ھی کیوں نہ بن جاتا!،،

سب لوگ خوب وادکا چڑھاتے، خاص طور پر مستری گریگوری۔ نانی اماں ان کو گلاس پر گلاس انڈیل کردیتی جاتیں اور کہتی جاتیں:

”دیکھو گریگوری، ذرا طبیعت کو روک کے! نہیں تو بالکل اندھے ھو جاؤگے۔ خاک نہیں سوجھے گا۔ ،،

”تو پھر کیا ھوا،، وہ جواب دیتے۔ ”مجھے اب دیدوں کی کیا پڑی ھے! جو کچھ دیکھنا چاھتا تھا دیکھ چکا...،،

وہ کبھی مدھوش نہیں ھوتے تھے لیکن جیسے جیسے پیتے جاتے، بات کی رفتار بڑھتی جاتی۔ مجھ سے سارے وقت میرے باپ کے متعلق باتیں کرتے رھتے:

”اھا۔ کیا فراخ‌دل آدمی تھا وہ۔ ھاں ھاں وہ تھا بس۔ میرا اچھا دوست میکسم...،،

نانی اماں ٹھنڈی سانس بھر کر ان سے اتفاق کرتیں ”ارے ھاں۔ وہ تو بڑا اللہ والا آدمی تھا...،،

مجھے یہ سب باتیں بڑی اچھی لگتی تھیں اور دل سرخوشی اور شوق سے لبریز ھوجاتا اور اس فضا سے خوشی کے ساتھ ساتھ غم‌آمیزی بھی پیدا ھوتی، ایک اداسی بھی چھا جاتی۔ سب کے دلوں میں خوشی اور دکھ کا احساس ساتھ ساتھ بڑھتا جاتا جیسے یہ دونوں چیزیں

ایک دوسرے سے الگ نہ ہو سکتی ہوں اور بڑی تیزی سے باربار ایک دوسرے کی جگہ لیتی رہتی ہوں۔

ایک بار یاکوف ماموں کچھ ایسے مدھوش ہوئے کہ وہ اپنا گریبان پھاڑنے لگے، اپنے گھنگھریالے بال نوچنے لگے، اپنی بے رنگ مونچھیں، ناک اور لب کھینچنے لگے۔

''ہائے ہائے، کیوں؟ ارے کیوں؟،، وہ زور زور سے روتے اور آنسو بہتے جاتے۔ ''ہائے ایسا کیوں ہے؟ ایسا کیوں ہے؟،،

روتے روتے وہ اپنے گالوں پر، بھوؤں پر، سینے پر مکے مارتے جاتے: ''ہائے میں کتنا نالائق ہوں، کتنا برا! میرا کہیں ٹھکانہ نہیں...،،

''آہ!،، مستری جی چیختے۔ ''یہ بات ہے، یہ بات ہے!..،،

''بس ہوا یاکوف،، نانی اماں بھی نشے میں کچھ کھوئی ہوئی اپنے بیٹے کے ہاتھ تھامتے ہوئے کہتیں۔ ''خدائے رحیم و کریم ہمیں جس حال میں رکھے اس کی مصلحت ہے۔،،

تھوڑا سا پی لینے کے بعد نانی اماں اور بھی خوب ہو جاتی تھیں — ان کی مسکراتی ہوئی سیاہ آنکھیں ہر شخص پر گرمجوشی کا نور برسانے لگتیں، گنگناتی ہوئی آواز میں اپنے آپ کو رومال سے پنکھا جھلتے ہوئے کہتیں:

''ارے خدا! آہ اے ذرا۔ کس قدر اچھا ہے یہ سب! ارے دیکھو تو سہی کس قدر اچھا ہے یہ سب!،،

دراصل یہی ان کی دل کی پکار تھی۔ یہی ان کی زندگی کا نعرہ تھا۔

جب مجھے اس بات پر حیرانی ہوتی کہ میرے بے فکرے ماموں کیوں اس طرح سے روتے اور اپنے آپ کو مکے مارنے لگتے ہیں تو میری نانی ہچکچاکے بڑبڑانے کے انداز میں کہتیں:

''ارے بیٹا، تجھے تو سب معلوم ہونا ہی ہے! بس ذرا صبر کر۔ ابھی تیرے دن نہیں ہیں کہ ہر بات میں اپنی ٹانگ اڑاتا پھر...،،

اس بات سے میری کرید اور بڑھ جاتی تھی۔ میں کارخانے میں گھس جاتا اور ایوان سے طرح طرح کے سوالات کرتا۔ مگر وہ بھی ہمیشہ میری بات کا گول مول جواب دیتا۔ دبی سی ہنسی ہنس دیتا

مستری جی کی طرف کنکھیوں سے دیکھتا اور مجھے دوکان کے باہر ٹھیل دیتا:

''بس بس بہت ہوا۔ بھاگو یہاں سے نہیں تو انہیں ناندوں میں سے کسی میں ڈبو دوں گا! پھر نکلوگے رنگے ہوئے۔ کھسکو یہاں سے!،،

مستری جی ایک چولھے کے آگے کھڑے تھے جس پر تین ناندیں بنی ہوئی تھیں۔ وہ ان میں سے ایک میں بھرے ہوئے رنگ کو ایک سیاہ بانس سے چلا رہے تھے اور کبھی کبھی رنگ میں پڑے ہوئے کپڑے کو بانس پر نکال کر دیکھتے اور پانی کے باہر نکلے نچڑے ہوئے کپڑے کو دیکھ کر رنگ کا اندازہ کرتے۔ ان کے چمکتے ہوئے چمڑے کے پچرنگے اپرن میں آگ کے لپکتے ہوئے شعلوں کا عکس اس طرح دکھائی دیتا تھا جیسے کسی پادری کی کارچوبی عبا ہو۔ ناندوں میں رنگین پانی کھل کھل، کھل کھل ابل رہا تھا اور کڑوی بھاپ کے بادل دھویں کی طرح دروازے سے نکل نکل کر باہر ٹھنڈے صحن میں پھونچ رہے تھے۔

مستری نے عینک کے پیچھے سے اپنی سرخ اور دھندلی آنکھوں سے مجھے غور سے دیکھا، پھر ایوان سے بولے:

''ابے تجھے دکھائی نہیں دیتا کہ مجھے اور لکڑیوں کی ضرورت ہے؟،،

جب تسیگانوک صحن کی طرف دوڑا تو وہ صندل کی ایک بوری پر بیٹھ گئے اور مجھے اشارہ کیا:

''یہاں آؤ۔،،

انہوں نے مجھے اپنے گھٹنوں پر بٹھالیا، ان کی نرم گرم داڑھی میرے گالوں سے چھونے لگی اور پھر انہوں نے مجھے کچھ ایسی باتیں بتائیں جو میں کبھی بھول نہیں سکوں گا:

''تمہارے ماموں نے اپنی بیوی کو مارتے مارتے مار ڈالا اور اب اس کا ضمیر اسے چین نہیں لینے دیتا۔ سمجھے؟ تمہارے لئے ضروری ہے کہ تم کو یہ سب باتیں بتائی جائیں۔ اپنی آنکھیں کھلی رکھنا ورنہ یہاں بہت مصیبت میں پھنسوگے۔،،

نانی اماں کی طرح مستری گریگوری سے بھی باتیں کرنا آسان

تھا لیکن مجھے ان کی باتوں سے خوف سا لگتا کیونکہ ایسا لگتا تھا کہ جہاں انہوں نے اپنی سیاہ عینک کے نیچے سے دیکھا اور بس ہر چیز کی حقیقت ان پر کھل گئی۔

''اور یہ پوچھو بھلا کیسے مار ڈالا؟،، وہ آہستہ کہتے رہے ''اس طرح کہ وہ بستر میں اس کے ساتھ لیٹتا اور پھر اس کو لحاف سے ڈھک، اس کی خوب دھنائی کرتا، خوب کوٹتا اسے! کیوں؟ یہ بات تو اسے خود بھی معلوم نہیں تھی کہ کیوں؟،،

اتنے میں ایوان لکڑی کا ایک گٹھا لئے اندر آ گیا اور آ گ کے سامنے پھسکڑا مار کر بیٹھتے ہوئے اپنے ھاتھ سینکنے لگا۔ لیکن گریگوری اس کی طرف متوجہ نہیں ہوئے اور اپنی بات بڑے موثر لہجے میں کہتے رہے:

''ممکن ھے وہ اس کو اس لئے مارتا رہا ھو کہ وہ اس سے اچھی تھی اور وہ اس سے جلتا تھا۔ یہ کاشیرین خاندان والے کوئی اچھی چیز دیکھ ھی نہیں سکتے، سمجھے بیٹے۔ ہر اچھائی سے وہ جلتے ھیں۔ لیکن وہ اچھائی اپنے میں پیدا نہیں کر سکتے۔ اس لئے اس کا صفایا ھی کر دیتے ھیں۔ تم ذرا اپنی نانی سے پوچھو ان لوگوں نے کیسے تمہارے باپ کی زندگی میں زھر گھولا۔ وہ تمہیں سب کچھ بتا دیں گی۔ وہ جھوٹ نہیں برداشت کر سکتیں۔ کہ لوگ کچھ ان کے پلے نہیں پڑتے۔ یہ تمہاری نانی تو بس ایک طرح کی ولی ھیں۔ کبھی کبھی تھوڑی سی پی لیتی ھیں یا نسوار لیتی ھیں تو اس سے کیا۔ بڑی پاک باز عورت ھیں۔ تم ان کی قدر کرنا بیٹا...،،

انہوں نے مجھے پرے ھٹا دیا اور میں باھر احاطے میں چلا گیا، حیران اور سہما ھوا۔ ڈیوڑھی تک پہونچتے پہونچتے مجھے وانیا نے جالیا۔

''ان سے ڈرنا مت، وہ بڑے بھلے آدمی ھیں،، اس نے میرے کان میں چپکے سے کہا۔ ''اس کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر دیکھو، وہ ایسے لوگوں کو پسند کرتا ھے۔،،

ھر چیز عجیب و غریب طریقے سے بو کھلا دینے والی تھی۔ مجھے کسی اور زندگی کا پتہ نہیں تھا لیکن پھر بھی کچھ کچھ یاد تھا کہ میری ماں اور میرے باپ اس طرح تو نہیں رہتے تھے۔

وہ تو اور ہی طرح سے بات کرتے، ان کی اور ہی دلچسپیاں تھیں، ساتھ اٹھتے بیٹھتے، ساتھ نکلتے گھومتے، ساتھ، ایک ساتھ۔ شام کو وہ کھڑکی پر بیٹھ کر گاتے، دل کھول کر دیر تک ہنستے رہتے۔ ان کی بات سننے کو، انہیں دیکھنے کو تو پڑوسی تک جمع ہو جاتے۔ مجھے یاد ہے کہ ان پڑوسیوں کے اوپر اٹھے ہوئے چہروں کو دیکھ کر مجھے ہمیشہ کھانے کی جھوٹی رکابیوں کا خیال آتا۔ یہاں اس کے بالکل برعکس لوگ کبھی کبھار ہی ہنستے تھے اور جب ہنستے تو یہ بھی ٹھیک سے نہ کہا جا سکتا کہ ہنس کس بات پر رہے ہیں۔ ہر وقت ایک دوسرے پر چلاتے رہتے، ایک دوسرے کو دھمکاتے رہتے اور کونے میں کانا پھوسی کیا کرتے۔ بچے ہر وقت خاموش رہتے جیسے ان کا ہونا نہ ہونا برابر ہو، ہر وقت سہمے سہمے — جیسے بارش سے گرد بیٹھ جاتی ہے۔ میں اپنے کو اس گھر میں بالکل اجنبی محسوس کرتا اور میرے چاروں طرف کی زندگی جیسے ہر وقت ہزاروں سوئیاں چبھوتی رہتی۔ ہر وقت میرے کان کھڑے رہتے اور میں ہر چیز کو بڑے غور سے دیکھتا۔

ایوان سے میری دوستی بڑھ گئی۔ دن نکلنے سے لے کر رات گئے تک نانی گھر کے دھندوں میں پھنسی رہتیں اور میں دن بھر تسیگانوک کے پیچھے پیچھے لگا رہتا۔ جب کبھی میرے نانا میری پٹائی کرتے تو تسیگانوک اپنے بازوؤں سے مجھے بچاتا اور پھر بعد کو اپنی سوجی ہوئی انگلیاں مجھے دکھاتا اور کہتا جاتا:

"کیا تک ہے آخر اس کا! تم کو تو کوئی فائدہ ہوتا نہیں اور مجھے یہ ملتا ہے — دیکھو! اور اب بس ہو چکا۔ اب سے جو تم پر پڑے وہ اپنا بھگتنا!"

لیکن دوسری مرتبہ وہ پھر سے خواہ مخواہ کی سزا بھگت لیتا۔

"تم نے تو کہا تھا اب نہیں بھگتوگے؟"

"کہنا اور کرنا دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ مجھے خود ہی پتہ نہیں کہ کیا ہو گیا۔"

جلد ہی مجھے ایوان کے متعلق کچھ اور باتیں معلوم ہوئیں جن سے میرے دل میں اس کی محبت، احترام اور دلچسپی اور بڑھ گئی۔

میرے نانا کا ایک کمیت گھوڑا تھا، بے حد شریر اور میٹھی چیزیں کھانے کاشوقین۔ نانی اس گھوڑے پر جان دیتی تھیں۔ تسیگانوک ہر جمعے کو اس پر ساز کستا، اسے ایک بڑی سی گاڑی میں جوتتا، خود ایک بڑی ٹوپی پہنتا، چمڑے کا اٹنگا کوٹ پہنتا، کمر میں سبز رنگ کی پیٹی کستا اور ہفتے بھر کا سامان لانے کے لئے بازار جاتا۔ کبھی کبھی اس کو گئے بہت دیر ہو جاتی تو سب لوگ گھبرانا شروع کرتے۔ ہر شخص باری باری سے جا کر کھڑکی کے پالے سے دھندلائے شیشوں کو پھونک مار مار کے صاف کرتا اور باہر کی طرف جھانکتا۔ باقی لوگ پوچھتے:

''آرہا ہے؟،،

''ابھی تو نہیں۔ ،،

سب سے زیادہ نانی اماں پریشان ہوتیں۔

''ہائے ہائے میں مرجاؤں،، وہ اپنے شوہر اور بیٹوں سے کہتیں۔ ''ارے تم لوگ ایک اچھے انسان اور ایک اچھے گھوڑے کی جان لے کر ہی رہوگے! ارے تمہارا ضمیر مر گیا ہے۔ بےشرمو! لالچی خاندان، احمق قبیلہ! خدا تم سے سمجھے!،،

میرے نانا ابروؤں پر بل ڈال کر بڑبڑاتے:

''اچھا بھئی اچھا۔ اب کے بعد پھر کبھی...،،

بعض اوقات تسیگانوک دوپہر ڈھلے لوٹتا۔ میرے نانا اور ماموں اس کو لینے صحن تک دوڑتے، پیچھے پیچھے نانی اماں ہوتیں — ریچھ کی طرح بھدا بھد کرتی، نسوار سونگھتی۔ نہ جانے کیوں ایسے موقع پر وہ ہمیشہ گڑبڑا جاتی تھیں۔ بچے بھی دوڑتے ہوئے آجاتے اور پھر سامان اتروانے کا دلچسپ کام شروع ہوتا۔ گاڑی بھری ہوئی ہوتی تھی — تازہ مارا ہوا شکار کا گوشت، پورے پورے سور، مچھلی اور باقی ہر قسم کے گوشت کے مختلف ٹکڑے۔

نانا ابا اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے گاڑی میں بھری ہوئی ہر چیز کو دیکھتے جاتے:

''کیوں، جو کچھ کہا تھا وہ سب لے آئے نا؟،،

ایوان خوشی خوشی گاڑی سے نیچے کودتا اور دستانوں میں چھپے ہوئے ہاتھوں کو اور گرم کرنے کے لئے زور زور سے ملتے ہوئے کہتا:

''جی ھاں، جی ھاں - ھر چیز جیسے آپ نے کہی تھی ویسے ھی - ''

''انھہ مت رگڑو دستانوں کو ان میں پیسے لگتے ھیں مفت نہیں آتے'' نانا ابا سختی سے چیختے - ''کچھہ پیسے بچے؟''

''نہیں - ''

نانا آھستہ آھستہ گاڑی کے چاروں طرف گھومتے جاتے اور بڑبڑاتے جاتے:

''لگتا ھے پھر وھی بے تحاشا بھر لائے ھو سب چیز - مگر یہ خیال رکھا کرو کہ پیسہ دئے بغیر کچھہ نہ لینا کبھی - میرے گھر میں یہ نہیں چلے گا - سمجھے؟''

اور وہ منہ بنائے ھوئے وھاں سے کھسک جاتے -

پھر میرے ماموؤں کی بن آتی - خوشی کے مارے وہ گاڑی پر ٹوٹ پڑتے اور مرغیوں، مچھلیوں، ران کے گوشت اور دوسرے گوشت کے ٹکڑوں کے وزن اور قیمت کا اندازہ کرتے -

''بھئی چیزیں تو خوب چھانٹ کے خریدی ھیں'' وہ کہتے اور داد دینے کے انداز میں کبھی چیختے، کبھی سیٹی بجانے لگتے -

خاص طور پر میخائل ماموں تو بس وجد میں آجاتے اور اس طرح گاڑی کے چاروں طرف اچھلنے لگتے جیسے ان کے پیروں میں اسپرنگ لگا ھو - ھدھد کی طرح وہ اپنی ناک بڑھا بڑھا کر ھر چیز کو سونگھتے، اپنے ھونٹ چاٹتے جاتے اور ان کی بیقرار آنکھیں باربار سکڑ جاتیں - وہ میرے نانا کی طرح سوکھے سہمے تھے اور خانہ‌بدوشوں کی سی سانولی رنگت پائی تھی - اپنی آستینوں میں اپنے ٹھٹھرے ھوئے ھاتھہ گھسا کے پوچھتے:

''کہو — بڑے میاں نے کتنے روپئے دئے تھے؟''

''پانچ روبل - ''

''لیکن یہ سامان تو کم از کم پندرہ روبل کا ھوگا - تو ھاں خرچ کتنے ھوئے؟''

''چار روبل دس کوپک - ''

''ھوں تو یوں کہو کہ نوے کوپک تم نے اپنی جیب میں رکھے - کیوں؟ سنو یاکوف، ایسے پیدا ھوتا ھے پیسہ؟''

4*

یاکوف ماموں خالی قمیص پہنے سردی میں ٹھٹھرتے، کہر بھرے نیلے آسمان کی طرف دیکھ کر آنکھیں جھپکاتے ہوئے چپکے چپکے ہنسنے لگتے اور سانس کھینچ کر کہتے:

''تو پھر پلاتے ہو ہم لوگوں کو ایک پوا۔ کیوں وانیا۔''

نانی اماں گھوڑے کا ساز کھولتیں۔

''کیوں میری جان! کیا ہوا؟ کیا ہوا ہے تجھے؟ کیا بات ہے؟ میری بلی! کھیلے گا؟ اچھا کھیل، کھیل لے ہاں۔ تھوڑا سا کھیلنے میں کیا هرج ہے! تھوڑی تفریح میں خدا کا کوئی گناہ تھوڑا ہی ہے...''

لمبا چوڑا گھوڑا اپنی ایال کو زور سے جھٹکتا، بڑے بڑے دانتوں سے نانی اماں کے کندھے کھجلانے لگتا، ان کے سر پر رکھا ہوا ریشمی رومال گھسیٹ لیتا، مسرت بھری نظروں سے ان کے چہرے کو دیکھتا اور اپنی پلکوں پر سے جمی ہوئی برف گراتے ہوئے آہستہ ہنہناتا جاتا۔

''ارے تو تو روٹی کھائے گا؟ روٹی چاہئے؟'' نانی اماں کہتیں اور ایک خوب سنکی ہوئی خوب نمکین روٹی کا بڑا سا ٹکڑا اس کے منہ میں ٹھونستیں۔ وہ کھاتا جاتا اور نانی اس کے منہ کے نیچے اپنا اپرن پھیلائے کھڑی رہتیں اور اسے کھاتے دیکھتیں۔

تسیگانوک خود بچھیرے کی طرح اچھلتا ہوا کہتا:

''نانی اماں یہ بڑا ہی حسین گھوڑا ہے! اتنا تیز ہے کہ بس ہی بس۔''

''نکل یہاں سے'' نانی اماں چیختیں۔ ''یہاں دم مت ہلاتا پھر! ایسے وقت مجھے تجھ سے نفرت ہوجاتی ہے۔ نکل!''

بعد کو نانی اماں نے مجھے بتایا کہ تسیگانوک جب بھی بازار جاتا تو سامان خریدتا کم تھا، چرا زیادہ لاتا تھا۔

''اب دیکھو، نانا ابا اس کو پانچ کا نوٹ دیتے ہیں'' وہ منہ بناکے کہتیں۔ ''تو یہ تین روبل خرچ کرتا ہے اور دس روبل کا سامان لے آتا ہے دوکانداروں کی نظریں بچاکے۔ اسے چوری کرنے میں مزہ آتا ہے۔ بے ایمان کہیں کا! بس ایک دفعہ ایسی چال چلی ہوگی۔ وہ کامیاب ہوگئی۔ یہاں گھر میں بھی سب لوگ خوب ہنسے اور

خوب تعریف کی - تو بس اب عادت ڈال لی کمبخت نے! اصل میں تمہارے نانا نے چھٹپن میں اتنی غریبی بھگتی ہے کہ اب وہ روپئے کو دانتوں سے پکڑتے ہیں - انہیں اپنے بچوں سے زیادہ روپئے کا خیال رهتا ہے - کوئی چیز مفت مل جائے تو بس خوش ہیں - اور میخائل اور یاکوف کا جہاں تک سوال ہے، وہ تو ...،، انہوں نے بس ایک هاتھه کا اشارہ کرکے ان کا ذکر ختم کردینا کافی سمجھا -

''بس نہ پوچھو بیٹا الیوشا کہ کیا الجھاؤ ہے، جیسے کوئی خوبصورت بیل بنتے بنتے دھاگا الجھه گیا ہو،، وہ اپنی نسوار کی ڈبیہ میں جھانکتی ہوئی کہتیں - ''جیسے کسی اندھی پھوس بڑھیا نے سارا نمونہ غلط ڈال دیا ہو - اب اگر تمہاری سمجھه میں اس کا سر پیر نہیں آتا تو کیا تعجب کی بات ہے! لیکن ایک مرتبہ بھی اگر لوگوں نے وانیا کو چوری کرتے پکڑلیا تو مارتے مارتے اس کو مار ہی ڈالیں گے - ،،

وہ ذرا دیر کو خاموش ہوگئیں اور پھر جو انہوں نے بات کرنی شروع کی تو ان کی آواز بہت مدھم ہوگئی:

''ہائے افسوس! ہم لوگوں نے قاعدے تو بہت سے بنا رکھے ہیں لیکن ان قاعدوں میں سچائی کہاں ہے جو وہ چلیں!،،

دوسرے دن میں نے تسیگانوک کی خوشامد کی کہ چوری کرنا چھوڑ دے:

''وہ لوگ تمہیں جان سے مار ڈالیں گے - ،،

''پکڑ چکے مجھکو - میں صاف نکل جاؤں گا - میں بہت چالاک ہوں اور میرا گھوڑا اتنا تیز دوڑتا ہے کہ بس ہی بس،، اس نے ہنس کے کہا لیکن فوراً ہی اس کی ابرو پر بل آ گیا جس سے اس کی ہنسی کو گہن لگ گیا - ''انہه - کیا میں نہیں جانتا کہ چوری کرنا برا ہے اور خطرناک بھی - مگر مجھے اس میں بہت مزہ آتا ہے اور میں کوئی اپنے پاس پیسہ نہیں جوڑ رکھتا - ایک ہی ہفتے کے اندر یہ تمہارے ماموں سب نکلوا لیتے ہیں مجھه سے - پر مجھے پروا نہیں، لیتے ہیں تو لے لیں - مجھے پیٹ بھر کھانے کو مل جاتا ہے، چلو بہت ہے - ،،

پھر اس نے ایک دم مجھے گود میں اٹھالیا اور پیار سے جھنجھوڑا۔

''یار تم ہو تو دبلے پتلے اور ہلکے مگر تمہاری ہڈیاں خوب مضبوط ہیں۔ زوردار نکلوگے بڑے ہوکر۔ سنو! تم چھتارا بجانا سیکھو۔ اپنے یاکوف ماموں سے کہو سکھا دیں گے۔ سچ، مذاق نہیں! بس مشکل یہی ہے کہ تم ابھی چھوٹے بہت ہو۔ ویسے ننھے ہوتے ہوئے بھی تمہارا تیہا کافی تیز ہے۔ تمہیں اپنے نانا اچھے لگتے ہیں نا؟''

''معلوم نہیں۔''

''مجھے اس کاشیرین خاندان میں سب ناپسند ہیں سوائے نانی اماں کے۔ شیطان کی مار ان پر!''

''اور میں؟''

''تم کاشیرین کب ہو۔ تمہارا تعلق تو پیشکوف خاندان سے ہے نا۔ ان کا تو خون ہی الگ ہے۔ وہ قبیلہ ہی اور ہے۔''

یکایک اس نے مجھے بھینچ کر اپنے سینے پر دبا لیا اور آہ بھر کر کہنے لگا:

''اے خدا کاش میں گا سکتا! لوگوں کے دل ہلا دیتا! اچھا بھیا، جا اب۔ چلیں کام کریں...''

اس نے مجھے فرش پر اتار دیا، ایک مٹھی بھر کے ننھی ننھی کیلیں اپنے منہ میں بھریں اور ایک بڑے سے چوکھٹے تختے پر ایک سیاہ کپڑا جڑنے لگا۔

اس کے فوراً ہی بعد تسیگانوک کی موت واقع ہوئی۔

ہوا ایسے کہ ہمارے باہری پھاٹک کے پاس احاطے کی دیوار سے ٹکی ہوئی ایک بہت بڑی اور بھاری صلیب رکھی ہوئی تھی۔ یہ صلیب شاہ‌بلوط کی لکڑی کی بنی ہوئی تھی اور اس کا پایہ بہت بھاری سا اور نکلا ہوا تھا۔ وہ بہت دنوں سے اس جگہ پر رکھی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ پہلے دن جب میں یہاں رہنے کے لئے آیا تھا تو اس وقت بھی وہ وہیں رکھی ہوئی تھی۔ لیکن اس وقت وہ نئی تھی اس لئے اس کا رنگ زرد تھا۔ اب خزاں کی بارش میں بھیگنے کی وجہ سے اس کا رنگ سیاہ پڑگیا تھا اور اس میں سے بھیگے ہوئے شاہ‌بلوط کی خوشبو

اڑا کرتی تھی - ہمارے احاطے میں یوں ہی بہت سی چیزیں بکھری رہتی تھیں اور اس پر سے اس صلیب کی موجود گی بری طرح سے اڑچن رہتی تھی۔

یہ صلیب یاکوف ماموں نے اپنی بیوی کی قبر پر لگوانے کے لئے خریدی تھی اور قسم کھائی تھی کہ اس کی پہلی برسی پر وہ اسے اپنے کندھوں پر اٹھا کر قبرستان لے جائیں گے۔

برسی جس دن پڑی اس دن سنیچر تھا۔ جاڑوں کی شروعات تھی، سردی خوب تھی اور مکانوں کی چھتوں پر سے تیز ہوا برف کو اڑا اڑا کر گرارھی تھی۔ میری نانی، نانا ابا اور دوسرے تین بچے پہلے ہی سے گاڑی میں بیٹھ کر برسی کی رسم ادا کرنے کے لئے قبرستان کے گرجے روانہ ہوچکے تھے۔ باقی سب لوگ احاطے میں نکل آئے تھے۔ مجھ سے اس درمیان کوئی خطا ہوگئی تھی، اس لئے مجھ کو بطور سزا گھر پر ہی چھوڑ دیا گیا تھا۔

پہلے میرے دونوں ماموؤں نے جو ایک ہی سے سیاہ کوٹ پہنے ہوئے تھے صلیب کو سر کی جانب سے پکڑ کر اٹھایا اور اس کا ایک بازو میخائل ماموں اور دوسرا بازو یاکوف ماموں کے کندھے پر رکھ دیا گیا۔ ایک آدمی اور تھا، اس نے اور مستری جی نے مل کر بڑی مشکل سے صلیب کا پایہ اٹھایا اور اسے تسیگانوک کے بھاری کندھوں پر رکھا۔ وہ بوجھ سے لہرا گیا اور اپنے پاؤں پھیلا کر اپنے کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

''کیوں، سنبھال لوگے؟،، مستری گریگوری نے پوچھا۔

''معلوم نہیں بھاری بہت ہے۔،،

''پھاٹک کھول، اندھے شیطان!،، میخائل ماموں چیخے۔

''ڈوب مرو وانیا،، یاکوف ماموں نے کہا۔ ''ہم دونوں تم سے تو دبلے ہی ہیں۔،،

لیکن مستری گریگوری نے پھاٹک کھول کر ذرا سختی سے وانیا کو رائے دی:

''دیکھو، زیادہ زور نہ لگانا۔ خدا تمہارا نگہبان ہو۔،،

میخائل ماموں باہر گلی میں قدم رکھتے ہوئے بولے:

''احمق بڈھا، گدھا کہیں کا!،،

احاطے میں کھڑے ہوئے سب لوگ مسکرانے لگے اور آپس میں زور زور سے باتیں کرنے لگے جیسے اس بات پر خوش ہو رہے ہوں کہ چلو اچھا ھوا صابب کی اڑچن گئی۔ احاطہ صاف ہو گیا۔

مستری جی نے میرا ھاتھہ پکڑا اور کارخانے میں لے گئے۔

''شاید آج تمہارے نانا پٹائی نہ کریں، آج تو ان کا موڈ ذرا اچھا لگتا ھے۔ ''

پاس ھی اون کا ایک بڑا سا گٹھر رنگنے کے لئے پڑا ھوا تھا۔ انہوں نے مجھے گود میں اٹھا کر اس پر بٹھا دیا۔ پھر میرے ادھر ادھر اون لپیٹ کے ناندوں میں سے نکلتی ہوئی بھاپ کو سونگھتے ہوئے بڑی توجہ سے باتیں کرنے لگے:

''میں تمہارے نانا کو سینتیس سال سے جانتا ھوں بیٹے!'' وہ بولے۔ ''میں نے اس کاروبار کا آغاز بھی دیکھا تھا اور اب انجام بھی دیکھہ رہا ھوں۔ ھم دونوں میں بڑی دوستی تھی، ساتھہ ھی سوچ بچار کر یہ کاروبار شروع کیا تھا۔ تمہارے نانا بڑے تیز آدمی ھیں۔ اب دیکھو وہ اس کاروبار کے مالک بن بیٹھے اور میں نہیں بن سکا۔ لیکن خدا ھم دونوں سے زیادہ تیز نکلا۔ اس کی بس ایک مسکراہٹ ھی کافی ھوتی ھے اور بڑے بڑے کائیاں احمقوں کی طرح آنکھیں جھپکاتے رہ جاتے ھیں۔ تم ابھی کیا جانو دنیا میں کیا ھوتا ھے اور کیوں ھوتا ھے، مگر بہتر یہی ھے کہ تم سب باتوں سے آگاہ ھوجاؤ۔ یتیم کی زندگی کوئی آسان نہیں ھے۔ تمہارے ابا میکسم سواتیئوچ تو ھزاروں میں ایک تھے۔ وہ سب سمجھتے تھے! اسی لئے تو تمہارے نانا کی ان سے نبھتی نہیں تھی۔ اور ان سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہتے تھے...''

اس جگہ بیٹھہ کر مستری جی کی محبت‌بھری باتیں سننے میں بڑا مزہ آرھا تھا۔ چولھے میں سرخ اور سنہری آگ بھڑک رھی تھی، ناندوں کی بھاپ سے دودھیا بادل اٹھہ رہے تھے جو ترچھے جھکے ہوئے چھپر پر بیٹھتے جاتے تھے اور جم جم کے برف بنتے جاتے تھے۔ چھپر کے ایک چھید سے مجھے نیلے آسمان کی ایک چٹ نظر آرھی تھی۔ ھوا کا بہاؤ رک گیا تھا، سورج چمک رھا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ احاطے میں پسا ھوا شیشہ بکھرا پڑا ھے۔ باھر گلی سے جمی ہوئی برف پر

دوڑتی ہوئی گاڑیوں سے کر کراہٹ کی آواز آرہی تھی، گھروں کی چمنیوں سے بل کھاتا ہوا نیلا دھواں نکل رہا تھا اور برف پر پڑتی ہوئی اس دھویں کی پرچھائیں بھی اس طرح آگے پیچھے نکلتی جاتی تھی جیسے وہ بھی اپنی داستان کے حصے دھرا رہی ہوں۔

مستری گریگوری کا وجود اپنے دراز ہڈیالے جسم، لمبی داڑھی اور بڑے بڑے کانوں کی وجہ سے کسی مہربان جادو گر کا سا لگتا تھا۔ انہوں نے ٹوپی اتار دی تھی اور مجھے نصیحتیں کرتے ہوئے پکتے ابلتے رنگ کے پاس کھڑے، اس کو بانس سے چلائے جارہے تھے:

''ہمیشہ لوگوں سے آنکھہ ملاکے بات کرو۔ اگر کوئی کمینہ کتا بھی تمہارے پیچھے لگا ہو تو ایسا کرنے سے وہ بھی رک جائے گا...،،

ان کی بوجھل عینک کھسک کر ان کے ناک کے بانسے پر آگئی تھی جس سے ناک کی نوک نیلی پڑ گئی تھی، نانی اماں کی ناک کی طرح۔

یکایک وہ رک گئے ''یہ کیا معاملہ ھے؟،، انہوں نے ایک پل غور سے سنا، لات مار کر چولھے کا ڈھکنا بند کیا اور احاطے سے ہو کر بھاگے۔ میں ان کے پیچھے پیچھے بھاگا۔

تسیگانوک باورچی خانے کے فرش پر چت پڑا تھا۔ کھڑکیوں سے روشنی کی دو دھارائیں اندر گر رہی تھیں، ایک اس کے سر اور سینے پر اور دوسری پاؤں پر۔ اس کی پیشانی ایک عجیب طرح کے نور سے سنور تھی۔ بھویں اٹھی ہوئی، دنبالہ‌دار آنکھیں ٹنگی ہوئی دھویں سے سیاہ چھت کی طرف تک رہی تھیں۔ سنولائے ہوئے ہونٹ کپکپا رہے تھے اور ان میں سے گلابی جھاگ نکل رہا تھا۔ دھانے کے دونوں کونوں سے خون کی پتلی پتلی دھاریں گر کر گردن سے ہوتی ہوئی فرش پر بہہ رہی تھیں، اس کے نیچے بھی تمام خون ھی خون تھا۔ ٹانگیں بے جان ہو چکی تھیں اور جس طرح اس کے پتلون کی چوڑی مہریاں زمین کے ساتھہ چپکی ہوئی تھیں اس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ خون سے بھیگ چکی ھیں۔ فرش کو ریت سے ایسا صاف کیا گیا تھا کہ وہ چمکنے لگا تھا اور اس پر خون کے چھوٹے چھوٹے چشمے سے بہہ رہے تھے۔ جہاں جہاں پر سورج کی روشنی پڑتی تھی وہاں وہ خوب دمک رہے تھے۔

تسیگانوک بالکل بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔ البتہ اس کے

پھیلے ہوئے ہاتھوں کی انگلیاں فرش کو آہستہ آہستہ کھرچ رہی تھیں اور ایسے میں جب بھی سورج کی روشنی ان پر پڑتی تو رنگے ہوئے ناخن جواہرات کی طرح چمکنے لگتے۔

ایوگینیا بوا ایوان کے پاس گھسی ہوئی اس کے ہاتھہ میں ایک موم بتی پکڑانے کی کوشش کر رہی تھیں لیکن وہ پکڑ نہیں پا رہا تھا۔ موم بتی گری اور اس کی لو خون میں پھک سے بجھہ گئی۔ بوا نے اس کو پھر اٹھایا، پونچھا اور پھر اس کی تڑپتی ہوئی انگلیوں میں پکڑانے کی کوشش کرنے لگیں۔

باورچی خانے کی فضا دبی دبی گھبراہٹ اور پریشانی سے سنسنا رہی تھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے ہوا کا ایک زبردست تھپیڑا ہے جو مجھے چو کھٹ سے اڑا لے جائیگا لیکن میں ٹیک کو پکڑ کر زور سے چمٹ گیا۔

''ٹھوکر کھا گیا بھئی،، یاکوف ماموں سر ہلا ہلا کر کھوکھلی آواز میں کہہ رہے تھے۔ اپنی بے رنگ آنکھوں کو باربار جھپکاتے ہوئے وہ ایسے لگ رہے تھے جیسے ان کا سارا وجود سکڑ کر غائب ہو گیا ہو۔ ''بس گر پڑا اور صلیب کے نیچے کچل گیا۔ وہ اس کی پیٹھہ پر گرپڑی۔ اگر ہم لوگ فوراً چھوڑ نہ دیتے تو ہم لوگوں کو بھی کچل ڈالتی۔،،

''تو یہ آپ لوگوں کی حرکت ہے!،، مستری جی بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔

''آپ سمجھتے ہیں کہ ہم...،،

''تم ارے تم...،،

خون برابر بہتا رہا۔ دروازے کے پاس ایک اچھا خاصہ تالاب سا بن گیا تھا، اور خون کی سطح ابھرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ تسیگانوک پڑا ہوا تھا اور اس کے منہ سے کچھہ ایسی آوازیں نکل رہی تھیں جیسے وہ خواب میں برا رہا ہو۔ گلابی جھاگ منہ سے برابر اٹھہ رہا تھا، اس کا جسم گھلتا جا رہا تھا، اس طرح چپٹا ہوکر زمین سے ملتا جارہا تھا جیسے اسی میں سماجائے گا۔

''میخائل تو گھوڑا لے کر گرجے گیا ہے — ابا کو بلانے — اور میں اسے گھوڑا گاڑی میں ڈال کے یہاں لے آیا۔ اچھا ہوا جو

میں نے پائے کی طرف سے نہیں اٹھایا ورنہ اب دیکھو اس وقت میرا کیا حشر ہوتا...،،

بوا پھر اس کے ہاتھ میں شمع تھمانے لگیں۔ شمع پگھل کر ان کے آنسوؤں کے ساتھ تسیگانوک کی ہتیلی میں گر رہی تھی۔

مستری گریگوری نے ڈانٹا:

''ارے اس کے سرہانے کیوں نہیں جما دیتی ہو، پھوہڑ!،،

''ہاں ٹھیک کہتے ہو۔،،

''ٹوپی تو اتار دو اس کی!،،

بوا نے ٹوپی اتاری اور ایوان کا سر بھد سے زمین پر لگا۔ اب اس کا منہ دوسری طرف تھا۔ اس لئے خون زیادہ تیزی سے لیکن ایک ہی طرف سے بہہ رہا تھا۔ بڑی دیر تک یہی ہوتا رہا۔ پہلے تو مجھے یہ امید تھی کہ تسیگانوک تھوڑی دیر آرام کرکے ایک دم اٹھ بیٹھے گا، منہ بنا کر تھوکے گا اور اپنے خاص انداز میں کہے گا:

''تھو، کیا گرمی ہے...،،

اتوار کے دن جب وہ دوپہر کو ذرا دیر سوتا تھا تو اٹھ کر یہی کہتا تھا۔ لیکن اٹھنے کے بجائے وہ وہیں پڑا رہا اور گھلتا گیا، گھلتا گیا۔ سورج آگے بڑھ گیا، روشنی کی دھارائیں چھوٹی ہو کر اب صرف کھڑکی کی چوکھٹ پر پڑنے لگیں۔ تسیگانوک کے ہاتھوں اور اس کے چہرے پر سیاہی بڑھتی گئی اور منہ سے نکلنے والے جھاگ کے بلبلے بیٹھتے گئے۔ اس کے سر کے آس پاس تین شمعیں روشن کردی گئی تھیں جن کی سنہری لوؤں کی چھوٹ اس کے سرمئی سیاہ بالوں کے ڈھیر، اوپر کو اٹھی ہوئی ناک کی نوک اور خون آلود دانتوں پر پڑ رہی تھی۔ تڑپتی ہوئی روشنی کا کچھ حصہ سانولے رخساروں پر بھی نظر آ رہا تھا۔

بوا اس کے پاس بیٹھی بین کررہی تھیں:

''ہائے میرا غریب کبوتر! ہائے تجھ سے تو گھر کی رونق تھی...،،

سردی بڑھ گئی تھی اور بڑا ڈر لگ رہا تھا۔ میں کھسک کر میز کے نیچے بیٹھ گیا۔ پھر نانا ابا لڑکھڑاتے ہوئے ریچھ کی کھال کا کوٹ پہنے باورچی خانے میں داخل ہوئے، پیچھے پیچھے نانی

اماں تھیں بڑا کوٹ پہنے جس کے کالر میں کسی جانور کی دم کا سمور لگا ہوا تھا۔ ان کے پیچھے میخائل ماموں تھے، پھر بچے اور پھر کئی اجنبی لوگ تھے۔ میرے نانا نے اپنا کوٹ اتارکر زمین پر پھینک دیا:

''ارے یہ حرامزادے! ارے ایسے آدمی کو مار ڈالا۔ پانچ سال بعد وہ سونے میں تلتا۔ سونے میں۔''

زمین پر پڑے ہوئے کپڑوں کے ڈھیر کی وجہ سے ایوان کی لاش میری نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ میں رینگا اور ذرا بہتر جگہ کھسکنے کی کوشش میں اپنے نانا کے پیروں میں آ گیا۔ انہوں نے مجھے زور سے لات ماری اور اپنی چھوٹی سرخ مٹھیاں میرے ماموؤں پر تانتے ہوئے گرجے:

''ارے بھیڑیو - بس تم بھیڑیے ہو - درندے!''

وہ ایک بنچ پر بیٹھ گئےاور اس کو زور سے پکڑ کر اپنی باریک آواز میں جلی کٹی سنانے لگے:

''ارے میں تو پہلے ہی جانتا تھا کہ تم لوگ اسے دیکھ نہیں سکتے... آہ وانیا! میرے بھولے بچے! اب کیا ہوگا؟ اب کیا ہوگا، اب کیا کریں گے ہم؟ گھوڑا غیرکا اور لگام سڑی ہوئی ہو تو کوئی کیا کرے! ارے وروارا کی ماں! اب کیا کہتی ہو۔ یہ تو نے کہاں کا بدلہ لیا ہے میرے خدا... پچھلے کئی سال سے یہی ہو رہا ہے— مصیبت پر مصیبت...''

میری نانی اماں ایوان کے پہلو میں فرش پر گر پڑیں۔ وہ باربار اس کے چہرے، سر، سینہ اور ہاتھوں کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھ رہی تھیں، کبھی اس کی آنکھوں میں پھونکیں مارتیں اور کبھی اس کے ہاتھ لے لے کر سہلاتیں۔ ساری شمعیں بھی انہوں نے الٹ پلٹ کر گرا دی تھیں۔ آخرکار وہ مشکل سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اس وقت وہ ایک بڑا سا سیاہ بت معلوم ہو رہی تھیں — آنکھیں بھیانک طریقے سے گول گول گھومتی ہوئی، سیاہ لباس چمک رہا تھا۔ انہوں نے مدھم آواز میں حکم دیا:

''نکل جاؤ یہاں سے، کمبختو! ملعونو۔''

نانا ابا کے سوا سب ایک ایک کر کے باہر چلے گئے...
بغیر کسی دھوم دھام کے، چپ چاپ تسیگانوک کو دفنا دیا گیا۔

۴

میں ایک چوڑے چکلے بستر پر لیٹا تھا، چاروں طرف سے لحاف لپیٹے اور نانی اماں کو دعا مانگتے غور سے سن رہا تھا۔ وہ دوزانو جھکی ہوئی تھیں، ایک ہاتھ سینے پر تھا اور دوسرے سے آہستہ آہستہ اپنے سینے پر صلیب کا نشان بناتی جاتی تھیں۔

کھڑکی سے باہر مجھے برف چٹخنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ شیشوں پر پالے سے پھول پتیاں بن گئی تھیں اور ان پھول پتیوں سے چھنتی ہوئی چاند کی سبزی مائل تابناک اجلی کرنیں ان کے شفیق چہرے، بڑی سی ناک اور سیاہ آنکھوں پر پڑ رہی تھی۔ ان کے سر پر بندھا ہوا ریشمی رومال اس طرح دمک رہا تھا جیسے وہ کسی دھات کا بنا ہوا تھا۔ اور ان کا چنٹ دیا ہوا سیاہ لباس لہریں کھاتا ہوا کندھوں سے ہو کر زمین پر چاروں طرف پھیل گیا تھا۔

جب وہ دعا ختم کر چکیں تو خاموشی سے کپڑے تبدیل کئے اور کونے میں رکھے ہوئے بکس پر سلیقہ سے تہہ کر کے رکھنے کے بعد میرے پاس آئیں۔ میں ایسا بن گیا جیسے گہری نیند سو رہا ہوں۔ وہ دھیرے سے بولیں:

''بے ایمان کہیں کا، بہانہ کرتا ہے؟ بھلا تو سو رہا ہے؟ اٹھ۔ ہاں اب دیکھ کہاں گئی نیند، کبوتر کا بچہ! چل، مجھے بھی دے تھوڑا سا لحاف!،،

مجھ کو تو معلوم ہی تھا کہ اب اس کے بعد کیا ہوگا، میں اپنی مسکراہٹ روک نہ سکا۔ تب وہ خفا ہونے لگیں۔

''اچھا تو اب اپنی بڑھیا نانی کا مذاق اڑائے گا۔ کیوں؟،،

انہوں نے لحاف کا ایک کونہ پکڑا اور اس زور سے اور ایسی ترکیب سے جھٹکا کہ میں آتش بازی کی طرح ہوا میں اڑ گیا اور گول گول چکر کاٹتا ہوا پھر اس پروں کے بستر پر دھم سے آ گرا۔ اور وہ زور زور سے قہقہہ لگانے لگیں:

''ارے شیطان! کیوں مزا آیا؟،،

کبھی کبھی وہ اتنی دیر تک دعائیں مانگتی رھتیں کہ میں اونگھتے اونگھتے سو جاتا اور مجھے پتہ بھی نہ چلتا کہ وہ کب بستر میں آئیں - جب کبھی گھر میں لڑائی جھگڑا ھوتا یا کوئی پریشانی آتی تو وہ رات کو ھمیشہ ایسی لمبی دعائیں اور نمازیں پڑھا کرتیں - نانی اماں جس طرح سے پروردگار کو ھر بات کی تفصیل بتایا کرتیں کہ کیا ھوا، کیا نہیں ھوا، اس کو سننے میں بے حد مزہ آتا تھا - پہاڑ کی پہاڑ ایسی دوزانو ھوجاتیں اور اپنی دعا شروع کردیتیں - شروع میں تو ان کا لہجہ تیز ھوتا اور کچھہ سمجھہ میں نہ آتا لیکن رفتہ رفتہ ان کی آواز مدھم پڑتی جاتی اور منہ ھی منہ میں کہتی جاتیں:

''اے پروردگار تو تو جانتا ھے کہ آخر اپنے اپنے فائدے کی ھر ایک کو ھی پڑی رھتی ھے - اب میخائل بڑا ٹھہرا - ایسا تو ھونا ھی چاھئے کہ وہ یہاں شہر میں رھے - یہ تو بڑا گناہ ھوگا کہ اس کو دریا پار بھیج دیا جائے جہاں اب تک کسی نے قسمت‌آزمائی نہیں کی ھے - نہ جانے کیسی پڑے، کیسی نہ پڑے - لیکن بڑے میاں جو ھیں وہ یاکوف کی طرف داری کرتے ھیں - بھلا کسی بھی باپ کے لئے یہ مناسب ھے؟ پروردگار، تیری بڑی عنایت ھو جو انہیں ایک ذرہ برابر تو عقل دے دے - ،،

نگاہ اٹھاکے وہ مقدس شبیہوں کی طرف دیکھتیں اور اپنے خدا کو مشورہ دیتیں - اس وقت ان کی آنکھوں کی چمک اور بڑھہ جاتی -

''اے مالک! کبھی ان کے خواب میں آ کر ان کو ھدائت دے دے کہ اپنے بیٹوں میں بٹائی کیسے کریں - ،،

پھر وہ سینے پر صلیب کا نشان بناتیں اور اتنا جھکتیں کہ ان کی چوڑی پیشانی فرش سے چھونے لگتی، پھر سیدھی ھوتیں اور اس طرح خدا سے مخاطب ھوتیں جیسے اسے سمجھا رھی ھوں:

''اور ایک قطرہ خوشی کا وروارا کو کیوں نہ بخش دیا جائے معبود؟ آخر اس نے کیا گناہ کیا ھے جو تو اس سے پھر گیا ھے مالک؟ دوسروں کے مقابلے میں وھی کیوں اتنی دکھی رھے - ایسی مضبوط ایسی جوان عورت اور اتنی دکھیا - پھر مستری جی بھی تو ھیں مالک - ذرا ان کی آنکھوں کا خیال رکھنا - دن بہ دن زیادہ خراب ھوتی جا

رهی ھیں - اور ایک بار اگر وہ بالکل اند ھے ھو گئے تو پھر ان کے لئے بھیک مانگنے کے سوا کیا چارہ ھے! اور کیا یہ انصاف ھوگا؟ آخر ان بیچارے نے نانا کے کاروبار میں اپنا سارا جیون کھپایا ھے... لیکن یہ بڑے میاں کبھی ان کے تھکے وقت میں کام نہیں آئیں گے!.. آہ مالک! میرے اچھے معبود - رحیم... کریم...،،

پھر بڑی دیر تک وہ دوزانو ھو کر خاموش رھتیں، سر جھکا رھتا، دونوں بازو جھولتے رھتے - ایسا لگتا جیسے سو گئی ھیں - آخر میں وہ اپنی بھوؤں پر بل ڈال کر سوچتے ھوئے کہتیں:

''ھاں اور کیا کہنا تھا؟.. سب دینداروں پر رحم کرنا معبود! اور مجھ بدنصیب کو بھی بخش دینا - تجھے تو معلوم ھے میں گنہ گار ھوں - مجھ سے جو کچھ گناہ ھوتے ھیں معبود وہ اس لئے کہ میرے دماغ میں عقل نہیں - لیکن میرا دل بے ایمان نہیں ھے پروردگار...،،

پھر وہ ایک گہرا ٹھنڈا سانس بھرتیں اور محبت بھرے اطمینان سے کہتیں:

''لیکن بھلا کوئی ایسی بھی بات ھے جو تو نہیں جانتا عالم الغیب، کوئی بات ایسی نہیں جو تو نہ سمجھتا ھو میرے مقدس باپ -،،

مجھے اپنی نانی اماں کا خدا بہت اچھا لگتا تھا جیسے ان سے بالکل قریب اور ان کو بے حد محبوب ھو - اکثر میں کہتا:

''نانی اماں، خدا کے بارے میں مجھے بتائیے نا!،،

تو وہ ایک خاص انداز میں اس کے متعلق بیان کرتیں - پہلے بیٹھتیں، پھر آنکھیں بند کرتیں اور ایک عجیب طریقے سے الفاظ اور آواز کھینچ کر مدھم لہجے میں بیان کرنے لگتیں - مجھے آج بھی یاد ھے کہ کس طرح سے وہ اس گفتگو کے لئے تیار ھوتیں — بیٹھتیں، سر پر رومال باندھتیں اور پھر ان کا تخیل تانے بانے بننے لگتا یہاں تک کہ میں سو جاتا -

''پروردگار دور رھتا ھے، پہاڑوں کی بلندیوں پر، جنت کی وادیوں میں گھرا ھوا، الماس کے تخت پر، اور اس کے سر پر نقرئی پھولوں کا چتر ھے، ایسے پھول جو سال بھر تک کھلے رھتے ھیں، جن کو پالا مار نہیں سکتا - یہی پھول جنت کے باسی ولیوں کے دل میں بھی مسرت کے پھول کھلاتے رھتے ھیں - اور معبود کے چاروں طرف فرشتوں کے دل

کے دل اڑتے رہتے ہیں جیسے شہد کی مکھیوں کے دل یا خوب گھنی گھری برف، یا جیسے فاختاؤں کے جھنڈ کے جھنڈ آسمان سے زمین تک آتے ہوں اور پھر لوٹ جاتے ہوں — اپنے پروردگار کو ہم زمین کے رہنے والوں کا حال سناتے ہوں۔ اور ہم میں سے ہر ایک کا الگ فرشتہ ہوتا ہے۔ میرا بھی ہے، تمہارا بھی، نانا ابا کا بھی — کیونکہ پروردگار کا برتاؤ اپنے ہر بندے کے ساتھہ ایک برابر کا ہے۔ جیسے تمہارا فرشتہ ہے، اب وہ یہاں آیا اور پھر اس نے معبود سے جا کر کہا کہ الیکسئی نے آج اپنی زبان نکال کر نانا کا منہ چڑایا تھا۔ بس معبود نے فوراً حکم دیا ''جاؤ اور ایسا کرو کہ بڑے میاں اس کو خوب پیٹیں،،۔ تو بس ہر ایک کے ساتھہ ایسا ہی حال ہے۔ انسان کو، ہر چیز کو اپنی کرنی کا پھل بھرنا پڑتا ہے — کسی کو غم ملتا ہے، کسی کو خوشی۔ اور پھر فرشتے بڑے مزے میں اپنے پر پھڑپھڑاتے ہیں اور گاتے جاتے ہیں ''تعریف اس خدا کی، تعریف اس رب‌عظیم کی!،، اور وہ بس مسکرا کر دیکھتا جاتا ہے ''ٹھیک ہے۔ بڑھے چلو میرے حسین فرشتو۔ اگر تمہیں یہ اچھا لگتا ہے تو اپنا کام کئے جاؤ!،،

پھر نانی اماں خود بھی مسکراتیں اور سر ہلاتیں۔

''نانی اماں، کیا تم نے یہ سب دیکھا ہے؟،،

''نہیں بیٹا،، وہ کھوئے ہوئے انداز میں کہتیں۔ ''خدا کو دیکھا نہیں تو عقل سے تو پہچانا ہے۔،،

جب وہ خدا اور فرشتوں اور جنت کے متعلق باتیں کرتیں تو ان کے وجود پر بچپن اور بھولاپن چھا جاتا، چہرے پر سے کارواں عمر کے نشانات مٹ جاتے اور نمناک آنکھوں میں ایک خاص طرح کا نور چکنے لگتا۔ میں ان کی لٹکتی ہوئی ریشمیں نرم چوٹی کو اپنی گردن میں لپیٹ لیتا اور بے حس و حرکت ان کے جادواثر قصے سنتا رہا جن سے میرا جی کبھی نہ بھرتا۔

''ہم فانی انسانوں کی بھلا کب مجال ہے کہ معبود کے جمال کو دیکھہ سکیں۔ ہماری آنکھیں اس کے نور سے اندھی ہو جائیں گی۔ صرف اولیا ہی اس کو آنکھہ کھول کر دیکھہ سکتے ہیں۔ لیکن فرشتوں کو میں نے دیکھا ہے۔ مگر وہ لوگ بھی بس صرف اس وقت دکھائی دے سکتے ہیں جب دل تمام برائیوں سے پاک ہو جائے۔

ایک دن میں گرجے میں کھڑی صبح کی نماز پڑھ رہی تھی اور منبر پر مجھے دو فرشتے نظر آئے - وہ بس کہر کی طرح تھے اور اس قدر نورانی که بس حد تھی نور کی — اتنے شفاف که آر پار دکھائی دیتا تھا - پر زمین پر گھسٹ رہے تھے، نازک نازک شفاف چمکتے ہوئے پھول جیسے پر - منبر کے پاس کھڑے ہوئے وہ پادری ایلیا صاحب کی مدد کر رہے تھے - جب وہ اپنے بوڑھے کمزور کپکپاتے ہوئے ہاتھه دعا کے لئے اٹھاتے تو فرشتے ان کی کہنیوں کو سہارا دیتے - پادری صاحب بہت بوڑھے تھے نا اور آخر وقت میں تو ان کی آنکھوں سے اتنا کم سوجھتا تھا که ہر چیز سے ٹکرا جاتے تھے - پادری صاحب جلدی چل بسے - میں تب فرشتوں کو دیکھه کر اتنا خوش ہوئی، اتنا خوش ہوئی که بے ہوش ہوتے ہوتے رہی - دردمندی کے مارے بس میرا دل جیسے پھٹا جا رہا تھا اور آنکھوں سے آنسو زار و قطار بہہ رہے تھے - آہ، کس قدر زبردست مسرت تھی وہ بھی - پروردگار نے آسمان کی بلندیوں پر جنت بھی کیا ہی خوب چیز بنائی ہے، الیوشا، میرے کبوتر - اور زمین کی پستیوں پر یہ دنیا بھی کیا ہی خوب بنائی ہے...،،

''کیا یہ بھی خوب بنایا ہے — ہمارا گھر ؟،،

''ہاں، خدا کا شکر ہے! ضرور، ہمارا گھر بھی اچھا ہے! تعریف ہو مقدس مریم کی،، میری نانی اپنے سینے پر صلیب کا نشان بناتے ہوئے کہتیں -

اس بات پر میں ذرا گڑبڑا جاتا - یقیناً یہ تو ماننا مشکل تھا که یہاں ہمارے گھر میں بھی ہر بات خوب تھی جبکه آپس کے لڑائی جھگڑے اور پریشانیاں روز بروز بڑھتی جاتی تھیں -

مجھے یاد ہے که ایک بار میں میخائل ماموں کے کمرے کے سامنے سے گذرا - دروازہ کھلا تھا اور میری نظر پڑ گئی تو میں نے دیکھا که نتالیا ممانی سر سے پاؤں تک سفید کپڑے پہنے، اپنے سینے پر دونوں ہاتھه دبائے کمرے میں چاروں طرح بے قرار پھر رہی ہیں اور نہایت اندوہناک آواز میں آہسته روتی ہوئی کہتی جا رہی ہیں :

''اے پروردگار! مجھے اپنی پناہ میں لے لے - مجھے کسی طرح یہاں سے چھٹکارا دے...،،

ان کی دعا میری سمجھ میں آ گئی تھی اور مستری گریگوری کی بات بھی میں سمجھ گیا تھا جب وہ منہ ھی منہ میں بڑبڑا رہے تھے:

''اچھا ھے جلدی سے اندھا ھو جاؤں اور سڑک پر بھیک مانگوں — اس سے تو بہتر ھی ھوگا...،،

میرا جی چاھا تھا کہ وہ جلدی سے اندھے ھو جائیں تا کہ میں ان کے آگے آگے ان کا ھاتھ پکڑ کے چل سکوں اور اس طرح ھم دونوں دنیا بھر میں اپنی روٹی مانگتے پھریں - ایک دفعہ میں نے یہ تجویز ان کے سامنے رکھی تو ان کی داڑھی ھنسی سے چھننے لگی:

''اچھی بات ھے - چلیں گے ھم دونوں اور میں گلی گلی پکارتا پھروں گا تا کہ سب سن لیں کہ ''یہ اس واسیلی کاشیرین کا نواسہ ھے جس کی سب سے بڑی رنگریزی کی دوکان ھے،، - بڑا مزہ آئے گا! اچھی بات ھے، اچھی بات ھے...،،

میں نے اکثر غور کیا تھا کہ نتالیا ممانی کے ھونٹ سوجے رھتے ھیں اور ان کے زرد چہرے پر نیلے اور سیاہ نشان پڑے رھتے ھیں -

''کیا ماموں ان کو مارتے ھیں؟،، میں نے نانی اماں سے پوچھا -

''ھاں، چھپ چھپ کر، کمبخت کہیں کا،، انہوں نے ٹھنڈی سانس بھر کر جواب دیا - ''تمہارے نانا نے مارنے کو منع کر رکھا ھے تو وہ رات کو مارتا ھے، کمینہ، اور اس عورت میں بالکل ھمت نہیں ھے - ،،

پھر وہ گرمجوشی سے اپنا قصہ جاری کر دیتیں:

''لیکن اب تو ویسی مار لوگ مارتے بھی نہیں ھیں جیسے مارا کرتے تھے - اب تو یہ ھے کہ کبھی کبھار دانتوں پر یا کان پر تھوڑی سی لگا دی یا چوٹی کھینچ لی اور بس - لیکن پہلے تو گھنٹوں دھنائی ھوتی تھی - ایک بار ایسٹر کے ھفتے کے پہلے دن تمہارے نانا نے صبح کی نماز کے وقت سے جو مجھے پیٹنا شروع کیا تو مغرب تک پیٹتے رھے - بیچ میں ذرا دیر کو آرام کر لیتے اور پھر پیٹنے لگتے - گھوڑے کی لگام سے یا اور بھی جو کچھ ھاتھ آجاتا اس سے - ،،

''مگر کیوں؟،،

''پتہ نہیں - اب تو یاد بھی نہیں - ایک دفعہ انہوں نے مجھے مارتے مارتے ادھ موا کر دیا تھا اور پھر پانچ دن تک کھانے

کوبھی نہیں دیا۔ بس یہ سمجھو کہ خدا خدا کرکے کسی طرح میں زندہ بچ نکلی۔ ایک بار تو...،،

یہ واقعات سن سن کر میری سٹی گم ہو جاتی۔ نانی اماں جسامت میں نانا سے دونی تھیں اور میری سمجھہ میں نہیں آتا تھا کہ نانا ان پر کیسے قابو پاتے تھے۔

،،کیا وہ تم سے اتنے مضبوط ہیں نانی اماں؟،،

،،نہیں مجھہ سے مضبوط تو نہیں ہیں لیکن عمر میں بڑے ہیں نا۔ پھر وہ میرے شوہر ٹھہرے۔ خدا نے انہیں میرا وارث بنایا ہے اور مجھہ کو یہ حکم دیا ہے کہ میں ان کی ہر بات برداشت کروں۔،،

جب نانی اماں مقدس شبیہوں کو جھاڑتیں پونچھتیں اور ان کے بیل بوٹے صاف کرتیں تو مجھے ان کو دیکھنے میں بہت مزہ آتا۔ ہمارے گھر کی یہ مقدس شبیہیں بڑی قیمتی اور نفیس تھیں۔ ان میں تمام چاندی کا جالدار کام بنا ہوا تھا اور جواہرات اور موتی وغیرہ جڑے ہوئے تھے۔ نانی اماں ان کو نہایت چاؤ سے دیکھتیں اور کہتیں:

،،کیسی پیاری صورت ہے!،،

وہ ان کو بوسہ دیتے ہوئے اور اپنے سینے پر صلیب کا نشان بناتے ہوئے کہتیں:

،،سب گرد سے بھر گئی ہے اور دھویں کی کالک سے۔ اے خدا کی مقدس ماں! تو بڑی قدرت والی ہے۔ تیری مہربانیاں سب پر یکساں ہیں، ناقابل بیان مسرت بخشنے والی! الیوشا، یہ دیکھہ بیٹا — کتنی اچھی تصویر ہے۔ کیوں میرے کبوتر و بوتر! ذرا دیکھنا نقش ونگار کتنے ننھے ننھے ہیں، نقش کی ہر لکیر الگ سے الگ دیکھہ لو!.. دیکھہ اس کا نام ہے ،،بارہ تعطیلات،، — بیچ میں فیدوروفسکی والی پاک مریم ہیں — کس قدر رحیم و کریم ہیں۔ اور یہ دیکھہ — تیسری تصویر کا نام ہے ،،میری ماں، میری قبر پر آنسو نہ بہانا...،،

بعض اوقات تو مجھے ایسا لگتا جیسے نانی اماں اس سنجیدگی اور انہماک سے ان شبیہوں سے کھیل رہی ہیں جس طرح میری ماموں زاد بودی بہن کاتیرینا اپنی گڑیوں سے کھیلا کرتی ہے۔

کبھی کبھی ان کو شیطان دکھائی دیتا تھا۔ کبھی تنہا اور کبھی شیطانوں کے جھنڈ کے جھنڈ۔

''ایک دفعہ روزوں کے زمانے میں میں روڈلف کے مکان کے سامنے سے گزر رہی تھی - چاندنی خوب چھٹکی ہوئی تھی اور ایک ایک چیز نظر آرہی تھی - بس ایک دم سے میں نے دیکھا کہ چھت پر چمنی کے پاس کوئی کالا کالا سا سایہ منڈلا رہا ہے - خوب چوڑا چکلا اور بھدا سا اور اپنا سینگ دار سر اس نے چمنی کے اندر گھسا رکھا تھا - وہ زور زور سے سونگھ رہا تھا اور فوں فوں کر رہا تھا اور دم کو بار بار چھت پر پٹکتا اور بڑے بڑے پاؤں کو باربار ہلا رہا تھا - میں نے فوراً صلیب کا نشان بنایا اور کہا ''یسوع مسیح اپنے دشمنوں کو شکست دینے پھر زمین سے اٹھےگا!،، بس اس نے چین سے ایک زور کی چیخ ماری اور پھسلتا ہوا احاطے میں آ گرا اور غائب ہو گیا! غالباً روڈلف کے گھر میں روزہ کھولنے کے لئے کوئی مزیدار چیز پک رہی تھی اور وہ کمبخت ندیدہ اسی کو سونگھ رہا تھا - ،،

مجھے اس بات پر بڑی ہنسی آئی کہ شیطان قلابازی کھاتا ہوا احاطے میں گرا - نانی اماں بھی میرے ساتھ ہنسنے لگیں -

''اور بڑے ہی شریر بھی ہوتے ہیں یہ بھوت‌پریت اور شیطان، ننھے بچوں کی طرح! ایک رات میں حمام میں کپڑے دھو رہی تھی - کوئی آدھی رات آئی ہوگی کہ بس ایک دم سے تندور کا دروازہ کھل گیا اور اس میں سے سار شیطان ہی شیطان نکل آئے - چھوٹے چھوٹے اور لال لال، ہرے ہرے، کالے کالے، جیسے تل چٹے - میں نے دروازے کا رخ کیا — مگر نکلنے کا راستہ ہی نہیں - اب یہ سوچو کہ وہاں حمام میں ان شیطانوں کے بیچ میں پھنس گئی - کوئی لاکھوں ہی تو رہے ہونگے - تمام حمام میں اٹم اٹ بھر گئے تھے - میرے تلوؤں کے نیچے گھس گئے، ٹانگوں پر چڑھ گئے - کہیں کاٹ رہے ہیں، کہیں نوچ رہے ہیں، کہیں کچھ چبھو رہے ہیں یہاں تک کہ مجھے اتنا بھی موقع نہیں ملا کہ صلیب کا نشان بناتی جو کم‌بخت اڑنچھو ہو جاتے - بالکل چھوٹی چھوٹی بلیوں کی طرح تھے وہ — نرم، گرم اور بال‌دار - پچھلے دونوں پیروں پر چلتے تھے، ادھر مڑتے، ادھر جھومتے، چوہوں کے سے دانت دکھاتے، چھوٹی چھوٹی سبز آنکھیں چمکاتے، سر کو جھٹکے دے دے کے وہ نوکیں ہلاتے جن پر دونوں سینگ اگے ہوئے، دمیں گھماتے! او خدا، اس وقت بھی کیا گذر گئی مجھ پر،

میں تو بے ہوش ہوگئی! ہاں بے ہوش تو ہو ہی گئی! اور جب ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ شمع جل جل کر بجھنے کے قریب تھی، کپڑے دھونے کا پانی سب ٹھنڈا ہو گیا تھا اور دھلنے والے کپڑے سب فرش پر بکھرے پڑے تھے۔ ''تھو،، میں نے کہا ''تمہیں طاعون لیجائے کمبخت شیطانو!،،

میں نے اپنی آنکھه بند کر لی اور مجھے دکھائی دینے لگا کہ پتھر کے بنے ہوئے مٹیالے بھورے رنگ کے تندور کا دروازہ بھڑ سے کھل گیا ھے اور چھوٹے چھوٹے شیطانوں کا ایک ریلا اس میں سے نکل نکل کر حمام میں بھر رہا ھے، پھونک مار کر انہوں نے شمع گل کر دی اور اپنی چکنی چکنی گلابی گلابی زبانیں نکالے چاروں طرف گھوم رہے ھیں۔ اس تخیل میں مزہ تو بہت آیا مگر ڈر بھی لگا۔ نانی اماں نے ایک بار سر ھلایا اور پھر چپ ہوگئیں یہاں تک کہ ان کے تخیل نے پھر زور مارا:

''اور میں نے ایسے لوگوں کو بھی دیکھا ھے جن پر شیطان کا سایہ ھوتا ھے اور جن کو خدا سزا دیتا ھے۔ یہ واقعہ بھی رات ھی میں ھوا تھا۔ جاڑوں کی بڑی سرد رات تھی، برف کا طوفان آیا ھوا تھا۔ میں دیوکوف تلیا پار کر رھی تھی۔ وہ جگہ تھی جہاں یاد ھے میں نے تمہیں بتایا تھا کہ یاکوف اور میخائل تمہارے ابا کو تالاب میں ڈبو کر مار ڈالنا چاہتے تھے۔ تو میں اسی طرف جارھی تھی۔ سڑک پر سے ھوکر تلیا کے پیندے کے پاس ھی پہونچی تھی کہ ایک دم سے زور کی سیٹیاں بجنے لگیں اور چوں چوں کی آواز زور سے آنے لگی۔ سر اٹھاکر جو دیکھتی ھوں تو تین سیاہ گھوڑوں والی گاڑی بس جیسے میرے اوپر ھی چڑھی چلی آ رھی ھے۔ کوچبان جو تھا وہ ایک چھوٹا سا موٹا سا شیطان تھا۔ سر پر ایک نوکدار سرخ ٹوپی پہنے سیٹ پر کھڑا ھوا، بازو پھیلے ھوئے اور لگاموں کی جگہ وہ زنجیروں سے گھوڑے دوڑا رہے تھے۔ جب گھوڑے تلیا میں اتر نہیں سکے تو وہ برف کے بادل اڑاتے ھوئے سیدھے تالاب کی طرف ھولئے۔ گاڑی میں بیٹھنے والے بھی سب شیطان ھی تھے، ٹوپیاں اچھالتے، سیٹیاں بجاتے! اس طرح کی سات گاڑیاں ایک کے بعد ایک آگ سے بھری ھوئی گاڑیوں کی طرح میرے پاس سے اڑتی ھوئی نکل گئیں۔ گاڑیوں

میں ان لوگوں کی روحیں جتی ہوئی تھیں جن کو ماں باپ کی بددعاؤں نے راند دیا تھا۔ شیطان ان لوگوں کو خوب تماشہ بنائے پھرتے ہیں، ان کو ڈھونڈ نکالتے ہیں اور پھر رات بھر ان کو جگہ جگہ گھسیٹتے پھرتے ہیں اور خوب خوش ہوتے ہیں۔ اس دن تو ایسا معلوم ہوتا جیسے میں نے کسی شیطان کی برات دیکھی تھی!''

نانی اماں کے لہجے میں کچھ ایسا یقین اور ایسی سادگی ہوتی تھی کہ ان کی باتوں پر یقین نہ کرنا نا ممکن تھا۔

لیکن سب سے زیادہ بہتر وہ نظمیں ہوتی تھیں جو وہ مقدس ماں کے متعلق دوہرایا کرتی تھیں۔ کہ کس طرح مقدس ماں نے کانٹوں پر چل کر پوری دنیا کا سفر کیا تا کہ ''ڈاکو شہزادی'' اینگالیچیوا روسیوں کو لوٹنا اور مارنا بند کر دے، پھر الیکسئی کے گیت جو بڑا خدا کا دوست تھا، ایوان سپاہی کے گیت، عقلمند واسیلیسا کی کہانی، پادری‌نما بکری اور اس کے خدا پرست بیٹے کی داستان۔ پھر مارفا پوسادنیتسا کے قصے، ڈاکوؤں کی سردار بی‌بی اوستیا اور مصر کی گنہگار میریا کے قصے، ڈاکو کی ماں کی بپتا کے بھیانک قصے۔

ان کے پاس قصوں، داستانوں، روائتوں اور نظموں کا ایسا خزانہ تھا جو کبھی خالی نہیں ہوتا تھا۔

وہ کسی سے ڈرتی نہیں تھیں — نانا تک سے نہیں، نہ شیطان سے اور نہ کسی اور بھوت پریت کی طاقت سے، لیکن تل چٹوں کے ڈر سے ان کا دم نکلتا تھا۔ اگر تل چٹا دور دور بھی کہیں ہو تو ان کو فوراً پتہ لگ جاتا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ آدھی رات کو مجھے اٹھا کے بٹھا دیتیں اور آہستہ سے کہتیں:

''الیوشا، میرا بچہ، دیکھ تو تل چٹا رینگ رہا ہے۔ یسوع مسیح کا واسطہ ذرا مار دے اسے!''

میں نیند میں دھت، کچھ سوتا کچھ جاگتا، شمع روشن کرتا اور چاروں ہاتھ پاؤں کے بل دشمن کی تلاش میں فرش پر ادھر ادھر رینگتا لیکن مجھے اپنی سہم میں کامیابی نہیں ہوتی تھی۔

''نہیں ہے یہاں تو'' میں کہتا۔ لیکن وہ اپنی جگہ بے حس وحرکت لیٹی، لحاف سے منہ ڈھکے گہری گہری سانسیں لیتی رہتیں۔

''نہیں نہیں! ہے، ضرور ہے۔ ڈھونڈ تو میں ہاتھ جوڑتی ہوں۔ وہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ ہے۔''

اور ان کی بات ہمیشہ ٹھیک ہوتی تھی۔ اکثر مجھے تل چٹا پلنگ سے دور کہیں ملتا۔

''مار ڈالا؟ آہ، تیرا شکر ہے معبود! جیتا رہ بیٹا۔ تیرا شکریہ۔''

اور وہ مسکراتی ہوئی لحاف ہٹا کر اپنا منہ کھول دیتیں۔

لیکن اگر تل چٹا نہ ملتا تو پھر ان کے لئے سونا نا ممکن ہو جاتا۔ رات کے سناٹے میں کہیں ذرا سی بھی سرسراہٹ ہوتی کہ ان کا سارا جسم کانپنے لگتا، سانس روک کر آہستہ آہطتہ سہمے ہوئے لہجے میں کہتیں:

''وہ رہا دروازے کے پاس... وہ گیا بکس کے نیچے...''

''نانی اماں تم تل چٹے سے اتنا کیوں ڈرتی ہو؟''

وہ اپنے ہوش و حواس ٹھیک کرکے جواب دیتیں:

''بھلا ان کم بختوں سے فائدہ بھی کیا ہے؟ بس رینگتے پھرتے ہیں، رینگتے پھرتے ہیں، کم بخت منہ کالا ہو ان شیطانوں کا۔ خدا نے حقیر سے حقیر مخلوق کی پیدائش کا بھی کوئی مقصد رکھا ہے۔ کھٹمل پیدا ہوتے ہیں تو معلوم ہو جاتا ہے کہ بھئی دیواریں گندی ہیں، صفائی کی ضرورت ہے۔ اگر جوں کہیں کپڑے میں ملے تو اس کے معنی ہیں کہ کوئی بیماری آنے والی ہے۔ تو یہ سب تو ایک بات ہوئی۔ لیکن یہ بھلا کوئی بتائیے یہ کس کام آتے ہیں؟ انہیں زندہ رہنے کا کیا حق ہے؟''

ایک دن وہ دوزانو بیٹھی اپنے پروردگار سے بڑے ذوق و شوق سے باتیں کر رہی تھیں کہ نانا ابا نے دھڑام سے دروازہ کھولا اور گھٹی ہوئی آواز میں زور سے چیخے:

''لو وروارا کی ماں! اب تو واقعی ہم پر خدا کی پھٹکار برس پڑی۔ دوکان میں آگ لگ گئی!''

''کیا؟'' نانی اماں چیخیں اور لڑکھڑاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ دونوں دھڑا دھڑ کرتے ہوئے لمبی سی اندھیری ڈیوڑھی میں سے ہوکر بھاگے۔

''ایو گینیا! مقدس شبیہوں کو تو کھونٹیوں پر سے اتارو! نتالیا، جلدی بچوں کو کپڑے پہناؤ!،، نانی اماں نے زور سے اور بڑے ٹھہراؤ کے ساتھ حکم دیا۔

''ہائے... ے...ے!،، نانا ابا زور زور سے رو رہے تھے۔

میں باورچی خانے میں بھاگا۔ اس کی جو کھڑکی احاطے میں کھلتی تھی وہ تمام سونے کی طرح چمک رہی تھی اور اس میں سے پھسل پھسل کر فرش پر بھی جابجا سنہری رنگ کے قتلے بکھرے ہوئے تھے۔ یاکوف ماموں ننگے ہی پیروں پر جوتا چڑھا رہے تھے اور پھر اچھل اچھل کر بار بار روشنی کے ان قتلوں کو کچلتے جیسے وہ روشنی نہیں، انگارے ہوں جو ان کے پیروں کو جھلسے دے رہے ہوں۔

''ارے یہ میخائل نے ہمارے گھر میں آگ لگائی ہے۔ ہمارے گھر میں آگ لگا کے بھاگ گیا آ آ...،، یاکوف ماموں چیخ رہے تھے۔

''چپ رہ کتے!،، نانی اماں نے ان کو دروازے سے باہر ایک ایسا دھکا دیا کہ وہ گرتے گرتے بچے۔

کھڑکی کے شیشوں پر جمی ہوئی برف میں سے میں نے دیکھا کہ دوکان کی چھت جل رہی تھی اور کھلے دروازے سے شعلے زبانیں نکال نکال کے لپک رہے تھے۔ رات کے سناٹے میں آگ کی سرخ سرخ کلیاں دھویں بغیر ہی پھول بن بن کر کھلتی جا رہی تھیں، دھویں کے بادل تو صرف اوپر ہوا میں نظر آتے تھے۔ لیکن ان کے اوپر کہکشاں کی چاندی کی لکیر اسی طرح آسمان پر پھیلی ہوئی تھی — وہ دھویں سے چھپ نہیں سکتی تھی۔ سرخ شعلوں کے عکس سے برف دمک رہی تھی اور گھروں کی دیواریں ایسا جھوم رہی تھیں، تھرتھرا رہی تھیں جیسے لڑکھڑاتی ہوئی احاطے کے اس کونے میں پہونچ جانا چاہتی ہوں جہاں آگ کے شعلے مسرت سے تھرک رہے تھے اور دوکان کی دیواروں میں پڑی ہوئی دراڑوں میں اپنی چمکتی بل کھاتی زبانیں ڈال رہے تھے۔ آگ کی دو سرخ اور سنہری چٹیں تیزی سے چھت کی خشک سیاہ لکڑی میں لپٹ گئیں جہاں پتلی سی چمنی اوپر کو منہ اٹھائے ہوئے تھی۔ اور اس میں سے دھویں کی ایک پتلی سی دھارا بہہ رہی تھی۔ کھڑکی کے شیشوں کو ہوا کی ریشمی سرسراہٹ چھو گئی اور برف چٹخنے لگی۔ آگ بڑھتی ہی گئی اور اس کے جلال سے دوکان

ایک ایسا حسن اختیار کر گئی جیسا گرجے میں ہوتا ہے کہ دیکھنے والا اپنے پر قابو نہیں رکھہ سکتا۔

میں نے چمڑے کا ایک لبادہ اپنے سر پر ڈالا، نہ جانے کس کے جوتے چڑھائے اور ڈیوڑھی سے دھڑ دھڑاتا گرتا پڑتا باہر برساتی میں نکل آیا۔ وہاں پہونچ کر میرے قدم خوف سے جمے کے جمے رہ گئے۔ آگ کی روشنی سے میری آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔ اس کی گھڑ گھڑاہٹ، اپنے نانا اور ماموں اور گریگوری کی چیخوں سے میرے کان بہرے ہو گئے تھے اور اپنی نانی کی حرکتیں دیکھہ دیکھہ کر پاؤں تلے کی زمین نکلی جا رہی تھی۔ نانی اماں نے اپنے سر پر ایک بوری اوڑھی، جسم پر گھوڑے کا کمبل لپیٹا اور شعلوں سے ابلتی ہوئی دوکان میں دوڑتی ہوئی گھس گئیں۔

''ارے احمقو! وہ گندھک کا تیزاب اڑ جائے گا!،،

میرے نانا زور سے روتے ہوئے چیخے:

''گریگوری! ارے ان کو روکو! ہائے! ختم ہو گئیں! ختم ہو گئیں...،،

لیکن نانی اماں تو نکل بھی چکی تھیں، ان کے پورے جسم سے دھواں اٹھہ رہا تھا، سر کو جھٹکے دیتی ہوئی وہ گندھک کے تیزاب کے ایک بڑے کنڈال کو دوہری ہو کر اٹھائے ہوئے تھیں۔ کھانستے ہوئے گھٹی ہوئی آواز میں وہ زور سے چلائیں:

''بڑے میاں، گھوڑے کو تو باہر نکالو! ارے اس کمبل کو تو مجھہ پر سے کھینچو — سوجھتا نہیں کہ جل رہی ہوں!،،

گریگوری نے لپک کے سلگتا ہوا گھوڑے کا کمبل ان پر سے کھینچا۔ پھر ایک بیلچہ اٹھایا اور دوہرے ہو کر دوکان کے دروازے پر برف کو زور زور سے پھینکنے لگے۔ میرے ماموں نے بھی ہاتھہ میں کلہاڑی لے کے ان کے آس پاس کود کود کے کھودنا شروع کر دیا اور میرے نانا نانی کے پاس پہونچ کر ان پر مٹھیاں بھر بھر کے برف پھینکنے لگے۔ نانی اماں نے گندھک کے تیزاب والے کنڈل کو برف میں گاڑ دیا اور احاطے کا پھاٹک کھولنے دوڑیں۔

''اے لوگو! اے پڑوسیو! دوڑو! گودام کو بچاؤ،، انہوں نے اندر آتے ہوئے لوگوں کے سامنے جھک جھک کر کہا۔ ''اگر گودام

میں اور گھاس میں آگ لگ گئی تو ہمارا سارا گھر جل جائے گا اور پھر آپ لوگوں کی باری ہے! گھاس کو باغ میں پھینکو اور دوکان کی چھت چیر ڈالو! گریگوری برف اوپر پھینکو، اوپر! نیچے سے کیا فائدہ! یاکوف بے کار نہ دوڑتے پھرو! پڑوسیوں کو کلہاڑیاں اور بیلچہ لاکے دو اندر سے! اچھے پڑوسیو! اچھے لوگو! ہماری مدد کرو، سب مل کر کوشش کرو! خدا ہماری مدد کرے گا۔،،

نانی اماں کی ہستی اس وقت کچھ کم دلکش نہ تھی۔ لپکتے ہوئے شعلے باربار جیسے ان کا پیچھا کرتے تھے لیکن وہ ان کی روشنی میں اس پھرتی سے سٹاسٹ دوڑ رہی تھیں جیسے کوئی تاریک پرچھائیں احاطے میں بھاگ رہی ہو۔ ہر چیز ان کو نظر آجاتی تھی، وہ ہر جگہ بیک‌وقت پہونچ جاتی تھیں اور ہر شخص کو حکم دے رہی تھیں۔

یکایک گھوڑا شراپ دوڑتا ہوا احاطے میں گھس آیا اور الف ہو گیا۔ نانا گرتے گرتے بچے، وہ کود گئے۔ گھوڑے کی ابلتی ہوئی گول آنکھیں آگ کی روشنی میں سرخ چمکتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ فوں فوں کرتا وہ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی کے قابو میں نہ آئے گا۔ نانا ابا نے لگام چھوڑ دی اور اچک کر ایک طرف کو ہوگئے۔

”پکڑو! پکڑو وروارا کی ماں! اسے پکڑو!،،

جیسے ہی گھوڑے نے مڑنا چاہا میری نانی نے فوراً اپنے کو تقریباً اس کے پیروں میں ڈال دیا اور نہایت سکون سے دونوں ہاتھ پھیلا کر اس کے سامنے خاموش کھڑی ہو گئیں۔ گھوڑا گردن جھکا کے بڑے دردناک انداز میں ہنہنایا اور آگ کی طرف باربار کنکھیوں سے دیکھتا ہوا بالکل چپ چاپ کھڑا ہوگیا۔

نانی اماں نے اس کی لگامیں پکڑیں، گردن تھپتھپائی اور بھرائی ہوئی آواز میں بولیں:

”ڈر مت بیٹا! تو سمجھا کہ اس خطرناک موقع پر میں تجھ کو چھوڑ دونگی؟ بےوقوف کہیں کا! ننھا سا احمق چوہا!،،

ننھا سا احمق چوہا جو سائز میں نانی اماں سے تین گنا بڑا تھا بڑی مسکینی سے ان کے پیچھے پیچھے پھاٹک کی طرف چلنے لگا۔

بار بار وہ ان کے تمتمائے ہوئے چہرے کی طرف دیکھتا اور آہستہ سے ہنہناتا۔

ایوگینیا بوا بچوں کو لیے کر باہر نکلیں — سب گڈمڈ، بھنبھناتے ٹھنٹھناتے اپنے اوپر طرح طرح کے کپڑے چڑھائے ہوئے۔

''واسیلی واسیلی وچ،، وہ چیخیں۔ ''الیکسئی مجھے نہیں مل رہا ہے۔ کہاں ہے؟،،

''چلو، چلو!،، نانا ابا بولے۔ میں ڈیوڑھی کی سیڑھیوں کے نیچے چھپ گیا تاکہ بوا مجھے ڈھونڈ نہ سکیں۔

دوکان کی چھت اندر کو بیٹھ گئی۔ صرف جلتی ہوئی چھتوں کا دھواں پھینکتا ہوا شعلہ گوں ڈھانچہ آسمان کے پس منظر میں کھڑا تھا۔ اس ڈھانچے کے اندر سے سرخ، سبز اور نیلے شعلوں کے دغنے کی آواز آ رہی تھی جو بار بار باہر احاطے کی طرف لپک رہے تھے اور ان لوگوں کی طرف بڑھ رہے تھے جو اس زبردست آگ کو برف پھینک پھینک کر بجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ناندیں زوروں میں پکنے لگی تھیں اور ان میں سے دھویں اور نارنجی رنگ کے بادلوں کے دل کے دل اٹھ کر احاطے میں عجیب طرح کی بو پھیلاتے ہوئے آنکھوں میں گھس رہے تھے اور آنکھوں میں آنسو بھربھر آئے تھے۔ میں سیڑھیوں کے نیچے سے نکلا اور نانی اماں کے پیروں میں آ گیا۔

''نکل یہاں سے! کچل جائے گا! نکل...،،

پھر احاطے میں ایک گھوڑسوار گھس آیا جس کے خود میں پر لگا ہوا تھا۔ اس کے کمیت گھوڑے کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا اور اپنی چابک اٹھائے وہ دھمکی دینے کے انداز میں بڑھا چلا آ رہا تھا:

''ہٹ جاؤ۔ بچ جاؤ۔ ہٹ جاؤ!،،

چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں بڑے مزے میں بج رہی تھیں اور سارے ماحول پر میلے کی سی کیفیت طاری تھی۔ نانی اماں نے مجھے جلدی سے اوپر برآمدے میں دھکیل دیا:

''سنتا نہیں ہے کیا کہہ رہی ہوں؟ بھاگ یہاں سے! ارے کہہ رہی ہوں بھاگ!،،

اب اس وقت ان کی حکم عدولی بھی ناممکن تھی۔ میں باورچی خانے میں چلا گیا اور پھر کھڑکی کے پاس کھڑا ہوگیا۔ لیکن لوگوں

کا تاریک هجوم اتنا بڑھا کہ آگ میری نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ صرف جاڑے کی گہرے رنگوں والی ٹوپیوں اور ھیٹوں کے درمیان تانبے کے خود چمکتے دکھائی دیتے تھے۔

آگ پانی ڈال کر اور پیٹ پیٹ کر جلد ھی بجھا دی گئی۔ پولیس کے لوگوں نے بھیڑ کو چلتا کر دیا اور آخرکار نانی اماں اندر باورچی خانے میں آئیں۔

''کون ہے یہاں؟ اچھا تم ہو؟ سوئے نہیں؟ کیا ڈر لگ رہا ہے؟ ڈرو نہیں۔ ھوگیا جو کچھہ ھونا تھا۔''

وہ میرے قریب ھی بیٹھہ گئیں اور ایک لفظ کہے بغیر آگے پیچھے ھلنا شروع کر دیا۔ خاموش رات کا پھر واپس آ جانا اور اندھیرے کا چھا جانا اچھا لگ رہا تھا لیکن پھر بھی مجھے آگ کے ختم ھو جانے سے کچھہ افسوس سا ھوا۔

اتنے میں نانا ابا آکر دروازے پر کھڑے ھوگئے۔

''وروارا کی ماں؟''

''ھاں۔''

''جل گئیں نا؟''

''کوئی ایسی بہت تو نہیں۔''

نانا نے گندھک کی ایک ماچس جلائی اور اس کی روشنی میں ان کا دھویں سے سیاہ چہرہ چمکنے لگا۔ انہوں نے میز پر رکھی ھوئی شمع روشن کی اور وہ بھی میری نانی اماں کے پاس ھی بیٹھہ گئے۔

''چلو ھاتھہ منہ دھولو'' نانی بولیں حالانکہ وہ خود بھی تمام کالک سے تپی ھوئی تھیں اور اس سے دھویں کی تیز بو آ رھی تھی۔

نانا ابا نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''کبھی کبھی معبود آدمی پر اپنا فضل کرتا ہے، عقل کی ایک جھلک بخش دیتا ہے'' انہوں نے نانی کی پیٹھہ تھپتھپائی اور کھیسیں نکال کے بولے۔ ''چند منٹوں کے لئے سہی، ذرا سی دیر کے لئے سہی، مگر پھر بھی بخش تو دیتا ہے۔''

نانی اماں بھی ھنسنے لگیں اور کچھہ کہنے ھی والی تھیں کہ نانا ابا ابروؤں پر بل ڈال کے بولے:

''اس گریگوری کو نکالنا ہوگا۔ اب سٹھیا گیا ہے یہ دیہاتی! سب اسی کی لاپرواہی سے ہوا۔ اور یاکوف وہاں باہر برآمدے میں بیٹھا رو رہا ہے، بےوقوف کہیں کا۔ تم ذرا اس کے پاس چلی جاتیں...''

نانی اماں اٹھیں اور باہر چلی گئیں اپنا ایک ہاتھ اٹھائے اور انگلیوں پر پھونکیں مارتی ہوئی۔ میرے نانا میری طرف دیکھے بغیر مجھ سے مخاطب ہوئے:

''دیکھا سب تماشہ؟ شروع سے آخر تک؟ کہو اب اپنی نانی کے بارے میں کیا کہتے ہو! اور یہ نہ بھولنا کہ وہ بڑھیا ہو چلی ہیں... بالکل ٹوٹ گئی ہیں، بالکل لٹ گئی ہیں... یہ ہے تمہارے لئے غور کرنے کی بات۔ اور باقی جو لوگ ہیں — تھو... و... و، کیا لوگ ہیں!..''

وہ جھکے کھڑے رہے اور کچھ دیر تک کچھ نہیں بولے۔ پھر اٹھے اور شمع کا جلا ہوا گل توڑتے ہوئے بولے:

''کیا تمہیں ڈر لگا تھا؟''

''نہیں۔''

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔''

انہوں نے جھنجھلاتے ہوئے انداز میں قمیص اتاری اور کونے میں لگے ہوئے طسلے کی طرف بڑھے۔

''آگ لگنا بھی کیا ہی حماقت ہے''، وہ پیر پٹخ کے زور سے بولے۔ ''جس کے گھر میں آگ لگے اس کو تو پکڑ کر سربازار پیٹنا چاہئے کیونکہ وہ یا تو چور ہے یا پھر احمق! ایسے لوگوں کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنا چاہئے اور تب ہی آگ لگنا بند ہو سکتا ہے!.. جاؤ اپنے بستر پر۔ تم یہاں کیوں بیٹھے ہو؟''

میں باہر کھسک لیا لیکن پھر اس رات مجھے نیند نہ آئی کیونکہ میں بستر میں گھسا ہی تھا کہ ایک غیرانسانی چیخ سنائی دی اور میرا احساس پھر جی اٹھا۔ میں پھر باورچی خانے میں بھاگا اور وہاں میرے نانا کمرے کے بیچوں بیچ کھڑے تھے۔ ان کے جسم پر قمیص بھی نہیں تھی، ان کے ہاتھ میں شمع تھر تھر تھر تھر کانپ رہی تھی۔ وہ باربار قدم اٹھاتے اور دھرتے لیکن اپنی جگہ سے ذرہ برابر نہ کھسک پاتے۔

''وروارا کی ماں، یاکوف، یہ کیا ہے؟،، وہ سانس روک روک کے کہہ رہے تھے۔

میں تندور پر چڑھا اور کونے میں دبک گیا۔ گھر میں پھر هراسانی پھیل گئی۔ تمام چیزیں الٹ پلٹ ہونے لگیں جیسے آگ لگنے کے وقت ہوئی تھیں۔ آہ و زاری کی چیخیں لہراتی، تانیں لیتی ہوئی آکر دیواروں سے ٹکرا رہی تھیں اور برابر تیزتر ہوتی جا رہی تھیں۔ ان کی فریاد بڑھتی جا رہی تھی۔ میرے نانا اور ماموں نے پاگلوں کی طرح ادھر ادھر دوڑنا شروع کردیا تھا اور نانی اماں ان کو ڈانٹ ڈانٹ کر باورچی خانے میں سے ہنکا رہی تھیں۔ گریگوری الگ تندور میں لکڑیاں ٹھونسنے کی کھڑبڑ مچائے ہوئے تھے۔ انہوں نے کئی عدد پتیلے پانی سے بھر لئے تھے اور اس طرح منہ اٹھائے، ہلتے ہوئے ادھر ادھر گھوم رہے تھے جیسے استراخان کا کوئی اونٹ ہو۔

''پہلے آگ تو جلاؤ،، نانی اماں نے حکم دیا۔

گریگوری ایندھن اتارنے کے لئے تندور پر چڑھے تو میرا پاؤں ان کو چھو گیا۔ وہ گھبرا کے چیخے:

''ارے یہ کون ہے؟ تھو... تم ہو۔ کیا ڈرایا ہے مجھے۔ تم ہمیشہ ایسی جگہ گھسے رہتے ہو جہاں تمہارا کوئی کام نہیں۔،،

''یہ سب کیا ہو رہا ہے؟،،

''تمہاری نتالیا ممانی کے بچہ ہو رہا ہے۔،،

مجھے یاد آیا کہ جب میری ماں کے بچہ ہوا تھا تو وہ اتنا چیخی چلائی نہیں تھیں۔ جب مستری گریگوری پتیلوں کو تندور پر چڑھا چکے تو وہ بھی تندور پر چڑھ کر میرے پاس آ بیٹھے، جیب سے چکنی مٹی کا پائپ نکالا اور مجھ کو دکھاتے ہوئے بولے:

''میں نے اپنی آنکھوں کو ذرا ٹھیک رکھنے کے لئے تمبا کو پینا شروع کیا تھا۔ تمہاری نانی کہتی ہیں نسوار لیا کرو مگر میں سمجھتا ہوں یہی بہتر ہے۔،،

وہ تندور کے کنارے پر سے نیچے پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے اور شمع کی چندھی روشنی کی طرف تکے جا رہے تھے۔ ان کے کانوں اور گالوں پر کالک تپی تھی، قمیص پھٹ گئی تھی اور اس میں سے ان کی پہیوں کی طرح خم کھائی ہوئی پسلیاں مجھے دکھائی دے رہی تھیں۔

کالی عینک کا ایک شیشہ ٹوٹا ہوا تھا اور اس میں سے ان کی نمناک سرخ آنکھ کے ایک کونے کی جھانکی دکھائی دے سکتی تھی جو ناسور کی طرح لگتا تھا۔ انہوں نے اپنے پائپ میں پتی کا تمباکو بھرا اور بیٹھے ہوئے پیتے اور چیخیں مارتی ہوئی عورت کی آہ و زاری سنتے رہے اور اس طرح منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے رہے جیسے نشے میں ہوں:

''ایسا لگتا ہے کہ بالاخر تمہاری نانی تھوڑا بہت جل ہی گئیں۔ اب وہ بچے کی دیکھ بھال کیسے کریں گی۔ سنو ذرا اب تمہاری ممانی کا کیا حال ہے؟ لوگ اس کو بھول ہی گئے تھے۔ بات یہ ہوئی کہ آگ جو لگی نا تو اس کے خوف سے اس کے درد شروع ہو گیا — دیکھو ایک جیتی جاگتی زندگی کو دنیا میں جنم دینا کتنا مشکل ہے۔ پھر بھی لوگوں کے دلوں میں عورت کی قدر نہیں! عورت کی عزت ہونی چاہئے — یعنی ماں کی — اور تم یہ بات کبھی نہ بھولنا۔،،

میں اونگھ چلا تھا لیکن دروازہ جو دھڑام سے ہوا اور میخائل ماموں کی نشے میں دھت چیخ پکار ابھری اور گڑبڑ شروع ہو گئی تو میں جاگ پڑا۔ میرے کان میں ایک عجیب سی آواز آئی:

''جنت کا دروازہ کھلنے کی گھڑی آ گئی۔،،

''ارے چراغ کے تیل میں ذرا سی شراب ملا کر دو اسے، اس میں تھوڑی سی کالک بھی ملا دینا۔ آدھا گلاس تیل، آدھا گلاس شراب اور ایک بڑا چمچہ بھر کے کالک۔،،

''ارے ذرا مجھ کو تو دکھا دو اسے،، میخائل ماموں باربار کہتے جا رہے تھے۔

وہ زمین پر ٹانگیں پھیلائے بیٹھے تھے۔ پھیلی ہوئی ٹانگوں کے بیچ میں تھوکتے جا رہے تھے اور زمین پر ہاتھ مار رہے تھے۔

تندور پر گرمی بہت بڑھ گئی تھی۔ اس لئے میں نیچے اترا لیکن جیسے ہی اپنے ماموں کے نزدیک پہونچا انہوں نے میری ٹانگ پکڑ لی۔ میں دھڑام سے گر پڑا اور میرا سر زمین سے ٹکرا گیا۔

''بیوقوف،، میں ایک دم چیخا۔

وہ اٹھ کھڑے ہوئے، مجھے گھسیٹا اور گرجتے ہوئے مجھے اٹھا کر ہوا میں اچھال دیا اور چیخے:

''تندور پر پٹک کر چیتھڑے چیتھڑے کر دوں گا۔ ،،

جب مجھے ہوش آیا تو میں بیٹھک کے مقدس شبیہوں والے کونے میں اپنے نانا کے گھٹنوں پر سر رکھے لیٹا تھا۔ وہ مجھے جھکورے دے رہے تھے اور ان کی آنکھیں چھت سے لگی ہوئی تھیں، دھیرے دھیرے بڑبڑاتے جا رہے تھے:

''کسی کی بخشش نہیں ہوگئی ، ہم میں سے کسی کی بخشش نہیں ہوگی۔ ،،

ان کے سر کے اوپر لگا مقدس شبیہہ والا چراغ خوب روشن تھا، کمرے کے بیچوں بیچ بھی ایک شمع جل رہی تھی اور کھڑکی سے جاڑوں کی دھندلی صبح جھانک رہی تھی۔

''کہاں دکھتا ہے بیٹا؟،، میرے نانا نے مجھ پر جھکتے ہوئے پوچھا۔

میں کیا بتاتا؟ ہر جگہ دکھ رہی تھی۔ سر پسینے میں تر تھا، جسم سیسے کی طرح بھاری تھا مگر ان کے بارے میں زبان کھولنے کو بھی جی نہیں چاہ رہا تھا۔ میرے چاروں طرف ہر چیز اجنبی سی لگ رہی تھی۔ کمرے میں زیادہ‌تر کرسیوں پر ایسے لوگ بیٹھے نظر آرہے تھے جن کو میں پہچانتا بھی نہیں تھا — ایک بڈھا پادری تھا عنابی رنگ کی عبا پہنے، ایک بوڑھے بزرگ سے آدمی عینک لگائے فوجی لباس پہنے اور کئی لوگ اور۔ وہ سب کے سب بالکل خاموش بیٹھے تھے — لکڑی کی مورتیوں کی طرح، جیسے کسی چیز کا انتظار کرتے کرتے جم گئے ہوں۔ سب کے کان پانی کی ایک عجیب سی چھپا چھپ پر لگے ہوئے تھے جس کی قریب ھی کہیں سے آواز آرھی تھی۔ یاکوف ماموں دونوں ھاتھ پیچھے باندھے بیچوں بیچ دروازے میں سیدھے کھڑے تھے۔

''لو اسے لے جا کر سلا دو ، یاکوف،، نانا ابا نے کہا۔

میرے ماموں نے مجھے اشارہ کیا اور ہم دونوں چپکے چپکے نانی اماں کے کمرے کی طرف چلے۔ جب میں بستر میں گھس کے لیٹنے لگا تو یاکوف ماموں آہستہ سے بولے:

''تمھاری نتالیا ممانی مر گئیں...،،

اس بات پر مجھے کوئی خاص تعجب نہیں ہوا کیونکہ پچھلے کئی دنوں سے وہ گھر میں کہیں چلتی پھرتی نہیں دکھائی دیتی تھیں، باورچی خانے میں یا میز پر کھانا کھانے بھی نہیں آتی تھیں۔

''نانی اماں کہاں ہیں؟،،

''وہاں ہیں، اندر،، انہوں نے ہاتھ گھما کر کہا۔ وہ جس طرح آئے تھے اسی طرح چلے گئے — ننگے پاؤں، پنجوں کے بل چلتے ہوئے۔

میں بستر میں اکیلا لیٹا ہوا ادھر ادھر تک رہا تھا۔ کھڑکی کے شیشوں پر چندھی چندھی، سفید بالوں والی شکلیں چپکی ہوئی تھیں۔ کونے میں بکس کے اوپر نانی اماں کا لباس ٹنگا ہوا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ لباس ہے لیکن اس وقت مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی زندہ انسان ہو جو اندھیرے میں کونے میں دبکا ہوا ہے۔ میں نے ایک آنکھ دروازے پر رکھتے ہوئے اپنا سر تکئے میں چھپالیا۔ جی چاہتا تھا جست بھر کر اٹھوں اور غائب ہوجاؤں۔ کمرے میں گرمی بہت تھی اور سارے گھر میں ایک ایسی بو پھیلی ہوئی تھی جس سے مجھے باربار یاد آتا تھا کہ تسیگانوک کس طرح مرا تھا اور کس طرح اس کا خون باورچی خانے کے فرش پر بہہ گیا تھا۔ میرا دماغ یا شاید میرا دل پھٹا جا رہا تھا۔ اس گھر میں میں نے جو کچھ دیکھا تھا اس کے بعد مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے پہئے میرے وجود پر سے گذر رہے ہوں — مجھے پیستے ہوئے، کچلتے ہوئے، مٹاتے ہوئے۔

آہستہ سے دروازہ کھلا اور نانی اماں دبی سکڑی اس میں سے اندر آئیں۔ انہوں نے اپنے کندھے سے ٹھیل کے دروازہ بند کیا اور پھر اس کے سہارے ٹک کر مقدس شبیہہ والے چراغ کی نیلی لو کی طرف اپنے دونوں ہاتھ بڑھائے۔

''آہ میرے ہاتھ، میرے بیچارے ہاتھ۔ کتنی تکلیف ہوئی ہے ان میں،، وہ بچوں کے سے ٹھنٹھناتے ہوئے شکایت آمیز لہجے میں کہتی جا رہی تھیں۔

۵

اسی سال موسم بہار میں جائداد کا بٹوارہ ہوا۔ یاکوف ماموں شہر ہی میں رہے اور میخائل ماموں دریا پار چلے گئے۔ نانا ابا نے پولیوایا گلی میں ایک نیا مکان خریدا جس میں نیچے شراب خانہ تھا اور اوپر ایک کھپریل کا چھوٹا سا کمرہ تھا۔ ایک باغ تھا جس سے پہاڑی نالہ دکھائی دیتا تھا اور اس کے آس پاس بید کا گھنا جنگل تھا۔

''چابکیں تو بہت سی ہیں،، میرے نانا ابا میری طرف آنکھ مارکے مسکراتے ہوئے بولے۔ ہم دونوں باغ کا معائنہ کرنے کے لئے نرم نرم روشوں پر چل رہے تھے جن پر برف پگھل رہی تھی۔ ''اب جلدی ہی میں تمہاری پڑھائی شروع کرنے والا ہوں۔ تب یہ بیدیں خوب کام آئیں گی۔،،

گھر کے زیادہ تر حصوں میں کرایہ‌دار رہتے تھے۔ نانا ابا نے صرف اپنے اور آنے جانے والوں کے لئے اوپر کی منزل میں ایک کمرہ لے رکھا تھا۔ میں اور نانی اماں دوچھتی کے کمرے میں رہتے تھے۔ اس کمرے کی کھڑکی نیچے گلی کی طرف کھلتی تھی اور اس میں جھک کر میں شام کے وقت یا چھٹیوں کے موقع پر شرابیوں کو نیچے شراب خانے سے نکلتے دیکھا کرتا تھا۔ وہ گلی میں لڑھکتے بھٹکتے چلتے اور شور مچاتے ہوئے گرتے۔ کبھی ان کو آٹے کی بوریوں کی طرح شراب خانے سے باھر لڑھکا دیا جاتا لیکن وہ رینگ کر پھر دروازے کے پاس پہنچ جاتے۔ دروازہ اپنے زنگ‌آلودہ قبضوں پر چوں سے بند ہو جاتا اور شیشوں کی جھنکار سنائی دیتی، پھر جھگڑا ہونا شروع ہوتا۔ اوپر سے یہ سب قضیئے دیکھنے میں بڑا مزہ آتا۔ نانا ابا روز اپنے بیٹوں کی دوکانوں پر جاتے تاکہ انہیں کام چالو کرنے میں مدد دیں۔ شام کو تھکے ھارے جھنجھلاتے ہوئے واپس آتے۔

نانی اماں سلائی میں لگی رہتیں، کھانا پکاتیں اور باغ میں گڑائی کرتیں۔ سارے دن وہ اسی طرح چکر کاٹتی رہتیں جیسے وہ کوئی بھاری سا لٹو ہوں جو غیرمرئی اسپرنگوں پر ناچ رہا ہو۔ چٹکی

میں نسوار بھر کر ناک میں لیتیں، بڑے مزے میں چھینکتیں اور اپنا پسینے میں تر چہرہ پونچھتے ہوئے کہتیں:

''فرشتوں پر اور خدا کے پیاروں پر ہمیشہ ہمیشہ صلوۃ ہو! آخرکار ہماری زندگی میں سکون آیا الیوشا، میرا کبوتر وبوتر! پاک مریم کا شکر ہے کہ اب ہماری سب بات بن گئی - سب ٹھیک ٹھاک ہو گیا!،،

لیکن ہم لوگوں کی زندگی مجھے تو کوئی خاص پرسکون نظر نہیں آتی تھی - صبح سے شام تک کرایہ‌دار لوگ احاطے میں ادھر ادھر بھاگتے پھرتے تھے - پڑوسینیں آن آن کر جھانکتیں — انہیں ہمیشہ کہیں جانے کی جلدی پڑی رہتی، ہمیشہ کہیں پہونچنے میں دیر ہونے کی آفت مچائے رہتیں، ہمیشہ کہیں نہ کہیں جانے کی تیاری کرتی رہتیں -

''اکولینا ایوانوونا،، وہ میری نانی اماں کو آواز دیتیں اور اکولینا ایوانوونا ان سب کی طرف دیکھ کر اپنے دوستانہ انداز میں مسکراتیں، سب کی باتیں غور سے سنتیں اور نسوار چٹکی میں دبا کے سونگھتی جاتیں، وہ بڑے قاعدے سے ناک پونچھتیں اور پھر انگلیاں سرخ رومال سے صاف کرتی جاتیں اور کہتیں:

''جوؤں کے مارنے کے لئے؟ ذرا جلدی جلدی حمام میں نہایا کرو بیٹی اور اگر پیپرمنٹ کے تیل کی بھاپ لے لیا کرو تو سب سے اچھا ہے - لیکن اگر جوئیں کھال کے اندر بیٹھ گئی ہیں تو ایک چمچہ بطخ کی چربی لو — بالکل خالص‌والی چربی، تھوڑا سا پارے کا ست اور تین قطرے پارہ - اسے کسی چینی یا شیشے کے چمچے سے خوب ملا کر سات بار حل کر لو - کسی لکڑی یا ھڈی کے چمچے سے ہرگز نہ ملانا ورنہ پارہ ضائع ہو جائے گا - اور نہ ھی چاندی یا تانبے کے چمچے سے ملانا — اس سے مضر ہوگا -،،

کبھی کبھی وہ کافی غور کرنے کے بعد جواب دیتیں:

''بہن، تم پیر آصف سے مل لو پیچورے کے گرجے جا کر - تمہارے سوال کا جواب دینا میرے بس کے باہر ہے -،،

وہ لوگوں کے یہاں زچگیاں کراتیں، خاندانوں کے آپسی جھگڑے چکاتیں، بیمار بچوں کے لئے دوائیں دیتیں، کوئی عورت اپنی بگڑی قسمت بنانے کے سلسلے میں ان سے ''بی بی مریم کا خواب،، والی دعا

پڑھنے اور سیکھنے کے لئے آتی۔ تو کہیں امور خانہ‌داری میں ان سے مشورے کئے جاتے:

''کھیرا تو خود بخود منہ سے بولتا ھے کہ کب آچار پڑنے کا وقت ھے جب اس میں سے سوندھی خوشبو آنی بند ھو جائے تب اس کو نمک لگا کے ڈالنا چاھئے۔ کواس شراب میں جان پیدا کرنے کے لئے ضروری ھے کہ خوب چلاؤ، خوب پھینٹو اسے۔ چونکہ کواس جیسی شرابیں مٹھاس نہیں قبول کرتیں اس لئے ان میں چند عدد کشمش ڈال دو یا زیادہ سے زیادہ ایک بالٹی میں چمچہ بھر شکر۔ ھاں ھاں رائتے کی بہت سی ترکیبیں ھیں — ڈینوب والا طریقہ الگ ھے، ھسپانوی طریقہ اور ھے اور پھر قفقاز کا بھی طریقہ ھے...''

میں سارے سارے دن ان کی دم میں لگا گھوما کرتا کبھی احاطے میں، کبھی باغ میں، کبھی پڑوسینوں کے یہاں جہاں وہ گھنٹوں بیٹھی چائے پیا کرتیں اور قصے سنایا کرتیں۔ ایسا معلوم ھوتا تھا جیسے میں بھی ان کے وجود کا ایک حصہ بن گیا ھوں۔ اور مجھے اپنی زندگی کے ان دنوں کی اور کوئی یادیں اتنی گہری نہیں ھیں جتنی اس نیک‌دل، ان تھک کام کرنے والی، محبت شعار عورت کی۔

تھوڑے تھوڑے عرصے بعد میری ماں کبھی کبھی آ جاتی تھیں۔ ان میں ابھی تک وھی طنطنہ اور سختی تھی، ھر چیز کو ایسی بے‌پروائی، بے‌نیازی اور حقارت سے دیکھتی تھیں جیسے ان کی آنکھیں نہ ھوئیں — جاڑوں کی ٹھٹھرتی بے جان دھوپ ھوئی۔ پھر وہ بہت جلد غائب ھو جاتیں کچھ اس طرح کہ ان کی یاد بھی کھو جاتی۔

ایک دن میں نے نانی اماں سے پوچھا:

''نانی اماں، کیا آپ جادوگرنی ھیں؟''

''لو اور سنو! ارے یہ تو نے کیسے سوچا کہ میں جادوگرنی ھوں؟ تجھے یہ خیال کیسے آیا'' وہ ھنسنے لگیں۔ لیکن اس کے فوراً ھی بعد سنجیدہ ھوگئیں اور بولیں ''بھلا میں کیا بچاری جادوگرنی بنونگی۔ جادو گرنی ھونے کے لئے تو بہت علم کی ضرورت ھے۔ اور میں تو الف کے نام ب بھی نہیں جانتی۔ دیکھو تمہارے نانا کتنے پڑھے لکھے آدمی ھیں۔ لیکن پاک بی‌بی مریم نے اس میں مصلحت نہیں سمجھی کہ مجھے علم حاصل کرنے کے لائق بناتیں۔''

پھر انھوں نے اپنی زندگی کا ایک اور رخ مجھے بتایا:

"میں بھی یتیم تھی بیٹا - میری ماں بےچاری بیوہ تھیں اور اوپر سے اپاھج - جب وہ ایک امیر گھر میں نوکرانی تھیں تو ان کے مالک نے ایک دن رات کو ان کو ڈرایا تھا، تو وہ کھڑکی سے کود پڑی تھیں - بس جس طرف کو گریں ادھر کا ھاتھه اور کندھا بے کار ھوگیا - وہ لیس بنانے میں بڑی ماھر تھیں - مگر سوچو ذرا کہ گرنے کے بعد سے ان کا دھنا ھاتھه بس سوکھتا ھی چلا گیا اور بالکل ٹھٹھر گیا - پھر مالک کو رکھنے میں کیا فائدہ تھا — نکال باھر کیا - پھر وہ جس طرح بھی بن پڑا اپنے دن گذارتی رھیں - مگر ایک ھاتھه سے لنجی بھلا کیا کرتیں کیا نہ کرتیں - اس لئے انھوں نے بھیک مانگنی شروع کردی - لیکن اس زمانے میں بالاخنا میں لوگوں کی حیثیت بھی اچھی تھی اور ذرا خداترس بھی تھے - ایسے ایسے دل والے ھنر مند مستری اور بڑھئی اور لیس بنانے والے تھے کہ کیا کہوں - اس لئے میں اور میری ماں دونوں شہر بھر میں بھیک مانگا کرتے تھے - خزاں میں بھی، جاڑوں میں بھی - لیکن جب جبرئیل علیه السلام اپنی تلوار اٹھاتے اور برفباری نوک دم بھاگتی اور زمین پر بہار چھا جاتی تو پھر جہاں تک ھمارے پاؤں ساتھه دیتے ھم دور دور نکل جاتے — شہر سوروم تک پہنچتے، یورئےویتس کی خبر لاتے اور والگا اور اوکا کے کنارے کنارے چلتے جاتے - آہ! موسم‌بہار میں اور گرمیوں میں زمین پر چلنے میں کتنا لطف آتا ھے - قدموں تلے دھرتی کتنی نرم لگتی ھے، گھاس جیسے مخمل بچھا ھو، چاروں طرف پاک مریم کے اگائے ھوئے پھول جو اس نے ھمیں مسرت بخشنے کے لئے پیدا کئے ھیں اور چاروں طرف دل خوش کن میدان پھیلے ھوئے - پھر میری ماں اپنی نیلی آنکھوں کو نیم وا کر کے گانا شروع کرتیں اور ان کے گیت فرفر کرتے ھوئے آسمانوں کی طرف پرواز کرنے لگتے - ان کی آواز بڑی میٹھی اور ھلکی پھلکی تھی - اور چاروں طرف ایسا سناٹا چھا جاتا تھا جیسے کائنات نے ان کا گیت سننے کے لئے سانس روک لی ھو - اس وقت بھیک مانگنے میں بھی کتنا لطف آتا تھا! لیکن جب میرا دسواں سال شروع ھوا تو میری ماں کو مجھے ساتھه لے کر بھیک مانگتے مانگتے لاج آنے لگی کیونکہ اس میں بے عزتی ھوتی تھی - اس لئے وہ

مستقل طور پر بالاخنا میں رہنے لگیں۔ وہاں وہ اکیلی ہی در بدر پھرا کرتیں اور چھٹیوں کے دن گرجا گھر کے پاس بھیک مانگتیں۔ اور میں گھر پر بیٹھی لیس بنانا سیکھا کرتی۔ مجھے اپنی امی کی مدد کرنے کی اتنی جلدی پڑی رہتی تھی کہ میں سب کچھ بھول کر دن رات کام میں جٹی رہتی۔ کبھی کبھی نمونے بگڑ جاتے اور میں بیٹھ کر آنسو بہایا کرتی۔ لیکن دیکھو، تقریباً دو سال سے کچھ اوپر ہوئے تھے کہ میں نے لیس بننے کا فن پوری طرح سیکھ لیا اور میری شہرت شہر بھر میں پھیل گئی۔ جب بھی کسی کو کوئی خاص کام بنوانا ہوتا تو وہ میرے پاس آتے اور کہتے "چلو بھئی اکولینا، شروع کرو، اپنا لٹو گھمانا!"، اور اس سے مجھے کیسی کچھ خوشی ہوتی! یقیناً اس میں میری کوئی تعریف نہ تھی بلکہ میری ماں کی تعریف تھی جس نے مجھے لیس بنانا سکھایا تھا۔ کیا ہوا اگر وہ اپنے ایک ہاتھ سے خود کام نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ سکھانا تو جانتی ہی تھیں اور ایک اچھا کاریگر دس مزدوروں پر بھاری ہوتا ہے۔ مجھے بڑا فخر محسوس ہوتا۔ اکثر ان سے کہتی "امی اب تم بھیک مانگنا چھوڑ دو۔ اب میں اپنے ہاتھوں سے تمہیں کما کر کھلا سکتی ہوں۔"، میری ماں کہتیں "چل، چپ رہ! تجھے معلوم نہیں۔ اس روپئے سے تو تیرا جہیز خریدا جائے گا۔"، اس کے فوراً ہی بعد تمہارے نانا وارد ہو گئے — بڑے گبرو جوان تھے اس وقت۔ ان کی عمر تو صرف بائیس ہی برس کی تھی کہ وہ جہاز کے بڑے قلی بن گئے! ان کی اماں مجھ کو دیکھنے آئیں۔ انہوں نے دیکھا کہ میں کس قدر غریب تھی — ایک فقیرنی کی لڑکی جس کے معنی تھے کہ میں ضرور فرماں‌بردار بیوی ثابت ہوں گی۔ ہوں، وہ خود کلچے بیچا کرتی تھیں اور بہت ہی بری طبیعت کی عورت تھیں۔ لیکن اب مرے ہوؤں کی کیا برائی کروں! آخر ہمارے کہنے سے کیا ہوتا جبکہ خدا سب کچھ دیکھتا ہے۔ خدا دیکھتا ہے اور صرف شیطان کو ایسی باتوں کی پڑی رہتی ہے..."

وہ خوب جی بھر کے ہنسنے لگیں، ناک عجیب مضحکہ‌خیز طریقے سے کانپ رہی تھی اور آنکھوں سے میرے لئے محبت کی دھار پھوٹ رہی تھی، شفقت‌بھری، جو لفظوں سے زیادہ معنی رکھتی تھی۔

مجھے ایک شام خاص طور پر یاد ہے۔ میں اور نانی اماں نانا کے کمرے میں چائے پی رہے تھے۔ نانا ابا کی طبیعت اچھی نہیں تھی اور وہ اپنے پلنگ پر بغیر قمیص پہنے بیٹھے تھے، کندھوں پر ایک بڑی سی تولیہ لپٹی ہوئی تھی جس سے وہ باربار پیشانی سے پسینہ پونچھتے تھے۔ ان کی سانس گھراہٹ کے ساتھہ اور تیز تیز چل رہی تھی، سبز آنکھیں دھندلی لگتی تھیں اور چہرہ سرخ اور بھر بھرایا ہوا تھا۔ نوکدار کان خاص طور پر بہت سرخ ہو رہے تھے اور جب انہوں نے چائے کے گلاس کی طرف ھاتھہ بڑھایا تو ھاتھہ اس بری طرح سے کانپ رہا تھا کہ ترس آتا تھا۔ وہ اس وقت بےحد مسکین لگ رہے تھے، بالکل بدلے ہوئے۔

''مجھے چینی کیوں نہیں دیتی ہو ذراسی،، انہوں نے نانی اماں سے کچھه ایسے لہجے میں کہا جیسے کوئی لاڈلا بچہ ضد کرکے ٹھنک رہا ہو۔

''کیونکه شہد تمہارے لئے زیادہ اچھا ہے،، نانی اماں نے بڑی پیار سے مگر بڑی مستقل مزاجی کے ساتھه کہا۔

بہت ہی ٹھنکتے اور بڑبڑاتے ہوئے نانا ابا نے چائے حلق میں انڈیلی۔

''دھیان رکھنا، مر نہ جاؤں کہیں!،،

''نہیں نہیں، فکر نہ کرو، میں دھیان دے رہی ہوں۔،،

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔ کیونکہ اس وقت اگر میں مر گیا تو سمجھو میں اپنے لئے ایک لمحہ بھی نہیں جیا — بےکار ہی جیا۔،،

''اچھا بس اب آپ لیٹ جائیے اور زیادہ باتیں نہ کیجئے۔،،

وہ ایک منٹ تک تو چپ چاپ لیٹے اپنے نیلے ہونٹ چاٹتے رہے، پھر ایک‌دم اٹھه بیٹھے جیسے کسی نے ان کے چٹکی بھر لی ہو۔

''وروارا کی ماں، دیکھو، وہ میخائل اور یاکوف کی شادی بھی تو کرنی ہے، جلد از جلد۔ ممکن ہے بیویاں آجائیں، کچھه بچے اور ہو جائیں تو ان کی وحشت کچھه گھٹے۔ کیوں؟،،

شہر میں جتنی لڑکیاں شادی کے لائق تھیں ان سب کے نام انہوں نے لینے شروع کر دئے اور میری نانی اماں خاموش بیٹھی، چائے کے گلاس پر گلاس پیتی رہیں۔ نانا ابا نے مجھکو باہر جانے

سے تو منع ھی کر رکھا تھا کہ کہیں کچھه الٹی سیدھی نہ کر بیٹھوں۔ اس لئے میں کھڑکی پر بیٹھا ڈوبتے ہوئے سورج اور مکانوں کی کھڑکیوں پر پڑتے ہوئے اس کے لال لال عکس کو دیکھه رہا تھا۔

نیچے باغ میں بھڑوں کے دل کے دل بید کی جھاڑیوں پر اڑتے پھر رہے تھے۔ پڑوس کے احاطے میں ایک بڑھئی اپنی ہتھوڑی سے کھٹ کھٹ کر رہا تھا اور قریب ھی سے مجھے دھار تیز کرنےوالی مشین کی کھچر کھچر سنائی دے رہی تھی۔ باغ کے اس پار نالے کی طرف سے گھنی جھاڑیوں میں بچوں کے کھیلنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ میرا دل بےاختیار تڑپ رہا تھا کہ میں بھی جا کر ان کے ساتھه کھیلوں اور دل‌پر عجیب سی شام کی اداسی چھائی ہوئی تھی۔

یکایک میرے نانا نے ایک کتاب نکالی، بالکل نئی کتاب۔ اپنی ہتھیلی پر اس کے ورق پھٹا پھٹ پھٹ کرنے لگے اور بڑی مسرت بھری آواز میں مجھه سے مخاطب ہوئے:

''چل بےنکمے! کیا پنکھے سے کان لئے گھوم رہا ھے۔ ادھر آ، بیٹھه یہاں، چندھی شکل! دیکھتا ھے یہ حرف؟ یہ الف ھے۔ سمجھا؟ الف سے انڈا۔ ب سے بکری۔ ج سے جہاز۔ یہ کیا ھے؟،،

''ب سے بکری۔،،

''ٹھیک! اور یہ؟،،

''ج سے جہاز۔،،

''غلط! الف سے انڈا ھے! غور سے دیکھه۔ س سے سوار۔ ی سے یکہ۔ ف سے فوارہ۔ یہ کیا ھے؟،،

''ی سے یکہ۔،،

''ٹھیک ھے! اور یہ؟،،

''س سے سوار۔،،

''شاباش! اور یہ؟،،

''الف سے انڈا۔،،

نانی بیچ میں بولیں:

''ورروارا کے ابا، آپ ذرا دیر چپ چاپ لیٹتے تو زیادہ اچھا ہوتا آپ کے لئے۔،،

''چپ رہو۔ اپنی پریشانیاں بھلانے کے لئے یہ بہترین شغل ھے میرے لئے۔ ھاں الیکسئی بیٹا، چلا چل!،،

انہوں نے اپنا گرم پسینے میں بھیگا ہوا بازو میرے گلے میں ڈال دیا اور دوسرے میں کتاب اٹھا کر تقریباً میری ناک سے لگادی۔ نانا کے جسم سے پسینے، سرکے اور پکی ہوئی پیاز کی بو آنے لگی جس سے میرا دم گھٹا جا رہا تھا۔ ایک عجیب سا اشتیاق ان پر طاری ہوگیا تھا۔ میرے کان میں چیخے:

''ل سے لومڑی! ک سے کباب!،،

یہ الفاظ تو میں نے سنے تھے لیکن حروف میں اور الفاظ میں کوئی مشابہت ہی نہ تھی۔ ل تو لومڑی کے بجائے کیڑا سا لگتا تھا، م ٹیڑھا لگتا تھا مستری گریگوری کی طرح، اور ن کی توند دیکھ کر مجھے خیال ہوتا تھا کہ میں اور نانی اماں ایک دوسرے سے لپٹے کھڑے ہیں۔ البتہ ہر حرف میں تھوڑی سی مشابہت نانا ابا کی سی ضرور لگتی تھی۔ وہ کبھی سلسلے وار کبھی بیچ بیچ میں سے پڑھ کر مجھے حروف پہچاننے کی مشق کرواتے رہے یہاں تک کہ ان کا جوش مجھ میں بھی سرائت کرگیا۔ میں بھی زور زور سے چیخنے لگا اور مجھے بھی پسینہ آنے لگا۔ ان کو یہ بات بڑی عجیب لگی اور وہ مجھ پر ہنسنے لگے، ہنسنے سے کھانسی کا ایک دورہ پڑا۔

''دیکھتی ہو وروارا کی ماں کیا فرفر سیکھ رہا ہے،، وہ اپنا سینہ اور کتاب پکڑے کھانستے ہوئے بولے۔ ''تھو... تم تو استراخان کی بلا ہو — کیا تضیع اوقات کر رہی ہو؟،،

''آپ خود تضیع اوقات کر رہے ہیں...،،

نانی اماں میز پر اپنی کہنیاں ٹکائے، دونوں مٹھیوں پر دونوں رخسار جمائے بڑے پرمذاق انداز میں ہم دونوں کو دیکھ رہی تھیں اور مجھے اپنے نانا اور نانی کو دیکھ کر بڑا مزہ آ رہا تھا۔

''اچھا اب بس کرو دونوں۔ کیوں چیخ چیخ کر کھوپڑی خالی کر رہے ہو،، وہ بولیں۔

میرے نانا بڑے دوستانہ انداز میں میری طرف مڑے اور ایسے لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوئے جیسے صفائی پیش کر رہے ہوں:

''ارے میں تو بیمار ہوں نا۔ آواز نکل نہیں رہی، اس لئے چیخ رہا ہوں۔ مگر تو کیوں چیخ رہا ہے؟،،

پھر انہوں نے اپنا پسینے سے بھیگا ہوا سر ہلایا:

''مرحومه نتالیا جو جمایا کرتی تھی نا که اس کا حافظه خراب ھے تو وہ غلط کہتی تھی۔ اس کی یادداشت تو ایسی ھے جیسے گھوڑے کی۔ ھوں، چل بے نک‌پھلے!،،

آخرکار انھوں مذاقیه انداز میں مجھے پلنگ پر سے ڈھکیلا۔

''بس، بس ھوا! اب کتاب کو چپکا رھنا۔ سمجھا؟ کل پوری ابجد یاد کرکے مجھے سنانا اور اگر سب ٹھیک سنا دیا تو پانچ کوپک انعام ملیں‌گے۔،،

جب میں نے کتاب اٹھانے کو ھاتھه بڑھایا تو انھوں نے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا اور بڑے درد سے بولے:

''ھائے تیری ماں تجھے کیوں چھوڑ کے چلی گئی بیٹے؟،،

''اچھا اچھا۔ اب رھنے دیجئے وروارا کے ابا،، نانی اماں نے ان کی بات کاٹی۔ ''ایسی باتوں سے فائدہ؟،،

''میں کبھی ذکر نه کرتا لیکن کیا کروں اس بات کے صدمے سے مجبور ھوں۔ ھائے کیا لڑکی تھی اور کیا برباد ھوئی...،،

انھوں نے جلدی سے مجھے الگ دھکیلا۔

''باھر جا، کھیل۔ مگر دیکھه گلی میں مت جانا۔ احاطے میں یا باغ میں کھیلنا۔ سمجھا؟،،

باغ میں جانے کے لئے تو مر ھی رھا تھا کیونکه مجھے معلوم تھا که جیسے ھی میں کنارے پر پھونچوں‌گا نالے پر جو لڑکے کھیل رھے تھے وہ مجھه پر پتھر پھینکیں‌گے اور میں بھی ان سے بدله لینے پر اتارو تھا۔

''وہ آ گیا پلا،، وہ لوگ مجھے دیکھتے ھی چیخنے لگے۔ ''لینا، وہ گیا،، انھوں نے جلدی جلدی حملے کا سامان اکٹھا کرتے ھوئے کہا۔ مجھے معلوم نه تھا که ''پلا،، کیا ھوتا ھے اس لئے اس نام سے ھتک محسوس نه ھوئی لیکن اتنے بہت سے دشمنوں کے مقابلے میں اپنے کو اکیلا پاکر ایک عجیب سا جوش محسوس ھورھا تھا اور اس خیال سے خوشی ھو رھی تھی که اگر ٹھیک سے نشانه لگاکے ایک پتھر بھی پھینکوں تو یه سب دشمن بھاگ کھڑے ھونگے اور جھاڑیوں کی اڑ میں گھس جائینگے۔ اس طرح کی لڑائیوں کے بعد دل میں نه تو کوئی کینه رھتا تھا نه یه خیال که کتنی چوٹ لگی۔

میں نے ابجد بہت جلد سیکھ لیا اور غالباً اسی وجہ سے اب نانا ابا میری طرف توجہ بھی زیادہ کرتے تھے اور مارتے بھی کم تھے۔ حالانکہ میرے خیال میں اب مجھ پر زیادہ ''چاٹ،، پڑنی چاہئے تھی۔ جیسے جیسے میں بڑا ہوتا گیا نانا ابا کے بنائے ہوئے سارے قاعدہ قانونوں کو توڑنے لگا۔ لیکن وہ بس یا تو مجھے جھوکتے ڈانٹتے یا مکا دکھا کر رہ جاتے۔

مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ پہلے تو انہوں نے اکثر مجھ کو بلاوجہ ہی مارا ہے اور ایک دن میں نے یہ بات ان سے کہہ دی۔

انہوں نے میری ٹھڈی کے نیچے ایک ٹھوکا دیا اور میری آنکھوں میں اپنی آنکھیں جھپکاتے ہوئے بولے:

''کیا؟،،

اور پھر دبا سا قہقہہ لگایا:

''ارے او بے ایمانٹے! تو کون ہوتا ہے یہ طے کرنےوالا کہ کتنی چاٹ پڑے تجھے؟ یہ بات تو بس میں ہی جانتا ہوں۔ دور ہو!،،

لیکن مڑا ہی تھا کہ انہوں نے میرا کندھا پکڑ لیا اور پھر میری آنکھوں میں جھانک کر دیکھا:

''کیوں بے تو چلتا پرزہ بنےگا کہ بدھو؟،،

''معلوم نہیں۔،،

''معلوم نہیں؟ تجھے معلوم نہیں تو ٹھہر میں تجھے بتاتا ہوں — چلتا پرزہ بننا! بدھو بننے سے کہیں بہتر ہے۔ بھیڑیں بدھو ہوتی ہیں، سمجھا؟ اب چل باہر بھاگ۔ کھیل جاکے...،،

جلد ہی میں حرف حرف کرکے، ہجے کرکے دعاؤں کی کتاب پڑھنے لگا۔ عام طور پر یہ کام شام کی چائے کے بعد ہوتا تھا اور ہر بار مجھے پورا وظیفہ پڑھنا پڑتا تھا۔

''م سے مرغا، ب سے بکری، الف سے انڈا، ر سے ریل، ک سے کباب — ملا کر ہوا مبارک۔ ہ سے ہرن، ی سے یکہ — ہے۔ مبارک ہے نام...،، میں ہجے کر کرکے پڑھتا جاتا اور اپنی شہادت کی انگلی سطروں کے نیچے چلاتا جاتا اور اتنا اکتا جاتا کہ ہر طرح کے بےتکے سوالات پوچھتا جاتا:

''مبارک کون ہے؟ یاکوف ماموں؟،،

''ایک جھانپڑ دونگا سر پر تب تجھے معلوم ہوگا مبارک کون ہے،، نانا غراتے ہوئے کہتے۔ لیکن مجھے پتہ چل جاتا کہ ان کا غصہ بناؤٹی تھا۔ وہ تو صرف اپنا رعب قائم رکھنے کے لئے عادتاً ھی غصہ کیا کرتے تھے اور میرا یہ خیال غلط بھی نہیں ہوتا تھا کیونکہ ایک ھی سنٹ بعد نانا ابا میرے وجود تک کو بھول جاتے اور منہ ھی منہ میں بڑبڑاتے:

''ھاں ھاں گیت گانے کو کہہ دو، بجانے کو کہہ دوتو حضرت داؤد بن بیٹھے گا اور کام کو کہو تو بھانڈ، مداری، مسخرہ!.. تھو... و... و، کیا لوگ ھیں! اور پوچھو بھلا بجانے سے کیا بنائے گا بھائی تو؟ کچھہ بھی تو نہیں۔،،

میں اپنا پڑھنا چھوڑ کر ان کی بات سننے لگتا اور سر اٹھا کر ان کے بل پڑے ہوئے پریشان چہرے کی طرف تکنے لگتا۔ ان کی سکڑی ہوئی آنکھیں دور خلا میں دیکھتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں اور ان میں ایک ایسا گہرا دکھہ بھرا ھوا نظر آتا تھا جس سے ان کی ھمیشہ چھائی رہنے والی سختی پگھلتی ہوئی سی معلوم ہوتی تھی۔ سنہری بھوئیں کپکپاتیں اور جب وہ گھبراھٹ کے عالم میں میز پر انگلیوں سے طبلہ بجانے لگتے تو رنگے ہوئے ناخن چمکنے لگتے۔

''نانا ابا!،،

''ھوں؟،،

''مجھے کہانی سنائیے ایک۔،،

وہ اپنی آنکھیں ملتے جیسے ابھی نیند سے چونکے ھوں۔

''تو اپنا سبق پڑھہ، کاھل الوجود،، وہ بڑبڑائے۔ ''بس تیرا تو یہ جی چاھتا ہے کہ دعاؤں کی کتاب چھوڑ کر پریوں کی کہانیاں سنا کرے۔،،

ویسے مجھے شک تھا کہ غالباً ان کا بھی یہی جی چاھتا تھا کہ دعاؤں کی کتاب چھوڑ کر پریوں کی کہانیاں سنیں۔ اگرچہ ان کو دعاؤں کی کتاب تقریباً زبانی یاد تھی کیونکہ انہوں نے عہد کیا تھا کہ روز رات کو سونے سے پہلے اس میں سے کچھہ دعائیں زور زور سے پڑھا کریں گے یا اس طرح گا گا کر جس طرح گرجے میں پادری صاحب مناجات پڑھا کرتے تھے۔

میں ان سے کہانی کہنے کے لئے ان کے سر ہوگیا۔ آخر کار وہ مان گئے۔

''اچھا۔ اچھی بات ہے! تجھے تو ساری زندگی ہی مناجات پڑھنی ہے مگر میں کہاں رہونگا۔ میں تو اب بہت جلدی اپنے مالک کے سامنے جانے والا ہوں جو تخت انصاف پر بیٹھا ہوگا۔،،

پھر وہ اپنی پرانی آرام کرسی کے کنگورے پر سہارا لے کر لیٹ گئے، سر پیچھے کو جھکا لیا، آنکھیں چھت سے لگالیں اور پرانے زمانے کی یاد میں کھوگئے:

''ایک بار بالاخنا میں ڈاکوؤں کا ایک گروہ سوداگر زایف کو لوٹنے کے لئے گھس پڑا۔ میرے نانا ابا کے ابا کو پتہ چل گیا اور وہ گرجے کے مینار پر چڑھ گئے تاکہ گھنٹیاں بجائیں اور لوگوں کو خبردار کریں۔ لیکن ڈاکوؤں نے ان کا پیچھا کیا اور ان کو تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے کرکے نیچے پھینک دیا۔

''میں اس وقت بالکل بچہ تھا۔ میں نے دیکھا بھی نہیں کہ یہ سب کیسے ہوا اور مجھے کچھ یاد بھی نہیں۔ جب کہ ۱۸۱۲ء میں فرانسیسی آئے تو تب سے مجھے یاد ہے کہ کیا کیا ہوا۔ اس وقت میں صرف بارہ سال کا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس وقت ایک مرتبہ لوگ تیس قیدیوں کو بالاخنا ہنکاتے ہوئے لائے تھے۔ سب چھوٹے چھوٹے، سوکھے سو کھے، جو چتھڑا وتھڑا مل گیا وہ پہنے ہوئے — فقیروں سے بدتر، بوٹی بوٹی کانپتی ہوئی، ٹھٹھرتی ہوئی۔ بعض بعض کے تو ہاتھ پاؤں ٹھٹھر کر رہ گئے تھے یہاں تک کہ وہ کھڑے بھی نہ ہو سکتے تھے۔ کسان ان کو مار ڈالنا چاہتے تھے مگر ان کے ساتھ پہرہ تھا، اس نے ایسا نہیں ہونے دیا۔ پھر گارڈ دستے سے کچھ اور سپاہی بلوائے گئے اور کسان بھاگ گئے۔ پھر سب ٹھیک ٹھاک ہوگیا۔ ہم عادی ہوگئے۔ فرانسیسی نکلے بڑے تیز اور کائیاں، بڑے خوش مزاج اور زندہ دل — کبھی کبھی گیت گانے بجانے کی محفل بھی جما دیتے۔ نیژنی سے بڑے بڑے لوگ گاڑیوں میں بیٹھ کر ان کا تماشہ دیکھنے جاتے تھے۔ جو لوگ آتے تھے ان میں سے کچھ لوگ فرانسیسیوں کو گالی دیتے اور ان پر دانت پیستے، ان کو مار بھی بیٹھتے۔ بعض لوگ ان کی ہی زبان میں ان سے نرمی سے

بات کرتے، ان کو روپئے دیتے اور ان کا دکھه کم کرنے کی کوشش کرتے - مجھے ایک بوڑھے شخص کا خیال آتا ھے - شریف اور امیر آدمی تھے - انہوں نے اپنا منه دونوں ھاتھوں سے چھپا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے - ''ذرا دیکھو تو، اس جلاد نپولین نے فرانسیسیوں کی کیا درگت بنائی ھے،، وہ کہنے لگے - ''ذرا سوچو تو ایک تو روسی — اور پھر اوپر سے امیر — اور پھر اتنا نیک دل، غیر ملکیوں پر ترس کھانے والا - ،،

ایک منٹ نانا ابا چپ رھے، آنکھیں بند کئے، وہ اپنے بالوں پر ھاتھه پھیرتے رھے - پھر آھستہ آھستہ روک روک کر اپنی بات جاری کر دی جیسے اپنی یادداشت کو دھیرے دھیرے کرید رھے ھوں -

''اس وقت برف کا طوفان آیا ھوا تھا - سردی بڑی قیامت کی تھی - فرانسیسی دوڑے آتے اور ھماری کھڑکی کے نیچے جمع ھو کر میری ماں سے گرما گرم کلچے مانگتے - وہ پھیری کرکے کلچے بیچا کرتی تھیں - میری ماں ان کو جھونپڑی کے اندر تو نہ آنے دیتیں لیکن کھڑکی میں انہیں کلچے پکڑا دیتیں - وہ کلچے جھپٹ کر اپنی قمیصوں کے اندر دبا لیتے بالکل دل میں گرم بھاپ دیتے ھوئے کلچے جو تازہ تازہ تندور سے نکلے ھوئے ھوتے - پته نہیں کیسے انہوں نے وہ سردی برداشت کی - بیچارے گرم ملک کے رھنے والے وہ یه برف کا طوفان کیا جانیں - ان میں سے بہت سے تو سردی سے مر ھی گئے - دو آدمی ھمارے حمام میں رھتے تھے، ایک افسر اور ایک اس کا ماتحت جس کا نام میرون تھا - افسر لمبا تھا اور بےحد دبلا — ھڈی چمڑا — اور وہ ایک زنانه گاؤن پہنے گھوما کرتا تھا جو اس کے گھٹنوں تک پہنچتا تھا - وہ آدمی طبیعت کا اچھا تھا لیکن بےحد شرابی - میری اماں چھپا کر بیئر بناتی اور بیچتی تھیں - وہ بیئر جریدتا اور پی کر بدمست ھوجاتا تو اپنے یہاں کے گیت گایا کرتا - ھماری زبان میں بھی اس نے شدبد سیکھه لی تھی - کہتا ''تمہارا ملک سفید نہیں - سخت ھے، کالا ھے،، - ویسے ٹوٹی پھوٹی بات کرتا تھا لیکن اس کی بات سمجھه میں آ جاتی تھی اور وہ ٹھیک بھی تھی - ھمارے ادھر شمالی حصے میں نرمی کا تو نام‌نشان نہیں - ھاں والگا سے نیچے کی طرف چلے جاؤ تو زمین کی نرمی اور گرمی بڑھتی چلی جاتی ھے اور

کیسپین کے پاس تو برف بالکل ہے ہی نہیں - یقیناً اس بات کو اس لحاظ سے اور بھی مانا جا سکتا ہے کہ انجیل مقدس میں اور تفسیروں میں کسی جگہ برف کا ذکر نہیں ہے - کیونکہ یسوع مسیح دوسرے ملک کے رہنے والے تھے... اب جیسے ہی مناجات کی کتاب ختم ہوگی ہم تم انجیل مقدس پڑھنی شروع کر دیں گے - ،،

وہ پھر خاموش ہو جاتے اور ایسا لگتا اونگھ گئے ہیں - جب ان کے ذہن میں کوئی بات جم جاتی تو وہ کھڑکی سے باہر غور سے دیکھنے لگتے، آنکھیں سکیڑ لیتے اور ان کے خط و حال میں بڑا تیکھاپن پیدا ہو جاتا -

''کہئے نا،، میں دھیمے سے اصرار کرتا -

''اچھا، ہوں - تو میں کیا کہہ رہا تھا؟ فرانسیسی ہے نا؟ ہاں تو فرانسیسی بےچارے بھی آخر انسان ہی ہیں، ہم گنہگاروں سے کوئی بدتر تو ہیں نہیں - بےچارے ''مادام، مادام،، کہتے ہوئے میری ماں کے پیچھے گھوما کرتے - ''مادام،، کے معنی ہیں ''میری خاتون،، اور وہ جو ''میری خاتون،، تھیں تو وہ اتنی بڑی ڈھائی من کی آٹے کی بوری پیٹھ پر اٹھا لیتیں اس طرح جیسے وہ چھٹانک بھر کی ہو - وہ بیل کی طرح تگڑی تھیں - میں بیس برس کا ہو گیا تھا لیکن میرے بال پکڑ کر مجھ کو پٹخنیاں دینا تو ان کے لئے کوئی بات ہی نہیں تھی - اور اس وقت میں ایسا گھسا پٹا بھی نہ تھا -

''وہ جو ماتحت افسر تھا نا میرون، اس کو گھوڑوں سے بہت محبت تھی - وہ اصطبل پھرا کرتا اور اشارے کرتا کہ مجھے گھوڑے کو صاف کرنے دو - پہلے پہل تولوگ ذرا ڈرے کہ دشمن ٹھہرا کہیں گھوڑوں کا کچھ بگاڑ نہ دے - لیکن پھر کسان اسے خود بلاتے ''اے ادھر اے میرون!،، اور وہ ہنستا اور بیل کی طرح سر جھکاکے جھٹکتا اور دوڑتا چلا آتا - اس کے بال چقندر کی طرح لال تھے، بڑی سی ناک، موٹے موٹے ہونٹ - وہ گھوڑوں کی دیکھ بھال کرنا خوب جانتا تھا اور گھوڑوں کی طرح طرح کی بیماریوں کے علاج بھی اس کو خوب آتے تھے - بعد میں نیژنی میں گھوڑوں کی دیکھ بھال پر نوکر ہو گیا تھا - وہیں اس کا دماغ خراب ہوگیا اور پھر آگ بجھانے والوں نے اس کو مارتے مارتے مار ڈالا - اور وہ جو افسر

تھا تو جب بہار کا موسم آیا تو اس پر ڈوبنے کی اور بجھنے کی سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ گھلنے لگا اور جب سینٹ نکولائی کا دن آیا تو بڑی خاموشی کے ساتھہ اس دنیا سے اٹھہ گیا۔ حمام کی کھڑکی کے پاس بیٹھا کسی خیال میں کھویا ہوا تھا اور بس اسی طرح کھڑکی پر سر رکھے رکھے مر گیا۔ مجھے اس کی موت پر رنج ہوا تھا یہاں تک کہ میں نے دو چار آنسو بھی بہا ڈالے تھے۔ بڑی اچھی طبیعت کا آدمی تھا وہ۔ میرا کان پکڑتا اور اپنی زبان میں نہ جانے کیا پھس سے میرے کان میں کہتا۔ اس کے الفاظ میری سمجھہ میں تو نہیں آتے تھے لیکن مجھے اچھے لگتے تھے۔ اس دنیا میں انسانیت اور نیکی کون سے بازار میں بکتی ہے بھلا؟ ایک دفعہ اس نے مجھے اپنی زبان سکھانی شروع کی تھی لیکن میری ماں نے منع کر دیا بلکہ وہ مجھے پادری صاحب کے پاس لے گئیں اور انہوں نے مجھے پٹوایا بھی اور اس افسر کی شکایت بھی پولیس سے کر دی۔ لوگ اس زمانے میں بڑے سخت ہوا کرتے تھے بھیا۔ جو کچھہ ہم نے بھگتا وہ تم کیا بھگتو گے — تمہارا بھگتان تو دوسرے بھگت چکے ہیں! اب مجھے ہی دیکھو۔ اف، میں نے کیا کیا بھگتا...،،

رات کا اندھیرا بڑھتا جاتا۔ میرے نانا ابا بھی جیسے رات کے ساتھہ ساتھہ پھیلتے جاتے اور ان کی آنکھیں بلی کی آنکھوں کی طرح چمکتیں۔ وہ آہستہ آہستہ، احتیاط کے ساتھہ، بدبدا کے اپنی داستان کہتے جاتے۔ لیکن جب وہ اپنے متعلق بات کرتے تو جوش سے بھر جاتے اور خوب اتراتے۔ جب وہ اپنے بارے میں بات کرتے تو مجھے اچھا نہ لگتا۔ مجھے ان کی بار بار کی نصیحت بری لگتی:

''یاد رکھنا اسے! اسے بھولنا مت!،،

انہوں نے مجھے ایسی بہت سی باتیں بتائی تھیں جو میں بھول ہی جاتا تو اچھا ہوتا۔ ان باتوں کے متعلق نانا ابا نے مجھے یاد رکھنے کی نصیحت نہیں کی تھی، لیکن وہ باتیں پھانس کی طرح میرے دماغ میں چبھی رہیں۔ میں نے تو دیکھہ ہی لیا تھا کہ سوالات کرنے سے وہ چڑتے تھے، اس لئے میں جان بوجھہ کر سوال کیا کرتا:

''کون لوگ بہتر ہوتے ہیں — روسی یا فرانسیسی؟،،

''کون کہہ سکتا ہے؟ میں نے فرانسیسیوں کو ان کے دیس

میں تو دیکھا نہیں۔،، پھر جھنجھلا کے کہتے ''ہاں، مگر اپنے بل میں تو چوہا بھی ٹھیک ہی طرح سے رہتا ہے۔،،

''تو کیا روسی ٹھیک ہوتے ہیں؟،،

''بعض ہوتے ہیں، بعض نہیں بھی ہوتے۔ جب تک یہ لوگ رعیت اور آسامی تک تھے تب تک ٹھیک تھے، جیسے سڑا ہوا لوہا ہوتا ہے نا۔ اب پاؤں کی زنجیریں تو ٹوٹ گئی ہیں لیکن کھانے کو کچھہ نہیں ہے۔ میاں لوگ جو ہیں وہ ہوتے تو ہیں بڑے سنگ دل مگر ان کو عقل کسان سے زیادہ ہوتی ہے۔ پتہ نہیں، ہر ایک کے بارے میں یہ کیسے کہہ سکتے ہیں۔ ہاں جب کوئی امیر آدمی شریف ہوتا ہے تو پھر وہ خوب شریف ہوتا ہے اور بعض حد سے زیادہ احمق بھی ہوتے ہیں، بورے کی طرح جو دل چاہے بھر دو۔ لیکن ہم لوگوں میں سے تو زیادہ تر کے بھیجے خالی ہوتے ہیں۔ پہلی نظر میں اوپر سے دیکھو تو انسان جیسے لگتے ہیں لیکن قریب جا کر دیکھو تو پتہ چلتا ہے کہ کیڑوں نے سارا گودا کھا لیا ہے۔ کچھہ نہیں بچا۔ بس صرف خول ہے۔ ہم لوگوں کو اصل میں ذرا پڑھنے لکھنے کی ضرورت ہے جس سے ہماری عقل ذرا تیز ہو۔ لیکن بس یہی ہے کہ آخر عقل تیز ہو تو کس بل پر...،،

''کیا روسی مضبوط ہوتے ہیں؟،،

''ہاں۔ بعض ہوتے ہیں۔ لیکن صرف مضبوطی سے کچھہ نہیں ہوتا، اصل چیز سمجھداری ہے۔ مضبوط ہونے کو تو گھوڑا بڑے سے بڑے پہلوان سے بھی زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔،،

''لیکن فرانسیسی ہم لوگوں سے لڑے کیوں؟،،

''دیکھو بھئی۔ اب جنگ جو ہے تو وہ تو ہے زار کا معاملہ۔ ہم جیسے سیدھے سادے غریب انسانوں کو یہ سب سمجھنے کی کیا ضرورت ہے کہ کیوں!،،

لیکن جب میں نے نانا ابا سے پوچھا کہ بوناپارٹ کون تھا اور انہوں نے مجھے جو جواب دیا کبھی نہیں بھولونگا:

''وہ ایک بہادر آدمی تھا جو ساری دنیا کو فتح کرنا چاہتا تھا تاکہ سب لوگ برابری کی زندگی بسر کریں۔ بس نہ حاکم ہوں، نہ افسر ہوں۔ سب ایسے ہی رہیں — برابر سے! سب کے نام الگ

الگ ہوں مگر حقوق سب کے برابر ہوں - اور سب کا ایک ہی مذہب ہو ۔ یہ البتہ ذرا بےوقوفی کی بات ہے - صرف کیڑے مکوڑے ایک سے برابر ہوتے ہیں - یہاں تک کہ مچھلیوں کو لے لو — وہ تک مختلف ہوتی ہیں - سامن مچھلی چھوٹی مچھلیوں کی دوست نہیں ہوتی اور شارک مچھلی کی چھوٹی ہیرنگ مچھلیوں سے کبھی نہیں بنتی - ویسے ہمارے اپنے بھی ایک سے ایک بوناپارٹ تھے - مثلاً استیپان رازین اور ایمیلیان پوگاچیوف - لیکن ان لوگوں کے بارے میں تمہیں پھر کبھی بتاؤنگا...،،

کبھی کبھی وہ اس طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگتے جیسے انہوں نے پہلے کبھی مجھہ کو دیکھا ہی نہ ہو - مجھے اس وقت بڑی کوفت ہوتی -

لیکن وہ میرے والد کا ذکر یا میری ماں کا ذکر کبھی نہیں کرتے -

کبھی کبھی نانی اماں بھی ان باتوں میں شامل ہو جاتیں - خاموشی سے وہ ایک کونے میں بیٹھہ جاتیں اور کچھہ نہ بولتیں - پھر یکایک اپنی نرم محبت بھری آواز میں بول اٹھتیں:

''ورروارا کے ابا، یاد ہے وہ زمانہ کتنا اچھا تھا جب ہم تم مل کر موروم گئے تھے؟ کنواری مریم کی زیارت کرنے اور دعا مانگنے - کون سا سن تھا؟،،

''ٹھیک سے تو یاد نہیں - مگر جب ہیضہ پھیلا تھا اس سے کچھہ پہلے ہی کی بات ہے - اسی سال تو حکومت نے اولنچانوں کی تلاش میں جنگل چھان مارا تھا - ،،

''ہاں ہاں ٹھیک ہے - مجھے یاد ہے کہ ہم لوگ کس قدر ان سے خوفزدہ تھے - ،،

''ہوں - ،،

میں نے فوراً سوال کر دیا کہ اولنچان لوگ کون تھے اور وہ جنگلوں میں کیوں چھپے تھے - نانا ابا نے رک رک کر جواب دیا:

''اولنچان بس کسان تھے، آسامی تھے جو فیکٹریوں سے بھاگ نکلے تھے - ،،

''تو وہ لوگ پکڑے کیسے گئے؟،،

''تمہارا کیا خیال ہے کیسے؟ بس ایسے ہی جیسے لڑکے کھیلتے ہیں - کچھ بھاگتے ہیں - کچھ ان کو پکڑتے ہیں - اور ایک مرتبہ جو پکڑا جاتا ہے پھر اس کو ''چاٹ،، ملتی ہے، چابکوں اور لاٹھیوں سے - ناک پھٹ پھٹ جاتی تھی اور ان کے ماتھے پر داغ لگا دیا جاتا تھا جس سے معلوم ہو جاتا تھا کہ وہ سزا یافتہ ہیں - ،،

''مگر کیوں؟،،

''کون جانے - یہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے - اور یہ بھی کہنا مشکل ہے کہ غلطی پر کون تھا — وہ جو بھاگتے تھے یا جو پکڑتے تھے - ،،

نانی پھر بیچ میں بول پڑتیں ''یاد ہے ورواراکے ابا، وہ بڑی آگ جو لگی تھی اس کے بعد...،،

''کون سی والی بڑی آگ؟،، نانا ابا نے ٹھیک معلوم کرنے کے لئے ذرا سختی سے پوچھا -

اپنی یادوں میں کھوئے ہوئے وہ میرے وجود سے بے خبر ہو گئے - ان کی آواز آهسته آتی رہی اور کچھ ایسے ترنم کے ساتھ جس سے کبھی کبھی لگتا جیسے وہ کوئی گیت گا رہے ہوں — ایک درد بھرا گیت جس میں آگ لگنے کا اور بیماریوں کا، انسانوں کے زد و کوب کا، اتفاقی موت کا اور دھوکہ بازیوں کا، مذہبی جنون اوز بدمزاج چڑچڑے امیروں کا ذکر تھا -

''آہ، ہم نے کیا کچھ دیکھا! ہم پر کیا کچھ گذر گئی!،، نانا آهسته آهسته کہتے -

''لیکن ایسی بری بھی نہیں گذری،، نانی اماں کہتیں - ''یاد کرو وہ موسم بہار کتنا اچھا تھا جس سال وروارا پیدا ہوئی!،،

''سن ۱۸۴۸ء کا ذکر ہے - جس سال ہنگری پر حملہ ہوا تھا ہم نے وروارا کا بپتسمہ کیا تھا - اسی دن تو وہ اس کے دینی باپ تیخون کو پکڑ لے گئے تھے - ،،

''اور پھر کبھی اسے واپس آنا نصیب نہ ہوا،، نانی اماں نے آہ بھرکے کہا -

''وہ کیا واپس آتا! اور اسی دن سے خدا کی برکت ہمارے گھر سے اس طرح اڑ گئی جیسے چھلنی سے پانی گر جاتا ہے - آہ، وروارا...،،

7*

''بس کرو وروارا کے ابا۔ ''

''کیوں، بس کیوں کروں؟'' انہوں نے غصے میں بھر کے جواب دیا۔ ''اب تم کچھ ھی کہو مگر ھماری اولاد نالائق نکلی۔ ھم اور تم تو سمجھے تھے کہ ھم ایک مضبوط ٹوکرے میں سامان اکٹھا کر رھے ھیں لیکن خدا نے یہی مناسب سمجھا کہ ھمارے ھاتھہ میں ایک چھلنی پکڑا دے...''

وہ اس طرح چیخنے لگے جیسے ان کو کسی نے داغ دیا ھو اور اٹھہ کر کمرے بھر میں دوڑتے ھوئے آھیں بھرنے اور اپنی اولاد کو کوسنے پیٹنے لگے۔ ساتھہ ھی وہ نانی اماں کو مکے دکھاتے جاتے۔

''اور یہ سب تمہارے لاڈ پیار کا نتیجہ ھے۔ چڑیل! تم... تمہارے لاڈ پیار سے یہ سب برباد ھوئے۔''

اور پھر ان کی تلخی یہاں تک بڑھی کہ وہ مقدس شبیہوں والے کونے میں پہونچ گئے اور وھاں کھڑے ھو کر اپنے کھنکھڑ سینے کو پیٹ پیٹ کر رونے لگے:

''آہ خدا، اے خدا! آخر میں نے کسی سے کیا زیادہ گناہ کیا ھے؟''

ان کی نمناک آنکھیں غم و غصے سے چمک رھی تھیں۔ سارا جسم کانپ رھا تھا۔

نانی اماں اندھیرے میں خاموش بیٹھی اپنے سینے پر صلیب کا نشان بناتی رھیں۔ آخر کار اٹھہ کر نانا ابا کے نزدیک گئیں۔

''کیوں اپنی جان دئے دے رھے ھو آخر'' انہوں نے منت بھرے لہجے میں کہا۔ ''خدا اپنی مصلحت خوب جانتا ھے۔ اوروں کی اولادیں بھی ھماری اولاد سے کچھہ بہتر نہیں ھیں۔ ھر جگہ یہی حال ھے۔ لڑائی، جھگڑا، ٹنٹا، فساد۔ ماں باپ کو اپنے گناہ اپنے ھی آنسوؤں سے دھونے پڑتے ھیں۔ تم ھی ایک اکیلے نہیں ھو۔''

کبھی کبھی تو نانا کو ان کی باتوں سے تسلی ھو جاتی۔ تھکے ھارے وہ بستر میں سڑک جاتے اور میں اور نانی اماں اپنی دوچھتی میں پناہ لیتے۔

لیکن ایک بار وہ نانا ابا کو سلجھانے چلیں تو زن سے گھوم کر

ایک زور کا مکا انہوں نے نانی اماں کے منہ پر دھر دیا۔ نانی اماں لڑکھڑائیں اور اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ جب ذرا ہوش و حواس ٹھیک ہوئے تو نہایت مطمئن اور جمی جمائی آواز میں بولیں:

''بے وقوف...،،

اور یہ کہہ کر نانا کے قدموں کے پاس خون تھوک دیا۔ نانا نے اپنے دونوں ہاتھ سر سے بھی اوپر اٹھا لئے اور دو مرتبہ زور زور سے چیخے:

''نکل جا ورنہ میں تیری جان لے لونگا!،،

نانی اماں دروازے کی طرف جاتے ہوئے پھر بولیں ''بےوقوف،،۔ نانا ابا ان پر ٹوٹے لیکن وہ آہستہ سے چوکھٹ پار کر گئیں اور دروازہ دھڑام سے نانا ابا کے منہ پر لگا۔

''کھوسٹ بڑھیا،، نانا ابا پھنکارے۔ ان کا چہرہ انگارے کی طرح سرخ تھا۔ دروازے کے پاکھے کو پکڑے ہوئے وہ اسے ناخنوں سے کھرچ رہے تھے۔

میں تندور پر بیٹھا تھا، مردے سے بدتر، اور مجھے اپنی نگاہوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ آج پہلی مرتبہ نانا ابا نے نانی کو میری موجودگی میں مارا تھا اور مجھے اس بات سے اس قدر نفرت پیدا ہو رہی تھی کہ اس نفرت کے بوجھ سے میرا وجود کچلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ان کی اس حرکت سے ان کے کردار کا ایک ایسا رخ اجاگر ہوا جس کے لئے کوئی سبب یا علت پیش نہیں کی جا سکتی اور جس سے میرا دل بوجھل ہو گیا تھا۔ اب تک وہ وہیں کھڑے تھے دروازے کے پاکھے کو پکڑے لٹکے ہوئے۔ ان کا وجود سکڑ سا گیا تھا اور اس پر ایسی سفیدی چھائی جا رہی تھی جیسے راکھ یا بھبھوت مل دیا گیا ہو۔ یکایک وہ بیچوں بیچ کمرے میں پہونچے، گھٹنوں کے بل گر پڑے اور رینگتے ہوئے آگے بڑھے اپنے ہاتھوں کا سہارا لئے۔ پھر سیدھے کھڑے ہوئے اور دونوں ہاتھوں سے ماتم کرنے لگے: ''اے خدا۔ اے خدا۔،،

میں جلدی سے تندور سے پھسلا اور باہر بھاگا۔ اوپر میری نانی ادھر ادھر ٹہلتی ہوئی کلیاں کرتی جا رہی تھیں۔

''درد ہو رہا ہے؟،،

7—1705

وہ کونے میں گئیں اور بالٹی میں کلی کرتے ہوئے سکون کے ساتھہ بولیں :

"سب ٹھیک ہے ۔ دانت میرے سب سلامت ہیں ۔ بس ہونٹ ذرا سا کٹ گیا ہے ۔"

"نانا ابا نے ایسا کیوں کیا؟"

وہ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بولیں :

"بس غصہ آ گیا — اور کیا؟ کیا کریں وہ بھی — بوڑھے آدمی ہیں اور پھر اتنی مصیبتیں... تم چھوڑو یہ سب ۔ جاؤ سوؤ ۔"

میں نے ان سے کچھہ اور پوچھا لیکن وہ غیر متوقع سختی سے بولیں :

"سنا نہیں میں کیا کہہ رہی ہوں؟ جاؤ بستر پر ۔ عجب بے کہا لڑکا ہے ۔"

وہ کھڑکی کے پاس بیٹھہ گئیں اور اپنا ہونٹ چوس چوس کے بار بار رومال سے پونچھتی رہیں ۔ میں کپڑے بدلتا جاتا تھا اور کنکھیوں سے ان کو دیکھتا جاتا تھا ۔ ان کے سر کے بالکل اوپر رات کے تاریک آسمان کے ایک چو کھونٹے ٹکڑے میں ستارے چھٹکے ہوئے دکھائی دے رہے تھے ۔ باہر بھی تمام سناٹا تھا ۔ اندر بھی تمام تاریکی تھی ۔

جب میں بستر پر لیٹ گیا تو وہ میرے پاس آئیں اور آہستہ آہستہ میری پیشانی سہلانے لگیں ۔

"سو بیٹا ۔ تجھے چین کی نیند آئے ۔ تو میرے لئے کیوں دکھی ہو میرا کبوتروبوتر ۔ اس میں بہت کچھہ میری ہی غلطی ہے ۔ سو رہ!"

انہوں نے مجھے بوسہ دیا اور باہر چلی گئیں — مجھہ پر ایک ایسی اداسی چھا گئی کہ دم گھٹنے لگا ۔ میں اپنے چوڑے، نرم اور گرم گرم بستر سے اٹھہ بیٹھا اور کھڑکی سے نیچے جھانک کر سونی گلی کو بڑی دیر تک تکتا رہا — ناقابل برداشت درد سے میرا دل جیسے سن ہو گیا تھا ۔

زندگی پھر ایک خواب پریشاں بن گئی۔

ایک روز شام کو چائے کے بعد میں اور نانا ابا مناجات پڑھ رہے تھے اور نانی اماں برتن دھو رہی تھیں۔ یاکوف ماموں دندناتے بھاگتے کمرے میں گھس آئے۔ ان کی حالت بگڑی ہوئی تھی اور ایسا ھانپ رہے تھے جیسے گھوڑوں کے ساتھ دوڑنے والے سائیس۔ انہوں نے اپنی ٹوپی زور سے کونے میں پھینکی اور بغیر سلام دعا کے عجب وحشیانہ طریقے سے اشارے کر کرکے کہنے لگے:

''ابا، میخائل بپھر پڑا ہے۔ اس نے میرے یہاں کھانا کھایا اور پھر خوب خوب پی۔ یہاں تک کہ اس کا دماغ چل گیا۔ برتن توڑ ڈالے اور ایک گاھک کا ایک اونی لباس پھاڑ ڈالا۔ مجھ کو اور مستری جی کو گالیاں دیں، وہ یہاں بھی آ رہا ہے۔ قسم کھا رہا تھا کہ آپ کو پکڑے گا۔ کہتا تھا ''ابا کی داڑھی کا ایک ایک بال اکھاڑ لونگا،، اور چیخ چیخ کے کہہ رہا تھا ''میں اسے جان سے مار ڈالوں گا،،۔ ذرا ھشیار رہے گا۔،،

نانا ابا میز پر جھکے، پھر آہستہ آہستہ اٹھ کھڑے ہوئے، سر اتنا جھکا ہوا تھا کہ ناک سے مل گیا تھا اور ان کا پورا چہرہ خم کھائی ہوئی کلھاڑی کی طرح لگتا تھا۔

''سنتی ہو ورواراکی ماں؟،، انہوں نے اپنی چین چین کرتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اب کیا کہتی ہو؟ کیوں؟ اپنے باپ کو جان سے مار ڈالنے کے لئے آ رہا ہے! یہ ہے تمہارا بیٹا۔ اچھا بھائی! اب وقت آ گیا، وقت آ گیا لوگو۔،،

انہوں نے اپنے کندھے سیدھے کر لئے اور کمرے میں ادھر ادھر ٹہلنے لگے۔ پھر دروازے کے نزدیک گئے اور اس کی بھاری کنڈی چڑھا دی۔ یاکوف ماموں کی طرف مڑتے ہوئے وہ بولے:

''تو تم دونوں اب تک ورواراکے جہیز پر قبضہ کرنے کا ارادہ کئے ہوئے ہو۔ لیکن تمہیں یہ ملے گا — یہ!،، اور انہوں نے یاکوف ماموں کی ناک کے نیچے ہاتھ لے جا کر ٹھینگا دکھایا۔

یاکوف ماموں پیچھے کو اچھلے اور خفگی کے لہجے میں بولے:

''تو آپ مجھه پر کیوں ٹوٹے پڑتے ھیں ابا؟،،
''تم؟ ارے میں تمہیں بھی خوب جانتا ھوں!،،
نانی اماں نے جلدی جلدی پرچ پیالیاں الماری میں بند کرنی شروع کیں مگر بولیں کچھه نہیں۔
''میں تو آپ کو بچانے آیا۔،،
نانا طنز سے ھنسے:
''اچھا... آ... آ... یه بھی خوب رھی! شکریه بیٹا، شکریه! وروارا کی ماں ذرا دینا اس لوںڑی کو کوئی چمٹا یا بیلن! اور تم یاکوف واسیلیوچ جیسے تمہارا بھائی دروازہ توڑے تم اس کو پکڑا دینا که میرا سر توڑ ھی دے!،،
یاکوف ماموں نے جیبوں میں ھاتھه ڈال لئے اور ایک طرف کو ٹیڑھے ھوکر بولے:
''اچھا اگر آپ میری بات کا یقین نہیں کرتے تو...،،
''یقین؟ تمہارا؟،، نانا ابا چیخے۔ اور زور سے زمین پر پاؤں پٹخا۔ ''مجھے ایک بلی کا یقین آ سکتا ھے، چوھے کا یقین آ سکتا ھے، کنگارو کا یقین آ سکتا ھے — لیکن تمہارا نہیں! تم ھی نے اس کو شراب پلائی ھوگی، تم ھی نے اس کو بھڑکایا ھوگا! میں خوب جانتا ھوں۔ چلو اب اس کو پیٹو! کر لو فیصله — وہ زندہ رھے که میں...،،
نانی اماں مجھه سے دھیرے سے بولیں:
''اوپر دوڑ جا اور کھڑکی سے دیکھتے رہ۔ جیسے ھی میخائل نظر آئیں فوراً آکے بتانا! جلدی جا، جلدی۔،،
میں اوپر چڑھا اور کھڑکی پر جم کے بیٹھه گیا۔ دل میں تھوڑا سا تو خوف محسوس ھو رھا تھا که اب دیکھو ماموں غصے میں بھرے ھوئے آتے ھیں تو کیا کرتے ھیں اور تھوڑا سا فخر که ان پر نگاہ رکھنے کی اھم ذمہ‌داری میرے سپرد کی گئی ھے۔ چوڑی گلی مٹی سے بھری ھوئی تھی اور کہیں کہیں سے گرد و غبار سے پتھروں کے گول سرے نکلے ھوئے تھے۔ بائیں طرف کو گلی دور تک بڑھتی چلی گئی تھی اور نالے سے گذرتی ھوئی استروژنیا چوک تک پہونچتی تھی۔ اس چوک کی نرم چکنی مٹی میں پرانے جیل خانے کی بھوری عمارت کھڑی

تھی جس کے چار اونچے اونچے برج تھے۔ اس بھاری بھر کم عمارت سے ایک عجیب قسم کی اداس خوبصورتی پھوٹتی تھی۔ داھنی طرف کو ھمارے مکان سے تین مکان چھوڑ کر یہ گلی سینمایا چوک میں نکلتی تھی اور اس کے کنارے کنارے قیدیوں کی زرد زرد بارکیں تھیں اور وہ برج دیدے پھاڑے رھتا۔ اس مینار پر ایک چوکیدار اس طرح گول گول گھوما کرتا تھا جیسے زنجیر میں بندھا ھوا کتا۔ بہت سے جوھڑ بھی تھے جن میں سے ایک میں سبز کائی پڑی ھوئی تھی اور اسی کے داھنی طرف دیو کوف تالاب تھا۔ اور یہی وہ جگہ تھی جہاں میری نانی اماں کہتی تھیں کہ میرے ماموں میرے باپ کو جاڑے میں ڈبو کر مارنا چاھتے تھے۔ ھماری کھڑکی کے بالکل سامنے ایک پتلی سی گلی کٹتی تھی جس میں پچرنگے گھروں کی قطاریں تھیں۔ یہ گلی ایک گرجے پر ختم ھوتی تھی جو ''تین ولیوں کا گرجا،، کہلاتا تھا، بھاری سی، بھدی سی عمارت جو زمین پر دبکی ھوئی سی لگتی تھی۔ اگر کھڑکی سے سیدھی نظر دوڑاؤ تو سبز باغوں کے بیچ میں یہ سرخ سرخ چھتیں الٹی ھوئی کشتیوں کی طرح تیرتی ھوئی معلوم ھوتی تھیں۔

ھماری گلی کے مکانات طویل جاڑوں کی ھواؤں کے مارے ھوئے، خزاں کی بے شمار برساتیں کاٹے ھوئے گردآلود ایک دوسرے سے سٹے ھوئے اس طرح کھڑے تھے جیسے کسی گرجے کے برآمدے میں فقیروں اور بھیک منگوں کی بھیڑ۔ ان کی کھڑکیاں باھر کو نکلتی ھوئی پھٹے دیدوں کی طرح جھانکتی معلوم ھوتیں جیسے ان کو بھی میری طرح کسی کا یوں ھی انتظار تھا۔ جو لوگ نظر آتے وہ اتنا آھستہ آھستہ سوچتے ھوئے چلتے جیسے تندور پر رینگتے ھوئے تل چٹے۔ کھڑکی کے نزدیک ایک گرم بھپکا سا اٹھنے لگا جس سے دم گھٹنے لگا۔ بھپکے کے ساتھ ساتھ سموسوں کی بو تھی جن سے گاجر اور بہاروالی پیاز بھری جاتی ھے۔ آج تک مجھ سے یہ بو برداشت نہیں ھوتی۔

سامنے جو منظر تھا وہ اور بھی دم نکالے دیتا تھا۔ ایک عجیب طرح کا نا قابل برداشت بوجھ دل پر بڑھتا جاتا تھا جیسے سینے میں پگھلا ھوا سیسہ بھر گیا ھو جو اس طرح میری پسلیوں اور سینے سے ٹکرا رھا ھے کہ میں بلبلے کی طرح ادھر ادھر تیر رھا ھوں اور اس

چھوٹے سے کمرے میں میرا وجود سما نہیں رہا ہو، اس چھوٹے کمرے میں جس کی چھت تابوت کی طرح چھاتی پر رکھی ہو۔

یکایک مجھے دکھائی دیا کہ پتلی گلی میں جو مٹیالے رنگ کا مکان ہے اس کی آڑ سے میخائل ماموں کھڑے جھانک رہے ہیں۔ انہوں نے اپنا ٹوپا آنکھوں پر جھکا لیا تھا جس سے ان کے دونوں کان دونوں طرف نکل آئے تھے۔ ایک اٹنگا سا کتھئی کوٹ پہنے تھے اور گھٹنوں تک کے جوتے جو دھول سے اٹے ہوئے تھے۔ ایک ہاتھ اپنی چار خانہ دار پتلون میں ڈالے ہوئے تھے اور دوسرے سے وہ اپنی داڑھی پکڑے ہوئے تھے۔ مجھے ان کی صورت تو نہیں دکھائی دے رہی تھی مگر وہ اس طرح کھڑے تھے جیسے ابھی جست بھر کر اچھلینگے اور سیاہ بالوں سے بھرے ہوئے چنگل نانا ابا کے مکان کے کلیجے میں گڑودیں گے۔ مجھے چاہئے تھا کہ فوراً نیچے بھاگتا اور سب کو خبر کر دیتا کہ میخائل ماموں آ گئے ہیں لیکن میں کھڑکی سے الگ ہی نہ ہو سکا۔ میں نے دیکھا کہ انہوں نے اس طرح دبے پاؤں گلی پار کی جیسے انہیں خطرہ ہو کہ کہیں ان کے جوتوں میں مٹی نہ لگ جائے۔ اور پھر نیچے شراب خانے سے میں نے دروازہ کھلنے کی چرچراہٹ اور گلاسوں کی جھنکار سنی۔ میں ایک دم نیچے بھاگا اور اپنے نانا ابا کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

''کون ہے؟،، انہوں نے غرائی ہوئی آواز میں بغیر دروازہ کھولے ہوئے پوچھا۔ ''تم؟ اچھا! کیا کہتے ہو؟ شراب خانے میں گیا ہے؟ اچھی بات ہے۔ تم جہاں سے آئے ہو وہاں جاؤ واپس!،،

''مجھے ڈر لگ رہا ہے۔،،

''کیا کیا جائے! کوئی چارہ نہیں۔،،

میں واپس ہوا۔ رات کا اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ گلی میں گرد و غبار اور زیادہ گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ کھڑکیوں پر چکنی چکنی زرد زرد روشنیاں نمودار ہو گئی تھیں، گلی کے سامنے والے مکان سے تاروں والے کسی باجے کے بجنے کی دردناک دلربا آواز آ رہی تھی۔ شراب خانے میں کوئی گا رہا تھا۔ جب بھی دروازہ کھلتا تو مجھے ایک تھکی ہوئی شکستہ آواز سنائی دیتی جو مجھے معلوم تھا کہ نکی‌توشکا کی ہے — ایک بوڑھا دڑھیل فقیر جس کی بائیں آنکھ بالکل

سجی ہوئی تھی اور داھنی آنکھ جلتے ہوئے انگارے کی طرح سرخ تھی۔ دروازہ پھٹ سے بند ہو جاتا اور اس کی گاتی ہوئی صدا اس طرح کٹ جاتی جیسے کسی نے کلھاڑی مار دی ہو۔

میری نانی اماں کو اس فقیر پر بڑا رشک آیا کرتا تھا جب بھی وہ اس کی آواز سنتیں۔

''ھائے یہ کتنا خوش نصیب ھے کہ اس کو اتنے بہت سے اچھے اچھے گانے یاد ھیں،، وہ کہتیں۔

کبھی کبھی وہ اس کو اپنے احاطے میں بلا لیتیں، وہ اپنی چھڑی پر جھک کر برآمدے میں بیٹھ جاتا، گانے لگتا، شعر پڑھنے لگتا۔ میری نانی اماں اس کے قریب ھی بیٹھ جاتیں اور کبھی کبھی بیچ میں سوال پوچھ کر اس کو ٹوکتیں:

''کیا تمہارا مطلب ھے کہ پاک اور مقدس کنواری بی بی ریازان میں بھی آتی تھیں؟،،

''ھاں ھاں، وہ تو تمام جگھوں پر آتی تھیں، تمام علاقوں میں،، وہ بڑے یقین اور اعتماد سے جواب دیتا۔

پھر ایسا لگنے لگا جیسے گلی رفتہ رفتہ تھکتی جا رھی ھے۔ ایک ان دیکھی تھکن اس پر چھاتی جا رھی ھے اور یہ تھکن مجھ پر بھی طاری ھونے لگی۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ کاش نانی اماں آ جائیں! نانا ابا ھی آ جائیں۔ میرے والد آخر کس قسم کے آدمی تھے کہ میرے ماموؤں اور نانا کو ان سے اتنی نفرت تھی اور گریگوری اور نانی اماں اور ایوگینیا بوا ان کی اتنی تعریفیں کرتی تھیں؟ اور میری اماں کہاں ھیں، کہاں ھیں؟

ادھر مجھے اپنی ماں کی بہت زیادہ یاد آنے لگی تھی اور مجھے ایسا لگتا تھا جیسے وہ نانی اماں کے تمام قصوں اور وارداتوں کی ھیروئن ھوں۔ اور اس واقعہ نے کہ وہ اس خاندان کے ساتھ رھنا نہیں چاھتی تھیں ان کو میری نظروں میں اور بھی بلند کر دیا تھا۔ مجھے ایسا لگتا کہ وہ کسی سرائے وغیرہ میں ڈاکوؤں کے کسی گروہ کے ساتھ رھتی ھونگی اور وہ لوگ امیروں کو لوٹتے ھونگے اور مال غنیمت غریبوں میں تقسیم کرتے ھونگے۔ یا شاید جنگل میں کسی کھوہ میں رھتی ھوں، نیک دل ڈاکوؤں کے کسی گروہ کے ساتھ، جن

کے لئے وہ کھانا پکاتی ہونگی اور روپیوں کی حفاظت کرتی ہونگی۔ یہ بھی خیال آتا تھا کہ وہ دنیا میں ساری ساری پھرکے ''ڈاکو شہزادی،، اینگالیچیوا کی طرح ساری دنیا کی دولت تلاش کرتی پھرتی ہونگی۔ ان کے ساتھہ کنواری مریم ہونگی اور ان سے کہتی رہتی ہونگی:

زمین کا سونا چاندی لوٹنا
اے لالچی تجھے زیب نہیں دیتا،
اے ہوس کی پتلی تیرے لئے یہ کب مناسب ہے
کہ زمین کے خزانوں کے نیچے تو اپنی بیحیائی کو چھپائے

اور میری ماں ''ڈاکو شہزادی،، کے لفظوں میں جواب دیتیں:

اے پاکباز کنواری مجھے بخش دے
اور میری گنہ گار روح پر رحم کر
کہ میں یہ لوٹ کھسوٹ اپنے لئے نہیں کرتی
بلکہ اپنے دل کے ٹکڑے اپنے بیٹے کی خاطر!

اور کنواری مریم جو میری نانی اماں کی طرح نیک دل ہونگی ان کو معاف کر دیتی ہونگی اور کہتی ہونگی کہ:

اے بدبخت عورت اے وریوشکا
اے ناقابل اصلاح تاتاری
اگر مجبوری ہے تو جا اپنے راستے پر
اپنا راستہ طے کر اور اپنے دن سیاہ کر
لیکن اس روسی سرزمین کے لوگوں کو ھاتھہ نہ لگا
کسی جنگلی راستے پر کسی موردوین کو کوڑے لگا
یا میدانوں کی تاریکیوں میں کسی کالمک کو قتل کردے!

میں ان داستانوں کی یاد میں اتنا کھو گیا تھا کہ جیسے خواب دیکھہ رہا ہوں۔ میں خواب سے یکایک جھنجھوڑ کر اٹھا دیا گیا کیونکہ نیچے کمرے سے اور احاطے سے دھڑادھڑ کی اور چیخنے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ نیچے جو جھانکا تو دیکھا کہ نانا ابا اور یاکوف ماموں اور عجوبہ سا آدمی میلیان جو شراب خانے کا ملازم تھا،

میخائل ماسوں کو باھر گلی میں دھکیل رہے ھیں۔ وہ لڑتے ہوئے باربار اندر گھسنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن وہ لوگ ان کو لاتیں مار رہے تھے اور ان کے بازوؤں، پیٹھ اور کندھوں پر خوب پٹائی ھو رہی تھی۔ آخر وہ بھاگے اور گرد کے بادل میں کہیں غائب ھو گئے۔ پھاٹک زور سے بند کر دیا گیا اور اس میں کنڈی چڑھا کر تالا ڈال دیا گیا۔ ان کی چیتھڑے چتھڑے ٹوپی احاطے کے جنگلے پر سے باھر پھینک دی گئی۔ پھر سناٹا چھا گیا۔

ذرا دیر تو میخائل ماسوں اسی طرح پڑے کٹے پڑے رہے، پھر انہوں نے رستے پر سے ایک روڑا اٹھایا اور زور سے پھاٹک کی طرف پھینکا۔ بھد کی آواز آئی جیسے کسی نے بڑے کنڈال پر پتھر کھینچ مارا ھو۔ شراب کی دوکان کے اندر سے کالی کالی صورتیں رینگتی ھوئی نکل آئیں اور اپنے بازو گھما گھما کر چیخنے لگیں۔ گھروں کی کھڑکیاں کھل گئیں اور ان میں سے سر جھانکتے دکھائی دینے لگے۔ گلی میں پھر چیخوں اور قہقھوں سے جان پڑ گئی۔ سارا سماں پریوں کی ایک داستان سا معلوم ھوتا تھا — بے حد دلچسپ لیکن ناخوشگوار اور خوف ناک۔

یکایک سب قصہ ختم ھو گیا۔ ھر شخص چلا گیا اور تمام سناٹا چھا گیا۔

پھر نانی اماں دروازے کے پاس بکس پر بیٹھی تھیں، دوھری، بےحس و حرکت جیسے سانس تک نہ آتی جاتی ھو۔ میں ان کے سامنے کھڑا، ان کے نرم گرم اور بھیگے ھوئے گالوں پر ھاتھ پھیر رھا تھا۔ لیکن وہ جیسے اس بات سے بالکل بےخبر بیٹھی تھیں اور بیٹھی بیٹھی صرف بڑبڑائے جا رہی تھیں:

”آہ، اے رحیم و کریم خدا! جب عقل بٹ رہی تھی تو کیا اتنی کافی نہ تھی کہ مجھ کو اور میرے بچوں کو نہیں دی تو نے... ارے پروردگار مدد کر...“

جہاں تک مجھے خیال ھے نانا ابا اس مکان میں جو پولیوایا گلی میں تھا ایک سال سے زیادہ نہیں ٹھہرے — ایک موسم بہار سے دوسرے موسم بہار تک۔ لیکن اتنے ھی کم عرصے میں ھمارا گھر بدنام ھو گیا۔ تقریباً ھر اتوار کو لونڈے ادھر ادھر سے اکٹھے ھو جاتے

اور ہمارے دروازے پر یلغار کرتے ہوئے چیخ چیخ کر اعلان کرتے جاتے :

”کاشیرینوں کے یہاں پھر لڑائی ہو رہی ہے!،،

میخائل ماموں عام طور پر اتوار کی شام کو آتے اور ساری رات رہتے جیسے کوئی محاصرہ کئے ہو اور مکان والے سب ہوشیار اور چوکنا رہیں ۔ کبھی کبھی وہ اپنے ساتھه دو تین مددگار بھی لاتے، بانکے اور بگڑے دل لوگ جو کوناوینو کی دوکان میں کام کرتے تھے ۔ نالے سے ہو کر وہ لوگ باغ پر چڑھه آتے اور وهاں ان کا شراب کے نشے میں بدمست دماغ خوب خوب چالیں نکالتا، رس بھری کی جھاڑیاں نوچ ڈالتے ۔ ایک دن حمام میں گھس پڑے اور جو جو چیز بھی توڑی جا سکتی تھی توڑ دی — تندور کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، فرش کے پتھر اکھاڑ پھینکے، دروازہ کے پٹ اور چوکھٹ اکھیڑ دی ۔

نانا ابا کھڑکی میں سر جھکائے خاموش کھڑے ان لوگوں کے توڑ پھوڑ کی آوازیں سنتے رہے ۔ نانی اماں دوڑ کر احاطے میں گئیں جہاں وہ اندھیرے میں گم ہوگئیں ۔ ان کی منت کرنے کی آوازیں آتی رہیں :

”میخائل، سوچو تو ذرا کیا کررہے ہو، میخائل!،،

جواب میں گندی اور بیہودہ روسی گالیوں کی ایک لہر سنائی دی غالباً جن کے معنی پر ان جانوروں نے غور ھی نہیں کیا تھا ۔

ایسے موقع پر نانی اماں کے پیچھے پیچھے جانے کا سوال ھی نہیں پیدا ہوتا تھا ۔ لیکن ان کے بغیر ڈر بھی بےحد لگتا تھا ۔ میں نانا ابا کے کمرے میں داخل ہوا ۔

”دور ہو یہاں سے، بدبخت!،، وہ بھرائی ہوئی آواز میں مجھه پر کڑکے ۔

میں چھپر پر بھاگا اور باغ کے اندھیرے میں جھانک کے اس بات کی کوشش کرنے لگا کہ نانی اماں کہیں نظروں سے اوجھل نہ ہو جائیں اور ان کو پکارتا ہوا زور زور سے رونے لگا ۔ مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں وہ لوگ نانی اماں کو مار نہ ڈالیں ۔ وہ تو نہیں آئیں لیکن میری آواز سن کر میرے ماموں نے نشہ کے عالم میں میری ماں کو چند گندی گالیاں دے ڈالیں ۔

ایسی ہی ایک شام تھی۔ نانا ابا بیمار تھے۔ وہ بستر پر لیٹے لیٹے سر کو تکیہ پر ادھر ادھر جھٹکتے ہوئے بڑے دردناک انداز میں روتے جا رہے تھے:

''کیا میں اسی دن کے لئے زندہ رہا تھا، میں نے گناہ کئے تھے، روپیہ جمع کیا تھا؟ ہائے اگر ڈوب مرنے کی بات نہ ہوتی تو ابھی پولیس کو بلواکر کوتوال کے سامنے بندھوا دیتا۔ ہائے کیا بےعزتی ہے! یہ آج تک کبھی ہوا ہے کہ والدین اپنے بچوں کو پولیس کے حوالہ کریں؟ اور ہم ہیں کہ یہاں مجبور پڑے ہیں اور کچھ نہیں کر سکتے۔ آہ، بڑھاپا۔''

یکایک انہوں نے اپنی ٹانگیں پلنگ کی پٹی پر زور سے پھینکیں اور لڑکھڑاتے ہوئے کھڑکی کے پاس پہونچے۔

''اے کہاں جا رہے ہو؟'' نانی اماں نے چیخ مارکے ان کا بازو پکڑا۔

''بتی دو مجھے'' نانا ابا نے ہانپتے ہوئے حکم دیا۔ نانی اماں نے شمع روشن کرکے ان کے ہاتھ میں پکڑا دی اور وہ اسی طرح اسے لے کر چلے جیسے وہ بندوق ہو۔ کھڑکی سے وہ تمسخرآمیز آواز میں چلائے:

''تھو... و... و، میخائل، جیسے رات کا چور، جیسے خارش زدہ کتا!''

فوراً کھڑکی کا اوپری شیشہ ایک چھناکے کے ساتھ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور ایک ڈھیلا نانی اماں کے پاس میز پر آ کر گرا۔

''بچا!'' میرے نانا زور سے چلائے اور پھر زوروں سے ہنسنے یا رونے لگے۔

نانی اماں نے ان کو اس طرح گود میں بھر کر اٹھا لیا جیسے وہ نہ ہوں میں ہوں اور پلنگ پر لٹاتے ہوئے خوف زدہ آواز میں بولیں:

''ارے یسوع مسیح کا واسطہ! کیا غضب کرتے ہو۔ اگر کچھ ہو جائے تو اس کو سائبیریا بھیج دیا جائےگا۔ اب اس وقت تو وہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہے، وہ کیا سمجھ سکتا ہے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا!''

نانا نے پیر پٹخے اور خشک بھاری آواز میں کہا:

''قتل کرے تو کرنے دو...''

باہر سے ڈکرانے اور پاؤں پٹکنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے میز پر پڑا ہوا ڈھیلا اٹھایا اور کھڑکی کی طرف لپکا۔ لیکن نانی اماں نے مجھے کھینچ لیا اور کونے میں دھکیلتے ہوئے پھن پھنائیں:

''پاگل لونڈا...''

ایک اور موقع پر میخائل ماموں پیچھے برآمدے پر سے ہو کر چڑھ آئے اور اندرونی دروازے پر زور زور سے لاٹھی مارنے لگے۔ نانا ابا گلیارے میں تیار کھڑے تھے۔ ان کی مدد کے لئے دو کرایہ‌دار ہاتھوں میں لاٹھیاں سنبھالے کھڑے تھے اور شراب خانے کے مالک کی چوڑی چکلی بیوی بیلن لئے تیار کھڑی تھی۔ نانا ابا کے پیچھے نانی اماں گھس رہی تھیں۔

''مجھے جانے دو۔ مجھے اس کے پاس پہونچنے دو! میں اس سے ایک بات کرلوں۔''

نانا ابا کندھے پر سے لٹھ تانے ایک پاؤں اس طرح آگے کو بڑھائے کھڑے تھے جیسے اس تصویر ''ریچھ کا شکار'' میں کسان کھڑا تھا۔ جب نانی اماں ان کے پاس پہونچ کر آگے بڑھنے لگیں تو انہوں نے خاموشی کے ساتھ اپنی کہنی اور پاؤں اڑاکے ان کو روک دیا۔ اب چاروں کے چاروں انتظار میں کھڑے تھے۔ دیوار گیری میں لگے ہوئے چراغ کی ہلتی ہوئی لو کی روشنی باری باری سے ان کے چہروں پر پڑ رہی تھی۔ میں نے دوچھتی کے زینے سے یہ سارا تماشا دیکھا اور نہ جانے کیوں جی چاہا کہ جاکر نانی اماں کو یہاں لے آؤں۔

باہر سے میخائل ماموں زور زور سے دروازہ پیٹ رہے تھے۔ نیچے کا قبضہ ٹوٹ ہی چکا تھا اور جھنجھنا رہا تھا۔ اب دروازہ صرف اوپروالے قبضے سے لٹک رہا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ بس اب گیا، اب گیا۔ نانا ابا جھنجھناتی ہوئی آواز میں اپنے ساتھیوں سے بولے:

''دیکھو، ہاتھ اور پاؤں میں مارنا۔ سر پر نہ لگنے پائے! خیال رکھنا۔''

دروازے سے بالکل ملی ہوئی ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی۔ بس اتنی بڑی کہ اس میں سے سر نکال کر جھانکا جا سکتا تھا۔ اس

کا شیشه میخائل ماموں توڑ ھی چکے تھے اور اب ٹوٹے ھوئے شیشے کی جھالر سے گھری ھوئی وہ اس طرح جھانکتی ھوئی لگتی تھی جیسے بغیر ڈھیلے کی آنکھه۔

نانی اماں کھڑکی کی طرف دوڑیں اور اس میں سے ھاتھه نکال کر اور ھلا ھلا کر میخائل ماموں کو اشارہ کرکے چیخنے لگیں:

''میشا! یسوع مسیح کے واسطے چلے جاؤ! نہیں تو یہ لوگ تمہیں زندگی بھر کے لئے لنجا کر دیں گے۔ چلے جاؤ، جاؤ، جاؤ!،،

انہوں نے اپنی لاٹھی زور سے نانی اماں کے باھر نکلے ھوئے ھاتھه پر ماری۔ میں نے دیکھا کہ کوئی بھاری سی چیز بجلی کی طرح کھڑکی کی طرف آئی اور نانی اماں کے ھاتھه پر پڑی اور اس کے فوراً ھی بعد نانی اماں فرش پر ڈھیر ھو گئیں۔ گرتے گرتے بھی خاموش ھونے سے پہلے انہوں نے زور سے ایک بار آواز دی:

''میشا، بھاگ جاؤ...،،

''آہ امی!،، نانا ابا بڑی دردناک آواز میں زور سے رونے لگے۔

اتنے میں دروازہ جواب دے گیا اور تاریکی میں سے میخائل ماموں جست بھرکے اندر آ گئے۔ مگر پھر اس طرح باھر پھینک دئے گئے جیسے کوڑے کا ڈھیر ھوں۔

شراب خانے کے مالک کی بیوی نانی اماں کو اندر نانا کے کمرے میں لے گئی۔ نانا پیچھے پیچھے داخل ھوئے اور ان کے پاس جا کر غمگین آواز میں بولے:

''کیا ھڈی ٹوٹ گئی؟،،

نانی اماں نے آنکھیں کھولے بغیر جواب دیا:

''ھاں لگتا تو ایسا ھی ھے کہ ٹوٹ گئی۔ لیکن تم لوگوں نے اس کا کیا حشر کیا، اس کا؟،،

نانا ابا غصے میں چیخ کر بولے:

''اپنے ھوش میں آ عورت! مجھے کیا سمجھی ھے؟ جانور؟ اس کو باندھه لیا گیا ھے۔ وھاں پڑا ھے سرائے میں۔ میں نے بس ایک بالٹی پانی بھرکے اس پر ڈالا۔ کیا بھوت سوار تھا اس پر۔ نہ جانے کمبخت کو کہاں سے مل جاتی ھے؟،،

نانی اماں کراھنے لگیں۔

''میں نے هڈی بٹھانے والی کو بلوایا ہے - ذرا اتنی دیر اور برداشت کرو،، نانا نے کہا اور ان کے پاس پلنگ پر بیٹھه گئے - ''ارے یه لوگ هم دونوں کو مار ڈالیں گے - وقت سے پہلے قبر میں اتار دیں گے !،،

''سب دے دو ان کو - ،،

''اور وروارا کا کیا هوگا؟،،

بڑی دیر تک دونوں باتیں کرتے رہے - نانی اماں غمناک، مدهم اور منت‌بھری آواز میں اور نانا ابا اونچی اور غصه بھری آواز میں -

پھر ایک کبڑی بڑھیا وارد هوئی - اس کا دهانه ایک کان سے دوسرے کان تک تھا، نیچے کا جبڑا کانپ رها تھا، مچھلی کی طرح اس کا منه لٹکا هوا تھا اور اوپر کے هونٹ کو نوک‌دار ناک نے دو حصوں میں تقسیم کردیا تھا - آنکھیں دکھائی هی نہیں دیتی تھیں - مشکل سے وہ اپنی ٹانگیں هلا سکتی تھی فرش پر - بیساکھی کے سہارے اچک کر چل رهی تھی اور جب چلتی تھی تو اس کی گٹھری جھنا جھن بجتی تھی -

مجھے ایسا لگا که یه موت ہے جو میری نانی اماں کو پکڑ کر لے جانے کے لئے آئی ہے - اور میں اس بڑھیا پرٹوٹ پڑا -

''نکل یہاں سے - دور هو یہاں سے !،، میں نے اپنے پھیپھڑوں کی پوری طاقت سے چلانا شروع کر دیا -

میرے نانا نے مجھے دبوچ لیا اور بری طرح سے دوچھتی کی طرف لے گئے -

۷

بہت هی جلد مجھه پر یه حقیقت کھلنے لگی که میرے نانا ابا کا خدا اور ہے اور نانی اماں کا خدا اور -

نانی اماں صبح کو اٹھه کر دیر تک پلنگ پر بیٹھی اپنے حیرت انگیز بالوں میں کنگھی کیا کرتیں - زور زور سے کنگھی کرنے سے سیاہ بالوں کی لٹوں کی لٹیں نچتی چلی آتیں اور وہ سر گھما گھماکے،

دانت پیس پیس کے منه هی منه میں بالوں کو کوستی جاتیں که کہیں میری نیند نه کھل جائے:

''تمہیں بلا لے جائے، تمہیں طاعون هو اور آ گ لگے تمہیں! پھٹکار هو تم پر -،،

جب کسی نه کسی طرح بال سلجھه جاتے تو چوٹی کرتیں اور جھنجھلا کے پانی پھینکتی هوئی منه هاتھه دھوتیں - سو کے اٹھنے کے بعد نیند کی سلوٹیں هنوز ان کے چہرے پر پڑی رهتیں اور پوری طرح جھنجھلاهٹ کے بل بھی ان کے چہرے سے ڈھلنے نه پاتے که وه کونے میں لگی هوئی مقدس شبیہوں کے سامنے دوزانو جا بیٹھتیں، صبح کی دعا کے لئے وضو کرتیں جس سے ان کے چہرے پر تازگی آ جاتی -

کمر سے بالکل سیدھی هو کر وه سر کو پیچھے کی طرف جھکاتیں، قازان کی کنواری کے گول چہرے پر محبت سے نظریں گاڑ دیتیں، پھرتی سے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بناتی جاتیں اور کہتی جاتیں:

''مقدس کنواری، اس آنےوالے دن پر اپنی رحمتیں نازل کر!،،

جھکتے جھکتے بالکل فرش سے جالگتیں، پھر آهسته اٹھتیں اور پھر جوشیلے انداز میں دھیمے کہتی جاتیں:

''اے مسرت کا سرچشمه! تو ایسی حسین هے که بیان نہیں هو سکتا — جیسے پھولوں سے لدا هوا سیب کا درخت!..،،

روز صبح کو وه کنواری کی تعریف و توصیف کے لئے نئے نئے الفاظ ڈھونڈھه نکالتیں اور اسی لئے مجھه کو روز ان کی دعاؤں کی طرف غور سے توجه دینی هوتی تھی -

''آه میرے دل کے ٹکڑے، کتنی مقدس، کتنی پاک هے تو! میری روح کا نور، میرے گھر کی محافظ، آسمان کی مہر تاباں — ایسی نورانی، ایسی سنہری - اے پروردگار کو جنم دینے والی انمول هستی! هم سب کو برائی کے حملے سے بچا! بلا وجه کی بدنامی سے محفوظ رکھه اور مجھه کو بےسبب آفت سے پناه دے!،،

ان کی سیاه آنکھوں کی گہرائیوں میں محبت بھری مسکراهٹ تیرتی رهتی اور جیسے جیسے وه اپنے بھدے بھاری هاتھه سے سینے پر صلیب کا نشان بناتی جاتیں ویسے ویسے ان پر جوانی کا نکھار بڑھتا جاتا -

''میرے محبوب یسوع مسیح، اے خدا کے بیٹے - مجھ گنہگار پر رحم کر، تجھے اپنی ماں کا واسطہ...،،

ان کی دعاؤں پر ہمیشہ مسرت اور خوشی کا پرتو چھایا رہتا تھا — جیسے کوئی معصوم اور سادہ لوح دل خوشی سے نعرے لگا رہا ہو -

صبح کے وقت وہ عبادت پر زیادہ وقت صرف نہیں کرتی تھیں کیونکہ اب نانا ابا نوکر نہیں رکھ سکتے تھے، نانی اماں کو خود ہی سماوار گرم کرنا پڑتا تھا اور اگر نانا ابا کو ناشتہ میں ذرا سی بھی دیر ہو جاتی تو پھر نانی اماں کو مسلسل برا بھلا اور سخت سست سننا پڑتا تھا -

کبھی کبھی نانا ابا اول وقت اٹھ جاتے تو اوپر کی کوٹھری میں چلے آتے - نانی اماں اس وقت عبادت کرتی ہوتیں اور وہ خاموش کھڑے رہتے - حقارت کی مسکراہٹ ان کے سیاہ لبوں کے کونوں سے جھانکتی رہتی - بعد کو ناشتے کی میز پر وہ کہتے:

''میں نے تمہیں کتنی بار عبادت کرنا سکھایا ہے، خر دماغ، لیکن تم وہی اپنے پرانے ڈھرے پر چلی جاتی ہو - باز نہیں آتیں — بڑ بڑ بڑ بڑ — بے دینوں کی طرح! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ خدا یہ سب کیسے برداشت کر لیتا ہے!،،

''وہ سب سمجھتا ہے،، نانی اماں بڑے اعتماد کے ساتھ جواب دیتیں - ''اس سے جو کچھ بھی کہو، جس طرح بھی کہو، وہ سب سمجھتا ہے...،،

''تم تو پاگل ہو! تھو... و... و، کیا لوگ ہیں!،،

نانی اماں کا خدا نانی اماں کے ساتھ ہر وقت رہتا تھا - یہاں تک کہ وہ جانوروں سے بھی اس کا تعارف اور اس کا ذکر کرتی رہتیں - مجھے برابر نظر آتا رہتا تھا کہ عام جاندار — انسان ہو یا جانور، کتے، چڑیاں، شہد کی مکھیاں اور یہاں تک کہ پیڑ پودے بھی اس خدا کے سامنے بڑے مزے میں جھک جاتے تھے - وہ اس عالم‌خاکی کی ہر چیز کو یکساں طور پر عزیز تھا -

ہمارے احاطے میں ایک بلا رہتا تھا جو شراب خانے کے مالک کی بیوی نے پال رکھا تھا - بڑا خوبصورت بھورے رنگ کا جسم،

چمکتی ہوئی بھوری آنکھیں لیکن زمانہ بھر کا چور اور چٹورا۔ احاطے میں سب لوگ اسے بہت چاہتے۔ اس نے ایک دن ایک مینا پکڑلی۔ نانی اماں نے زخمی چڑیا کو اس سے چھڑایا اور اس کو بڑے غصے میں پھٹکارا:

''ارے تجھے خدا کا خوف نہیں ہے۔ یہی تو مشکل ہے۔ ظالم جلاد کہیں کا!،،

شراب خانے کے مالک کی بیوی اور دربان نانی اماں کی اس بات پر ان کا مذاق اڑانے لگے۔ وہ زور سے بگڑیں:

''تو تم لوگ۔کیا سمجھتے ہو کہ جانوروں کو خدا کا علم نہیں۔ حقیر سے حقیر جانور بھی اپنے خالق کو جانتا ہے جیسے تم لوگ جانتے ہو — سنگ‌دل!،،

جب وہ موٹے شراپ پر ساز کستیں اور وہ سست رہتا تو منہ ہی منہ میں کہتیں:

''بندۂ خدا، کیوں اتنا مسمسا رہا ہے؟ اچھا ہاں، اب میں سمجھی۔ تجھ پر بڑھاپا آ رہا ہے۔ ہے نا؟،،

گھوڑا ایک لمبی سی آہ بھر کر سر جھٹکتا۔

لیکن نانی اماں نانا ابا کی طرح بار بار خدا کا نام نہیں لیتی تھیں۔ نانی اماں کا خدا میری سمجھ میں بھی آتا تھا اور اس سے مجھے خوف بھی محسوس نہیں ہوتا تھا لیکن اس کی موجودگی میں جھوٹ بولنے کی ہمت نہیں ہو سکتی تھی — شرم آتی تھی اور اسی شرم کی وجہ سے میں نے اپنی نانی اماں سے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ ایسے رحیم اور مہربان پروردگار سے کوئی بات چھپانا ناممکن تھا اور جہاں تک مجھے یاد ہے میرے دل میں ایسی حرکت کا رجحان کبھی پیدا نہیں ہوا۔

ایک دن شراب خانے کے مالک کی بیوی اور میرے نانا کا جھگڑا ہوا اور اس نے لگے ہاتھوں میری نانی اماں کو بھی آڑے ہاتھوں لے لیا بلکہ ان کو ایک گاجر بھی کھینچ کر ماری۔

نانی اماں نے بڑے اطمینان سے بس اتنا ہی کہا ''تم بھی احمق ہو، بیگم صاحبہ،،۔ لیکن مجھے نانی اماں کا خیال کرکے بہت کوفت ہوئی اور میں نے بدلہ لینے کی ٹھانی۔

تھوڑی دیر تک تو میں سوچتا رہا کہ اس موٹی، لال بالوں اور دوھری ٹھڈی والی تھل تھل پل پل بڑھیا سے کیونکر بدلہ لیا جائے جس کی آنکھیں موٹاپے کی وجہ سے دکھائی نہیں دیتی تھیں۔

پڑوس کی ان آپس کی لڑائیوں کے سلسلے میں کئی طریقے بدلہ لینے کے لئے رائج تھے۔ مثلاً میں نے دیکھا تھا کہ انتقام کے لئے بلیوں کی دمیں کاٹ دی جاتی تھیں، کتوں کو زہر کھلا دیا جاتا تھا، مرغیاں مار ڈالی جاتی تھیں یا رات کے وقت دشمن کے تہہ خانے میں گھس کر نمکین کھیروں کے کنڈالوں اور اچار کے گھڑوں میں مٹی کا تیل ڈال دیا جاتا تھا، یا بند شرابوں کی مہر توڑ کر ڈاٹیں کھول دی جاتی تھیں — لیکن ان تمام طریقوں سے میرا اطمینان نہ ہوا۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ کوئی زیادہ دلیرانا اور سخت قسم کا بدلہ لیا جائے۔

چنانچہ میں نے یہ طریقہ سوچا: جب شراب بیچنے والے کی بیوی تہہ خانے میں داخل ہوئی تو میں نے آگے سے کنڈی چڑھا دی اور اس میں تالا ڈال دیا۔ پھر میں تہہ خانے پر چڑھہ کر مارے خوشی کے خوب ناچا اور تالے کی کنجی چھت پر پھینک دی۔ پھر دوڑا ہوا باورچی خانے میں پہنچا جہاں نانی اماں کھانا پکا رہی تھیں۔ پہلے تو ان کی سمجھہ میں نہیں آیا کہ مجھہ پر یہ وجدانی کیفیت کیوں طاری ھے۔ پھر جب ان کو معلوم ہوا تو انہوں نے جہاں جہاں چپت لگا سکتی تھیں خوب خوب لگائیں۔ پھر مجھے کھینچتی ہوئی احاطے میں لے گئیں اور کنجی لانے کے لئے مجھے چھت پر چڑھوایا۔

ان کے رد عمل سے میرا دل غم سے کچل گیا۔ نہایت خاموشی کے ساتھہ میں نے کنجی لائی اور پھر دوڑکے احاطے کے ایک کونے میں دبک گیا جہاں سے میں دیکھتا رہا۔ نانی اماں نے قیدی کو چھڑایا اور پھر اس کے ساتھہ ساتھہ ادھر ھی آئیں جدھر میں تھا۔ دونوں بڑے مزے میں ھنس رھی تھیں۔

”ٹھہر جا، دیکھہ ابھی اور مرمت کروں‌گی تیری،، شراب خانے کے مالک کی بیوی نے مجھے مکا دکھاتے ہوئے کہا لیکن اس کے چہرے پر مسکراھٹ تھی۔ آنکھیں حسب دستور موٹا پے کی وجہ

سے نظر ھی نہیں آ رھی تھیں۔ نانی اماں نے میری گردن ناپی اور باورچی خانے میں لے گئیں۔

''کیوں کی یہ حرکت؟،، انہوں نے پوچھا۔

''اس نے تمہارے اوپر گاجر نہیں پھینکی تھی؟،،

''آ ھا ھا۔ تو تو نے میرے واسطے یہ سب کیا، ایں؟ میں تجھے بتاتی ھوں — ذرا سی جان اور — ٹھہر، دیکھ ابھی تجھے تندور کے نیچے چوھوں کے ساتھ بند کرتی ھوں، پھر تیری کھوپڑی میں کچھ عقل آئے گی! بڑا بہادر بن کے آیا ھے۔ سورما کہیں کا! کیا تیرے نانا سے کہہ دوں تو ابھی چمڑی ادھیڑ کے دھر دیں۔ اوپر چل، وھاں دوچھتی میں بیٹھ کے کتابوں سے جی لگا۔ چل!،،

اس کے بعد انہوں نے دن بھر مجھ سے بات نہیں کی لیکن شام کو عبادت سے پہلے وہ میرے پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گئیں اور مجھ سے ایسی باتیں کہیں جو میں کبھی نہیں بھول سکونگا:

''سن بیٹے، کبوتر وبوتر! بس اتنا یاد رکھنا کہ بڑوں کے معاملے میں کبھی دخل نہ دینا! بڑوں کو ھزار طرح کی ھوس ھوتی ھے، نہ جانے کیا کیا مشقت بھگتنی پڑتی ھے — اس لئے وہ لوگ بگڑے ھوئے ھوتے ھیں۔ لیکن تم ایسے نہیں ھو نا، کم از کم ابھی تو نہیں ھو۔ اس لئے تم بس کھیلنے کھانے سے کام رکھا کرو، یہاں تک کہ تمہیں جو زندگی میں کرنا ھے وہ خدا تمہارے دل میں ڈال دے اور جس راستے پر تمہیں جانا ھے اس رستے پر تمہیں لگا دے۔ سمجھ گئے نا؟ اور رھا یہ کہ کسی نے قصور کیا سو اس سے تم کو کیا مطلب۔ خدا خود ھی انصاف کرے گا، خود ھی سزا دے گا۔ یہ کام اس کا ھے، ھم لوگوں کا نہیں!،،

پھر وہ ایک منٹ چپ رھیں، نسوار لی اور پھر داھنی آنکھ نیچے کر کے بولیں:

''کبھی کبھی تو خود خدا کے لئے بھی یہ فیصلہ کرنا مشکل ھو جاتا ھے کہ قصور کس کا ھے۔،،

''کیوں؟،، میں نے حیران ھو کر پوچھا۔ ''کیا وہ سب کچھ نہیں دیکھتا اور نہیں جانتا؟،، اور انہوں نے غمگین آواز میں جواب دیا:

''اگر اسے معلوم ھوتا تو دنیا میں بہت سے کام ایسے ھیں جو

لوگ کبھی نہ کرتے۔ وہ تو اوپر جنت میں بیٹھا رہتا ہے اور ہم گنہگاروں کو جو نیچے ہیں دیکھتا رہتا ہے اور کبھی کبھی وہ آنسوؤں سے رونے لگتا ہے پھوٹ پھوٹ کر ''آہ میرے انسانو، میرے انسانو۔ میرے اپنے، میرے محبوب انسانو! آہ میرا دل تمہارے لئے کیسا کچھ خون ہوتا ہے!،،

وہ خود رونے لگی تھیں اور آنسو پونچھنے کا خیال کئے بغیر وہ اسی طرح مقدس شبیہوں والے کونے میں چلی گئیں اور عبادت شروع کردی۔

اس وقت سے ان کا خدا مجھے اور بھی زیادہ محبوب ہو گیا اور بھی زیادہ میری سمجھ میں آنے لگا۔

نانا ابا بھی سبق پڑھاتے وقت مجھ کو یہی سکھاتے تھے کہ خدا سب کچھ جانتا ہے، سب کچھ دیکھتا ہے، ہر جگہ موجود ہے اور ہر مصیبت میں انسان کی مدد کرتا ہے۔ لیکن ان کے دعا مانگنے کا انداز بالکل دوسرا تھا۔

نانا ابا مقدس شبیہوں کے سامنے جانے سے پہلے بڑے اہتمام سے ہاتھ منہ دھوتے، کپڑے بدلتے اور اپنے سرخ بالوں اور داڑھی میں کنگھی کرتے۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر وہ قمیص ٹھیک کرتے، سیاہ گلوبند، جو وہ صدری کے نیچے پہنا کرتے تھے، لپیٹتے اور پھر دبے پاؤں وہ مقدس شبیہوں کی طرف بڑھتے — لکڑی کے تختوں کے فرش میں ایک خاص جگہ پر ایک گرہ پڑی ہوئی تھی جو گھوڑے کی آنکھ کی طرح لگتی۔ نانا ابا ٹھیک اسی جگہ پر آ کر رکتے، ان کے دونوں ہاتھ اس طرح اکڑے ہوئے رہتے جیسے سپاہیوں کے ہوتے ہیں۔ لمبے دبلے، سر جھکائے وہ ایک منٹ خاموش رہتے، پھر بڑے موثر انداز میں کہتے:

''باپ اور بیٹے اور روح القدس کے نام پر!،،

مجھے ہمیشہ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ان الفاظ کے بعد پھر کمرے پر ایک خاص قسم کا سناٹا چھا جاتا تھا یہاں تک کہ مکھیاں بھی ذرا ادب سے بھنبھنانے لگتی تھیں۔

اب نانا ابا پیچھے کو سر جھکاتے بھوؤں کے بال کھڑے ہوجاتے، سنہری داڑھی فرش کے متوازی ہو جاتی۔ وہ اپنی دعائیں بڑے نپے

تلے انداز و آواز میں پڑھتے تھے جیسے سبق دھرا رہے ہوں۔ ایک ایک لفظ کو زور دے دے کر کہتے:

''روز محشر نزدیک ھے جس کا علم کسی کو نہیں، ہر انسان کے اعمال کو ظاہر کرنے کے لئے...،،

اپنے سینے پر وہ هلکے هلکے هاتھه مارتے جاتے اور اپنا مدعا بیان کرتے جاتے:

''میں تیرا صرف تیرا ھی گنہگار ھوں معبود۔ میرے گناھوں سے چشم پوشی کر، منه پھیر لے...،،

''ایمان،، دعا کا اعلان کرتے وقت وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے جاتے، ساتھه ھی ساتھه ان کا دائیں پاؤں تال دیتا جاتا۔ صاف ستھرے، چکنے بنے ہوئے اپنی بات وہ اس طرح مقدس شبیہوں کے سامنے کہتے جیسے ان کو حکم دے رہے ہوں۔ ان کا پورا جسم ان شبیہوں کی طرف جھک جاتا اور زیادہ لمبا یا زیادہ دبلا اور زیادہ سخت ھوتا ھوا نظر آتا۔

''تو جس نے مسیح اعظم کو پیدا کیا، میرے دل کو بھی برائیوں سے پاک کردے، میری روح کی فریاد سن اور مجھه پر رحم کر، اے پروردگار کی ماں!،،

پھر وہ چپکے چپکے رونے لگتے، ان کی سبز آنکھوں میں آنسو چمکنے لگتے:

''میرے ایمان کو میرے اعمال سے جانچنا پروردگار اور مجھه پر اتنا بوجھه نه ڈالنا جو میری قوت برداشت سے باہر ھو!،،

بار بار وہ اپنے سینے پر صلیب کا نشان بناتے — تیزی سے کانپتے ھاتھوں سے بکرے کی طرح سر آگے کو بڑھا کر ھلاتے جاتے اور رونی اور بھنبھناتی آواز نکلتی جاتی۔ بعد کو جب میری عمر بڑھی اور مجھے یہودیوں کی ایک عبادت گاہ دیکھنے کا اتفاق ھوا تب مجھے پته چلا که نانا ابا یہودیوں کی طرح عبادت کرتے تھے۔

سماوار دیر سے میز پر رکھا سنسنا کر ابلتا رہتا، کمرے میں پنیر بھرے ھوئے گیہوں کے سموسوں کی گرم خوشبو پھیلتی جاتی اور مارے بھوک کے میرے پیٹ میں چوھے قلابازیاں کھاتے رہتے۔ نانی اماں دروازے کی چوکھٹ سے لگی فرش پر نظریں گاڑے کھڑے آھیں بھرتی

اور تیوریاں چڑھاتی رھتیں - سورج خوشی خوشی کھڑکی میں سے جھانکتا، درختوں پر شبنم موتیوں کی طرح دمکتی، صبح کی ھوا اپنے ساتھه رس بھریوں اور پکتے ھوئے سیبوں کی مہک لا لا کر بکھیرتی - لیکن نانا ابا اپنی عبادت میں محو اسی طرح ھلتے اور بسورتے رھتے:

''میری ھوس کی آگ کو بجھا معبود، کیونکه میں بدبخت ھوں، میری طبیعت چھوٹی اور نیچی ھے!''

مجھے ان کی صبح شام کی دعائیں زبانی یاد تھیں اور میں بڑے غور سے ان کو صرف یه دیکھنے کے لئے سنا کرتا تھا که وہ غلطی تو نہیں کرتے یا کچھه چھوڑ تو نہیں جاتے - ایسے موقع آتے تو بہت ھی کم تھے لیکن جب آتے تھے تو مجھے ایک شرارت بھری خوشی، ایک احساس‌فتح ھوتا تھا -

جب نانا ابا دعائیں ختم کر چکتے تب میری اور نانی اماں کی طرف مخاطب ھوتے:

''آداب عرض ھے!''

ھم دونوں جھکتے اور آخرکار میز پر بیٹھنے کی نوبت آتی -

''آپ وہ لفظ چھوڑ گئے نانا — وہ ''کافی!''، میں نانا ابا کی طرف مڑکر کہتا -

''جھوٹ تو نہیں بول رھے ھو نا؟ یقین ھے؟''، وہ مشکوک انداز میں پوچھتے -

''جی نہیں - آپ کو کہنا چاھئے تھا ''اور خدا کرے میرا ایمان اتنا کافی ھو که...''، لیکن آپ ''کافی''، لفظ چھوڑ گئے - ''

''ھوں''، وہ چور سے بن کر آنکھیں جھپکاتے ھوئے کہتے - کسی نه کسی دن وہ بھی اس بات کا بدله نکال لیا کرتے لیکن فی الحال تو میں ان کی گھبراھٹ سے لطف لے لیتا تھا -

ایک دن نانی اماں نے مذاق میں کہا:

''وروارا کے ابا، خدا تمہاری دعائیں سنتے سنتے اکتا تو گیا ھوگا - ھمیشه وھی ایک بات کہتے رھتے ھو - ''

''کیا... آ...آ؟''، نانا ابا دھمکی دینے والے انداز میں بولے ''یه تم کیا بڑبڑ کر رھی ھو؟''

''میں یہ کہہ رہی ہوں کہ تم اپنے خالق کے سامنے اپنے دل سے نکلی ہوئی ایک بات بھی نہیں کہتے۔ ''

وہ غصے کے مارے کانپتے ہوئے، لال بھبھوکا ہو کر کرسی پر سے اٹھے اور ایک طشتری کھینچ کر نانی اماں کو ماری۔

''نکل جا یہاں سے، چڑیل کہیں کی!'' اور اس طرح چیخنے لگے جیسے کوئی شیشے کو آری سے کاٹ رہا ہو۔

جب کبھی کبھی وہ خدا کے دستِ‌قدرت کی بات کرتے تو ہمیشہ اس کی قہاری پر زور دیتے۔ مثلاً ایک بار لوگوں نے گناہ کئے تھے تو ان کو سیلاب میں ڈبو دیا گیا، ایک بار ان کے شہر جلا کر تباہ و برباد کر دئے گئے، لوگوں کو قحط اور طاعون کے ذریعہ سزا دی گئی۔ نانا ابا کی نظر میں خدا ایک اپی تلوار تھا، ایک چابک تھا جو ہر وقت گنہگاروں کے سر پر گرنے کو تیار رہتی تھی۔ اپنی پتلی پتلی انگلیوں سے میز کو بجا بجا کر وہ مجھے ہمیشہ خبردار کرتے رہتے تھے کہ جو شخص بھی خدا کے قانونوں کو توڑے گا، ان کے برخلاف کریگا اس کا حشر اسی طرح کا ہوگا۔

لیکن مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ خدا بھی اس قدر ظالم ہو سکتا ہے۔ مجھے شک ہوتا تھا کہ نانا ابا نے مجھے خدا کے بجائے اپنے آپ سے ڈرانے کے لئے یہ سب باتیں ایجاد کی ہیں۔ میں ان سے صاف صاف بھی پوچھ لیتا:

''تو یہ سب باتیں آپ مجھے اس لئے بتا رہے ہیں کہ میں آپ کا حکم مانوں؟''

''بالکل!'' وہ اسی شان اور جوش سے کہتے۔ ''مانوگے کیوں نہیں؟ یہ بھی خوب رہی۔ ''

''اور نانی اماں؟''

''ارے اس احمق کی باتوں میں نہ آنا'' وہ سختی سے کہتے۔ ''وہ تو ساری زندگی ایسی ہی رہی ہے — جاہل اور سڑی۔ میں اس سے کہہ‌دونگا کہ ایسی اہم باتوں کے بارے میں تم کو کچھ کہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اچھا میری بات کا جواب دو — فرشتوں میں کتنے درجے ہوتے ہیں؟''

میں نے جواب دیا اور پھر سوال کر دیا:

''اونچے درجے کا آدمی — اس کے معنی کیا ہوتے ہیں؟،،
نانا ابا غراتے ''تجھے تو بس دینا بھر جاننے کی پڑی رہتی ہے -،، آنکھیں جھکا لیں اور ہونٹ چبانے لگے، بھر ذرا سوچ کر رک رک کر بولے:
''ان باتوں سے خدا کا کوئی تعلق نہیں ہے - یہ سب انسانوں کا کیا دھرا ہے - اونچے درجے کے لوگ ہوتے ہیں جیسے سرکاری افسر لوگ - اور افسر ان کو کہتے ہیں قانون جن کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا - افسر لوگ قانون کو چبا کے نگل جاتے ہیں -،،
''قانون کیا ہوتا ہے؟،،
''قانون؟ یہ ہے کہ ... یعنی کہ قانون وہ ہوتا ہے جو کہ لوگ اپنی عادتیں ڈالنے کے لئے اختیار کرتے ہیں،، بڑے میاں نے جواب دیا - ان کی تیز آنکھیں بڑے مزے میں چمک رہی تھیں - ''لوگ ساتھ رہتے ہیں اور آپس میں کچھ باتیں طے کر لیتے ہیں، یعنی کہ جیسے اب فلاں کام کرنے کا اچھا طریقہ کون‌سا ہے، پھر وہ اسے دستور بنا لیتے ہیں، قاعدہ بنا لیتے ہیں اور پھر اسی کو قانون کہتے ہیں! جیسے کچھ لڑکے کوئی کھیل کھیلنے کے لئے اکٹھا ہوتے ہیں اور پھر طے کرتے ہیں کہ کیوں کر کھیلا جائے اور جو کچھ وہ طے کرتے ہیں بس وہی قانون ہوتا ہے -،،
''اور افسر لوگ؟،،
''ان کی حیثیت ایسی ہوتی ہے جیسے بڑے لڑکوں کی جو آ کر کھیل بگاڑتے اور قانون توڑتے ہیں -،،
''کیوں؟،،
''یہ تمہارے سمجھنے والی بات نہیں ہے!،، انہوں نے ابرو پر بل ڈال کر کہا - ''خدا انسان کی ہر بات دیکھتا رہتا ہے - انسان کچھ چاہتے ہیں لیکن خدا کی مرضی کچھ اور ہوتی ہے! خدا ایک ذرا پھونک مار دے اور سب چیزیں دھول کی طرح اڑ جاتی ہیں -،،
مجھے افسروں سے دلچسپی ہونے کی کئی وجہیں تھیں - سو اپنی بات پر اڑا رہا:
''نانا ابا، وہ گانا بھی تو ہے جو یاکوف ماموں گایا کرتے ہیں:

پاک فرشتہ ــ اللہ کے بندے
حکومت کے افسر ــ شیطان کے بندے!،،

نانا ابا نے آنکھیں بند کر لیں، داڑھی ہتھیلی پر لپیٹی اور منہ میں ٹھونس لی۔ ان کے گالوں کی تھرتھراہٹ سے مجھے پتہ چل گیا کہ وہ اندر ہی اندر ہنس رہے ہیں۔

’’تم اور یاکوف دونوں کو تو بورے میں بھرکے دریا میں ڈبو دے!،، انہوں نے کہا۔ ’’اس کو کوئی حق نہیں ہے کہ اس طرح کے گیت گائے اور تم کو بھی نہ چاہئے کہ یہ واہیات گانے سنو! یہ سب کافروں اور بے دینوں کے بتائے ہوئے گیت ہیں، بے ہودہ مذاق!،،

انہوں نے ایک منٹ مجھے غور سے دیکھا، پھر ٹھنڈی سانس بھرکے کہا:

’’تھو... و... و، کیا لوگ ہیں!..،،

ویسے نانا ابا کے تصور میں تو خدا سب سے بلند اور سب کے لئے ایک مصیبت کا باعث تھا۔ لیکن نانی اماں کی طرح وہ بھی یہی مانتے تھے کہ ہمارے معاملات میں خدا کا اور بےشمار اولیاؤں کا ہاتھہ تھا۔ نانی اماں صرف چند اولیاؤں کو مانتی تھیں جن میں نکولائی، یوری، فرول اور لاور تھے جو بےحد نیک اور اچھے انسان تھے، گاؤں گاؤں، شہر شہر گھوما کرتے تھے، لوگوں کی مدد کرتے تھے اور انسانوں کے ساتھہ انسانیت سے پیش آتے تھے۔ لیکن دوسری طرف نانا ابا کے جو اولیا تھے وہ ایسے شہید تھے جنہوں نے بتوں کو توڑا تھا اور روم کے قیصروں کا مقابلہ ڈٹ کر کیا تھا اور اس کے عوض میں ان کو ایذائیں پہونچائی گئی تھیں، جلایا گیا تھا اور زندہ کھال کھینچی گئی تھی۔

کبھی کبھی میرے نانا غمگین آواز میں کہتے:

’’کاش خدا اتنا سامان کر دیتا کہ میں اس گھر کو پانچ سو روبل کے منافع پر بھی بیچ سکتا تو پھر میں ولی نکولائی کی فاتحہ کرواتا!،،

نانی اماں ہنس کر مجھ سے کہتیں:

’’بڈھا بیوقوف۔ جیسے نکولائی کو ان کا گھر بکوانے سے بہتر اور کوئی کام کرنے کو تھوڑا ہی ہے!،،

کئی سال تک مسلسل میں اپنے نانا ابا کی سالانہ مذہبی جنتری اکٹھا کرلیا کرتا تھا۔ اس جنتری پر کسی کسی تاریخ پر کوئی کوئی نشانات لگے ہوئے تھے۔ سینٹ ایوکیم اور سینٹ آننا کی تاریخوں کے آگے لکھا تھا ''ان کی عنایت، رحم و کرم سے ایک بہت بڑی مصیبت سے نجات ملی۔''

مجھے یاد ہے کہ وہ کیا ''مصیبت'' تھی۔ اپنے ناکارہ بیٹوں کی مدد کرنے کے سلسلے میں نانا ابا نے لوگوں کی قیمتی چیزیں اپنے پاس گیروی رکھھ کے سود پر قرض دینا شروع کیا تھا۔ کسی نے اس کی اطلاع پولیس میں کردی اور ایک رات پولیس ہمارے گھر کی تلاشی لینے آئی۔ بڑا ہنگامہ ہوا لیکن خیر پھر سب کچھھ ٹھیک ہوگیا۔ نانا ابا رات بھر دعائیں پڑھتے رہے اور صبح کو انہوں نے میرے سامنے یہ الفاظ جنتری پر لکھے۔

پھر رات کے کھانے تک وہ میرے ساتھھ مناجات پڑھتے رہے، اور ایفریم سیرین کی پوری جلد دھراتے رہے۔ کھانے کے بعد پھر نماز پڑھتے رہے اور رات کے سناٹے میں ان کی آواز گونجتی رہی:

''تو جو چاہے دے، جو چاہے لے۔ اے لازوال، لافانی شہنشاہ!.. ہم کو ہوس سے لالچ سے محفوظ رکھھ... بروں سے ہم کو پناہ دے... ایسا کر کہ میرے آنسو میرے گناہوں کو دھودیں...''

مگر میری نانی اماں اکثر کہتیں:

''آہ، آج میں کس‌قدر تھک گئی ہوں! لگتا ہے بغیر نماز پڑھے ہی بستر پر پڑ جاؤگی۔''

نانا ابا مجھے اپنے ساتھھ گرجے لے جایا کرتے۔ سنیچر کے دن رات کی نماز میں اور اتوار کو بھی جو دیر تک دعائیں ہوتی رہتی تھیں اس میں۔

گرجے میں بھی مجھے محسوس ہو جاتا تھا کہ کون کس خدا کی عبادت کر رہا ہے۔ بڑے پادری صاحب اور چھوٹے پادری صاحب تو نانا ابا کے خدا کی عبادت کرتے تھے لیکن ان کے ساتھھ جو سنگیت منڈلی رہتی تھی وہ نانی اماں کے خدا سے مخاطب رہتی تھی۔

یقیناً میں نے اس تفریق کی بڑی بھدی سی تصویر کھینچی ہے جو میرے طفلانہ ذہن میں ان دونو خداؤں کے متعلق تھی۔ ایک

ایسی تفریق جو مجھے اب تک یاد ہے کہ میرے ذہن میں سخت روحانی الجھاؤ کا سبب بنی رہتی تھی۔ میں نانا ابا کے خدا سے ڈرتا بھی تھا، اس سے نفرت بھی کرتا تھا۔ یہ ایسا خدا تھا جو کسی سے محبت نہیں کرتا تھا اور ہر ایک پر کڑی نظر رکھتا تھا، جس کی بنیادی دلچسپی صرف اس بات میں تھی کہ وہ انسان کے کسی کمینہ پن یا کسی برائی یا بے ہودگی کو بےنقاب کردے۔ ظاہر ہے کہ اسے انسان پر بھروسہ نہ تھا، اس کی خواہش ہمیشہ یہ رہتی تھی کہ لوگوں کو شرمندہ کرے۔ سزا دینے میں اس کو لطف آتا تھا۔

اس زمانے میں میرے ذہن پر خدا کی ذات سب سے زیادہ چھائی ہوئی تھی اور وہی واحد حسن تھا جو مجھے زندگی میں دکھائی دیتا تھا۔ باقی تمام تاثرات سے مجھے نفرت اور رنج ہوتا تھا کیونکہ ان میں ظلم اور گندگی بھری ہوئی نظر آتی تھی۔ خدا — نانی اماں کا خدا — جو تمام جانداروں کا رفیق اور دوست تھا، میرے ماحول میں سب سے زیادہ حسین اور بہترین چیز تھا اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ نانا ابا کو خدا کی یہ اچھائی کیوں نہیں دکھائی دیتی۔

مجھے باہر گلی میں کھیلنے کی اجازت نہیں تھی کیونکہ میں بہت جوش سے بھر جایا کرتا تھا۔ وہاں کھیلنے سے مجھ پر جو تاثرات ہوتے تھے وہ نشے کی طرح میرے دماغ پر چڑھ جاتے تھے اور میں ہمیشہ کسی نہ کسی لڑائی یا جھگڑے کی جڑ بن جاتا تھا۔ کسی سے میری دوستی بھی نہیں ہوتی تھی اور پاس پڑوس کے زیادہ‌تر بچے میرے خلاف رہتے تھے۔ مجھے اس بات سے چڑ تھی کہ مجھے کاشیرین کہاجائے۔ اور جب ان لوگوں کو یہ پتہ چل گیا تو وہ ایک دوسرے سے چلا چلا کر یہ نام لیتے رہتے تھے:

''وہ آیا کاشیرین کا نواسہ، کنجوس کاشیرین کا نواسہ، دیکھو، دیکھو!،،

''مارو، گراؤ!،،

اور بس پھر لڑائی شروع ہو جاتی۔

میں اپنی عمر کے حساب سے زیادہ مضبوط تھا اور لڑنے میں دلیر۔ میرے دشمن بھی اس بات کو مانتے تھے اور مجھ پر اکیلے حملہ کبھی نہیں کرتے تھے۔ اس لئے میں اکثر ان کے ہاتھوں پٹتا اور خون

بہتی ہوئی ناک، کٹے ہوئے ہونٹ اور نچے ہوئے کپڑوں سمیت گھر آتا۔

نانی اماں مجھے دیکھ کر خوف سے گھبرا جاتیں:

''کیا؟ تو نے لڑنا شروع کر دیا، ننھا پلا! اچھا ٹھہر میں تجھے بتاتی ہوں۔ کہاں سے شروع کروں؟''

وہ میرا منہ دھلاتیں، چوٹ پر کوئی تانبے کا سکہ یا جڑی بوٹی یا عرق لگاتی جاتیں اور کہتی جاتیں:

''آخر تو کیوں اس طرح لڑتا ہے؟ گھر پر تو تو ایسا نیک بنا رہتا ہے لیکن گلی میں جا کر تجھ پر کیوں شیطانی سوار ہو جاتی ہے؟ ڈوب مر! ٹھیر تیرے نانا سے کہتی ہوں تیرا باہر نکلنا بند کریں۔''

نانا ابا کی نگاہ میرے زخموں اور گومڑوں پر ضرور پڑتی لیکن وہ ان باتوں پر سچ مچ خفا نہ ہوتے، بس بڑبڑا کر رہ جاتے:

''کیوں بے، پھر تمغے لگا لایا؟ کیا بہادر سپاہی ہے! لیکن اب اگر میں نے تجھے گلی میں دیکھا تو پھر نہ کہنا۔ این؟ سنتا ہے؟''

جب گلی میں سناٹا چھایا رہتا تب تک تو مجھے باہر جانے کی کوئی خواہش پیدا نہ ہوتی لیکن جب میں بچوں کی مسرت بھری آوازیں اور چیخیں سنتا تو نانا کی نصیحت بھول کر باہر گلی میں دوڑ جاتا۔ مجھے چوٹیں کھانے سے تو کوئی ڈر نہیں لگتا تھا لیکن لڑکوں کے ظالمانہ مذاق کا میں کبھی عادی نہیں ہو سکتا تھا۔ ظالمانہ حرکتوں کو میں برابر دیکھتا تھا اور خوب پہچانتا تھا۔ ظلم و ستم کی حرکتیں دیکھ کر میں غصے سے پاگل ہو اٹھتا تھا۔ مجھے یہ اچھا نہیں لگتا تھا کہ وہ مرغوں اور کتوں کو آپس میں لڑائیں، بلیوں کو پکڑ پکڑ کر طرح طرح کی ایذائیں دیں، یہودیوں کی بکریاں ادھر ادھر ہنکا دیں، نشے میں دھت فقیروں اور بیچارے اللہ میاں کی گائے ایگوشا کو چھیڑیں:

''ایگوشا — موت کا ہرکارہ!''

ایگوشا لمبا اور پتلا دبلا، مریل مریل سا میلا کچیلا آدمی تھا۔ اس کے ہڈی ہڈی سو کھے چہرے پر داڑھی کانٹوں کی طرح نکلی رہتی تھی۔ وہ سڑک پر چلتا تو بھیڑ کی کھال کے کوٹ میں چھپا

ہوا اس کا خمیدہ جسم کچھہ عجیب طرح سے جھومتا اور ہلتا۔ اس کی آنکھیں زمین پر گڑی رہتیں۔ اس کا سیاہ چہرہ اور غم‌زدہ آنکھیں دیکھہ کر میرے دل میں حیرانی، رعب اور احترام کا جذبہ پیدا ہوتا۔ مجھے لگتا کہ یہ آدمی کوئی بڑا مقدس فرض پورا کر رہا ہے اور اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں پیدا کرنی چاہئے۔

لیکن چھوکرے اس کے پیچھے بھاگتے اور اس کی کبڑی پیٹھہ پر پتھراؤ کرتے۔ کچھہ دیر تو وہ کوئی دھیان نہ دیتا جیسے اسے ذرا چوٹ نہ لگ رہی ہو۔ پھر یکایک وہ رک جاتا اور سر پیچھے تان کر چاروں طرف نظر دوڑاتا اور بڑے جھٹکے سے ہاتھہ سر پر لے جاتا اور اپنی جھبری ٹوپی برابر کرنے لگتا جیسے کسی نے نیند سے جھنجھوڑ کر اٹھا دیا ہو۔

چھوکرے چلاتے ''ایگوشا— موت کا ہرکارہ! ایگوشا کہاں چلے؟ ذرا اپنی جیب تو دیکھو — اس میں موت بیٹھی ہے!،،

وہ اپنی جیب کو دبوچ لیتا، جھکتا، پتھر یا مٹی کا ڈھیلا اٹھاتا اور بڑے بےھنگم پن سے اپنا لمبا بازو ہوا میں لہراتے ہوئے زیرلب کوستا۔ اس کی زبان سے وہی تین گالیاں نکلتیں۔ لڑکوں کی زبان اس معاملے میں ذرا زیادہ سنجھی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی وہ لنگڑاتا لنگڑاتا ان لوگوں کے پیچھے بھاگتا۔ لمبا کوٹ پاؤں میں اٹک جاتا، وہ گھٹنوں کے بل گر پڑتا اور اپنے آپ کو چکٹے چکٹے بازوؤں پر سنبھالتا جو آستینوں سے لکڑیوں کی طرح نکلے ہوئے نظر آتے۔ پھر لڑکےاس پر پتھراؤ کرتے، جو اور ذرا ہمت‌ور ہوتے وہ دوڑکر اس کے نزدیک تک پہونچ جاتے اور اس کے سر پر مٹھیاں بھر بھرکے دھول جھونک کے بھاگ کھڑے ہوتے۔

لیکن ہماری گلی کا غالباً سب سے دردناک منظر ہمارے پرانے مستری گریگوری ایوانووچ پیش کرتے تھے۔ وہ بالکل اندھے ہو چکے تھے اور شہر میں مارے مارے پھرتے اور بھیک مانگ کر دن گذارتے تھے۔ وہ سر اٹھائے خاموشی اور وقار کے ساتھہ پیچھے پیچھے چلتے۔ اور آگے آگے ایک چھوٹی سی بڑھیا ہوتی تھی جس کے سب بال سفید تھے۔ وہ ہر کھڑکی کے سامنے رکتی اور باریک سی، معصوم سی آواز میں کہتی:

''یسوع مسیح کے واسطے ایک غریب اندھے کی مدد کرو لوگو...''

مستری گریگوری کچھ نہ بولتے۔ ان کی سیاہ شیشوں والی عینک بس سامنے کھڑکی کو یا دیوار کو یا جس سے بھی ملاقات ہوتی اس کی صورت تکتی رہتی۔ رنگ سے رنگے ہوئے ہاتھ خاموشی اور سکون کے ساتھ داڑھی پر پھیرتے رہتے لیکن ان کے ہونٹ ہمیشہ بھنچے ہوئے رہتے۔ میں ان کو دیکھتا تو اکثر تھا لیکن ان سخت لبوں سے آواز کبھی نہیں سنائی دیتی تھی۔ یہی خاموشی سب سے زیادہ تکلیف‌دہ تھی۔ میں کبھی ان کے نزدیک نہیں جاتا تھا — ہمت ہی نہیں پڑتی تھی۔ لیکن جب کبھی میں ان کو دور سے دیکھتا تو دوڑا دوڑا گھر جاتا اور نانی اماں کو اطلاع دیتا:

''گریگوری آ رہے ہیں!''

''ہائے!'' وہ زور سے غمناک اور گھبرائی ہوئی آواز میں کہتیں۔ ''اچھا۔ دوڑکے یہ دے آ!''

میں سختی سے انکار کر دیتا۔ پھر وہ خود پھاٹک سے نکل جاتیں اور وہاں کھڑی مستری جی سے دیر تک باتیں کیا کرتیں۔ وہ مسکراتے، داڑھی ہلنے لگتی لیکن کبھی کبھار ایک آدھ لفظ منہ سے نکلتے۔

کبھی کبھی نانی اماں ان کو باورچی خانے میں لے آتیں اور کھانا کھلاتیں۔ ایک مرتبہ انہوں نے نانی سے پوچھا کہ میں کہاں ہوں۔ نانی اماں نے مجھ کو آواز دی لیکن میں بھاگ کر لکڑیوں کے گٹھوں کے پیچھے چھپ گیا۔ میری ہمت نہ پڑی کہ ان سے ملاقات کروں۔ ان کا سامنا کرتے مجھے بہت شرم آتی تھی اور مجھے معلوم تھا کہ نانی اماں کو بھی ان سے شرم آتی تھی۔ صرف ایک بار مستری جی کے متعلق میری ان کی بات چیت ہوئی تھی۔ وہ ان کو پھاٹک تک پہنچا کر واپس آرہی تھیں۔ روتی ہوئی، احاطے سے آہستہ آہستہ چلتی ہوئی، سر جھکا ہوا تھا۔ میں ان کے پاس پہنچا اور ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

''تم ان کو دیکھ کر ہمیشہ کیوں بھاگ کھڑے ہوتے ہو؟''

انھوں نے مجھ سے آہستہ سے پوچھا۔ ''وہ تم کو اتنا چاہتے ہیں اور ایسے بھلے آدمی ہیں۔ ''

''نانا ابا ان کو کیوں کھانا نہیں دیتے؟'' میں نے پوچھا۔

''نانا ابا؟''

وہ رک گئیں اور مجھے اپنے سینے سے لگا کر پیغمبرانہ پیشین گوئی کے ساتھ کہنے لگیں:

''میری بات یاد رکھنا — خدا ہم لوگوں کو اس بات کی سزا دیگا، بہت بڑی سزا دیگا!''

اور وہ غلط بھی نہیں کہہ رہی تھیں۔ تقریباً دس ہی سال بعد جب نانی اماں کا انتقال ہو گیا تو میرے سڑی نانا ابا شہر کی گلی گلی میں بھیک مانگتے نظر آنے لگے، روٹی کے لئے گھر گھر ہاتھ پھیلانے لگے۔

''خدا کے پیارو، کوئی روٹی کا ٹکڑا دو! تھو... و... و، کیا لوگ ہیں!''

ان کے پرانے وجود میں سے صرف یہ حصہ ''تھو... و... و، کیا لوگ ہیں!'' ان کے پاس باقی رہ گیا تھا۔

ایگوشا اور مستری گریگوری کے علاوہ ایک بڑھیا گھٹیا عورت وارونیخا تھی جس کی ایک جھلک ہی مجھے گلی سے بھگا دینے کے لئے کافی ہوتی تھی۔ وہ ہر اتوار کو ہماری گلی میں وارد ہو جاتی — بڑی سی، بھدی سی، اجڑی پجڑی، نشے میں دھت۔ وہ عجیب طریقے سے چلتی تھی جیسے نہ تو اس کے پاؤں چل رہے ہوں، نہ زمین سے چھو رہے ہوں بلکہ طوفانی بادل کی طرح تیر رہے ہوں۔ ساتھ ساتھ وہ اونچی تیز آواز میں گندے گیت گاتی بھی تھی۔ گلی کے لوگ اس کو دیکھتے ہی بھاگتے تھے اور دیواروں کی آڑ یا دوکانوں یا ٹٹیوں کے پیچھے چھپ جاتے تھے — معلوم ہوتا تھا جیسے وہ گلی میں جھاڑو دیتی چل رہی ہو۔ اس کا چہرہ نیلا اور پھولا ہوا تھا، باہر نکلی ہوئی بھوری آنکھیں بڑے خوفناک اور مضحکہ خیز طریقے سے گول گول گھومتی تھیں اور کبھی کبھی وہ چیخ چیخ کر روتی تھی:

''میرے بچے کہاں گئے؟ میرے بچے کہاں ہیں؟''

میں نے اپنی نانی اماں سے پوچھا کہ اس کا کیا مطلب ہے۔

9*

پہلے تو وہ ٹال گئیں ''تم کیا کروگے پوچھه کر؟،، لیکن پھر انہوں نے مختصر الفاظ میں مجھے بتایا که اس عورت کا شوھر پہلے ایک افسر تھا جس کا نام وارونوف تھا۔ لیکن بڑا عہدہ حاصل کرنے کی خاطر اس نے اس عورت کو اپنے افسراعلے کے ھاتھه بیچ دیا جس نے اسے دو سال تک اپنے پاس رکھا۔ جب وہ واپس آئی تو اس کے دونوں بچے – ایک لڑکا، ایک لڑکی – مرچکے تھے اور شوھر سرکاری روپیه جوئے میں ھار کر جیل جا چکا تھا۔ صدمے سے اس کا دماغ قابو میں نہیں رھا اور اس نے شراب پینی اور آوارگی کی زندگی بسر کرنی شروع کر دی۔ اب یه نوبت پہونچ گئی تھی که ھر اتوار کو شام کے وقت پولیس اس کو گلیوں سے پکڑ کر لے جاتی تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں که گھر جیسا بھی تھا بہر حال گلی سے بہتر تھا۔ خاص طور پر دن کے کھانے کے بعد بہت اچھا لگتا تھا جب نانا ابا یاکوف ماموں سے ملنے چلے جاتے تھے۔ نانی اماں کھڑکی کے نزدیک بیٹھه جاتیں، مجھه کو کہانیاں سناتیں اور میرے ابا مرحوم کا ذکر کرتیں۔

نانی اماں نے مینا کا ایک پر کاٹ دیا تھا (جو بلی کے پنجوں سے بچ گئی تھی) اور بڑی ھوشیاری سے اس کی ٹوٹی ھوئی ٹانگ کے بجائے ایک چھوٹی سی لکڑی باندھه دی تھی۔ اب وہ بالکل ٹھیک تھی اور نانی اماں اس کو بات کرنا سکھایا کرتی تھیں۔ کھڑکی کے پاس وہ گھنٹه گھنٹه بھر کھڑی رھتیں اور وہ الفاظ رٹا کرتیں جو وہ مینا کو بولنا سکھاتی تھیں۔

''اچھا لے، اب کہو – مینا کو دلیا دو!،،

مینا مسخرے کی طرح اپنی گول گول آنکھیں نانی اماں کی طرف مٹکاتی، اپنا لکڑی کا پاؤں پنجرے پر مارتی، گردن لمبی کرتی اور کوئل کی طرح کوکتی، کبھی کتے کی طرح بھونکتی، کبھی بلی کی طرح میاؤں کرتی مگر انسانی آوازیں نکالنے میں اس کو سخت جانفشانی کرنی پڑتی۔

''بس بس، بکواس بہت ھوئی،، نانی اماں بڑی سنجیدگی سے کہتیں۔ ''چلو کہو – مینا کو دلیا دو!،،

اگر وہ پردار بندریا کچھه بھی آواز نکال دیتی جو میری نانی

اماں سے تھوڑی سی بھی ملتی جلتی ہوتی تو نانی اماں خوشی سے اچھل پڑتیں اور اپنی انگلی پر ذرا سا دلیا رکھ کر اسے کھلاتیں۔

''شریر میں تجھے خوب جانتی ہوں — بہروپیا، کوئی بات تجھ سے بعید نہیں۔''

اور انہوں نے سچ مچ اس کو بولنا سکھا دیا۔ کچھ عرصے بعد وہ بڑے صاف طور سے دلیا مانگنے لگی اور جہاں نانی اماں کو دیکھتی بس اس طرح چلاتی کہ بالکل لگتا پکار رہی ہے ''ہلو، ہلو''۔

پہلے تو مینا نانا ابا کے کمرے میں ٹنگی رہتی تھی لیکن جب اس نے نانا ابا کی نقل کرنی شروع کر دی تو وہاں سے نکال دی گئی اور ہماری دوچھتی میں پہونچ گئی۔ نانا ابا بڑے زور زور سے نماز پڑھا کرتے تھے۔ اور مینا اپنی زرد چونچ پنجرے کی سلاخوں سے نکالتی اور زور زور سے کہتی:

''چو چو - چوچو - چو چو چو!''

اس سے نانا ابا چڑتے تھے۔ ایک دن وہ نماز چھوڑ چھاڑ اپنے پیر پٹخ پٹخ کر غصے سے چلانے لگے:

''لے جاؤ اس شیطان کو یہاں سے، نہیں تو میں اس کی جان لے لوں گا!''

ہمارے گھر میں دلچسپی کے بہت سے سامان تھے، دل لگنے کو بہت کچھ تھا لیکن کبھی کبھی میرے دل میں ایک گہری سی ہوک اٹھتی تھی اور میرے وجود پر چھا جاتی تھی جیسے مجھ پر کوئی بھاری بوجھ ہو، جیسے میں کسی سیاہ تاریک گھڑے میں بالکل نیچے پڑا ہوں جہاں نہ مجھے کچھ سوجھتا ہو نہ سنائی دیتا ہو نہ محسوس ہوتا ہو، جیسے میری آنکھوں کی روشنی ختم ہو چکی ہو اور میں نیم مردہ ہوں...

۸

اچانک میرے نانا نے یہ مکان شراب خانے کے مالک کے ہاتھ بیچ دیا اور خود کناتنایا گلی میں دوسرا مکان خرید لیا۔ یہ گلی صاف ستھری اور خاموش تھی، راستہ کچا تھا جس پر گھنی گھاس اگی

ہوئی تھی۔ اسی میں سے ہوکر میدانوں کو راستہ جاتا تھا اور دونوں طرف چھوٹے چھوٹے شوخ رنگوں سے رنگے ہوئے مکانات تھے۔

یہ نیا مکان پرانے والے سے زیادہ اچھا اور دلخوش کن تھا۔ سامنے کا حصہ گہرے اور پرسکون سرخ رنگ کا تھا جس میں سے نیچے کی منزل کی تین نیلے رنگ کی چھجے دار کھڑکیاں اور دوچھتی کی جالی‌دار کھڑکی باہر کو نکلی ہوئی اور بائیں طرف دو گھنے درختوں کی شاخیں اور پتیاں چھت پر جھکی ہوئی تھیں۔ احاطے اور باغ میں عجیب عجیب قسم کے کونے کھدرے تھے جیسے وہ خاص آنکھ مچولی کھیلنے کے مقصد ہی سے بنائے گئے ہوں۔ باغ بہت پیارا تھا، بہت بڑا تو نہیں لیکن چاروں طرف بیلوں اور جھاڑیوں سے بھرا ہوا۔ ایک طرف کو حمام تھا — چھوٹا سا، ستھرا سا، جیسے کوئی کھلونا ہو۔ دوسرے کونے میں ایک چوڑا کافی گہرا گڈھا تھا جس میں جھاڑ جھنکاڑ اگ آئے تھے اور اس میں سے پرانے حمام کی بچی کھچی جلی جھلسی باقیات دکھائی دیتی تھیں۔ بائیں طرف کو باغ کی حد کرنل اوفسیانیکوف کے اصطبل سے ملتی تھی اور داہنی طرف کو بیٹلنگ کے شاگرد پیشے کی کوٹھریوں سے۔ حد کا آخری حصہ پیترووونا گوالن کے مکان اور احاطے سے ملتا تھا۔ پیترووونا خوب موٹی تازی تھی، سرخ چہرہ، ہر وقت شور مچایا کرتی اور اس کا وجود گھنٹی کی طرح بجا کرتا۔ اس کا چھوٹا سا مکان بہت پرانا اور اندھیرا تھا۔ اس کی چولیں ہل چکی تھیں، بہت سا حصہ زمین میں دھنس گیا تھا اور چاروں طرف کائی لگی ہوئی تھی۔ دو کھڑکیاں میدانوں کی طرف کھلتی تھیں جن میں گہرے نالے بن گئے تھے۔ اور پھر ان کے آگے دور جنگل کی نیلی نیلی پرچھائیاں دکھائی دیتی تھیں۔ سپاہی سارا سارا دن ان میدانوں میں قواعد کیا کرتے اور خزاں کے سورج کی تپتی دھوپ میں ان کی سنگینیں بجلی کی طرح تڑپا کرتیں۔

ہمارے گھر میں اس طرح کے لوگ بھرے تھے جیسے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ سامنے کے کمرے میں ایک فوجی رہتا تھا۔ وہ تاتاری تھا اور اس کی گول مٹول ناٹی بیوی دن بھر ہنستی اور چلاتی رہتی اور صبح سے شام تک ایک چھتارا بجایا کرتی جس پر شوخ نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔

وہ اکثر اپنی اونچی، کھنکھناتی ہوئی آواز میں یہ گیت گایا کرتی: "جب ہو نفرت تو محبت کیوں ہو۔"

اکیلے عشق میں مزا کیا!
عشق کو ڈھونڈو کوئی دوسرا!
ڈھونڈو کوئی، ڈھونڈو کوئی!
عشق کا پھل انتظار میں ہے،
انتظار میں،
ہائے کتنا میٹھا ہے مزا عشق کا!

اس کا شوہر جو گیند کی طرح گول مول تھا، کھڑکی کے پاس بیٹھا پائپ پیا کرتا، ہر بار کش لیتے وقت اس کے نیلے نیلے گال پھول جاتے، مسکراتی ناچتی ہوئی بھوری آنکھیں گول گول گھومنے لگتیں اور وہ اس طرح کھانستا کہ بھونکنے کی سی آواز نکلتی:

"آخ آخ۔ خوں خوں خوں!"

ایک لمبا سا اداس تاتاری چپراسی والئی اور دو ٹھیلے والے اس شاگرد پیشے کی کوٹھری میں رہتے تھے جو گدام اور اصطبل کے اوپر تھی۔ ان میں سے ایک کو لوگ چچا پیوتر کہتے تھے — چھوٹا سا قد، سفید بال۔ اور دوسرا اس کا گونگا اور بہرا بھتیجا استیوپا تھا۔ استیوپا خوب چکنا مکنا رہا کرتا تھا اور اس کا چہرہ پیتل کی منجھی ہوئی تھالی کی طرح لگتا تھا۔ یہ سب لوگ میرے لئے بالکل نئے تھے اور نئی دلچسپیوں کا سامان نظر آتے تھے۔

لیکن میرے لئے سب سے زیادہ دلچسپ ہستی "بہت خوب" کی تھی۔ ان کا کمرہ باورچی خانے کی پشت پر تھا اور وہ ہمارے ساتھ ہی کھانا کھاتے تھے۔ ان کا کمرہ لمبا سا تھا۔ اس میں دو کھڑکیاں تھیں۔ ایک کھڑکی باغ میں کھلتی تھی اور دوسری احاطے میں۔

وہ دبلے پتلے ذرا جھکے ہوئے آدمی تھے۔ ان کی سیاہ ڈاڑھی دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی اور داڑھی کی سیاہی کی وجہ سے چہرے کی زردی اور بھی بڑھ گئی تھی۔ ان کی آنکھوں میں شفقت تھی، عینک لگاتے تھے، عام طور پر خاموش رہتے تھے اور دخل در معقولات نہیں

کرتے تھے - جب ان کو اطلاع دی جاتی تھی کہ کھانا تیار ہے یا چائے تیار ہے تو ہمیشہ کہتے تھے:

''بہت خوب - ''

نانی اماں نے ان کا نام ''بہت خوب'' رکھہ دیا تھا - اور پیٹھہ پیچھے ان کو یہی کہتی تھیں ، بلکہ سامنے بھی کہہ دیتی تھیں -

''جاؤ ''بہت خوب'' سے کہو چائے پی لیں آکے!'' یا ''آپ اور لیجئے نا ''بہت خوب'' صاحب! آپ تو کچھہ کھا ہی نہیں رہے - ''

ان کے کمرے میں بہت سے لکڑی کے بکس ٹھسے ہوئے تھے اور غیر مذہبی کتابوں کے ڈھیر - طرح طرح کے رنگوں کے عرق سے بھری ہوئی بوتلیں، سیسے، لوہے اور تانبے کے ٹکڑے ادھر ادھر بکھرے رہتے تھے - وہ ہمیشہ سرخ رنگ کی چمڑے کی جیکٹ اور بھورے رنگ کا چارخانےدار پتلون پہنے رہتے تھے - کپڑوں پر ہمیشہ پالش کے چھینٹے نظر آتے اور ایک عجیب قسم کی بدبو ان میں سے ہمیشہ آیا کرتی - صبح سے شام تک وہ کھڑے سیسہ پگھلایا کرتے، تانبے کے ٹکڑے جوڑا کرتے، اپنے چھوٹے سے کانٹے میں کچھہ نہ کچھہ تولا کرتے، خوں خوں کرتے جاتے، کبھی انگلی جلا لیتے اور پھر اس پر جلدی جلدی پھونکیں مارتے ہوئے دیوار پر ٹنگے ہوئے نقشہ کی طرف ٹھوکر کھاتے ہوئے جاتے ، عینک پونچھتے اور اتنے غور سے اس کو پڑھتے کہ سفید لمبی، قلم نما ناک خاکے سے بالکل جالگتی - کبھی کبھی کھوئے ہوئے بالکل خاموش بیچوں بیچ کمرے میں یا کھڑکی کے پاس کھڑے ہو جاتے اور آنکھیں بند کئے دیر تک اسی طرح کھڑے رہتے — خاموش بے حس و حرکت، سر اٹھائے -

میں احاطے میں سے ہوکر برآمدے کی چھت پر چڑھہ جاتا اور کھلی ہوئی کھڑکی میں سے میز پر رکھے ہوئے چراغ کی نیلی لو مجھے نظر آنے لگتی اور اس پر ان کے جھکے ہوئے جسم کا تاریک سایہ - وہ ایک پرانی سی نوٹ‌بک میں کچھہ لکھتے دکھائی دیتے اور ان کی عینک کے شیشے سرد برف کے آسمانی رنگ کے ٹکڑوں کی طرح چمکا کرتے -

اس شخص کے ساحرانہ انداز کا مجھ پر اتنا اثر ہوتا کہ میں گھنٹوں چھت پر چپکا رہتا اور دل میں کچھ معلوم کرنے کی سخت چبھن محسوس ہوتی۔

کبھی کبھی وہ چو کھٹے میں لگی ہوئی تصویر کی طرح کھڑکی میں کھڑے ہو جاتے، پیچھے ہاتھ باندھے چھت کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھتے رہتے لیکن وہ مجھے کبھی نہ دیکھتے۔ اس سے مجھے کوفت ہوتی۔ ایک‌دم سے اچھل کر وہ میز کے نزدیک پہونچ جاتے اور وہاں اپنی چیزوں اور کاغذات کو جلدی جلدی الٹ پلٹ کرکے کچھ ڈھونڈنے لگتے۔

اگر وہ امیر ہوتے اور اچھے کپڑے پہنا کرتے تو غالباً مجھے ان سے ڈر لگتا، لیکن وہ غریب تھے۔ بھوری جیکٹ میں سے ان کا میلا، مڑا چڑا کالر باہر جھانکتا رہتا، پتلون میں پیوند اور دھبے تھے، ننگے پاؤں میں پہنے ہوئے جوتے کبھی کے گھس‌پٹ کے بیکار ہو چکے تھے۔ اور غریبوں میں نہ ڈرنے والی کوئی بات ہوتی، نہ ان سے کسی قسم کا خطرہ ہوتا ہے۔ اس بات کا یقین مجھے اس مہربانی سے ہوا تھا جو نانی اماں غریبوں پر کیا کرتی تھیں اور اس حقارت سے ہوا تھا جس کا نانا ابا غریبوں کے لئے اظہار کیا کرتے تھے۔

ہمارے گھر میں ”بہت خوب،، کو کوئی پسند نہیں کرتا تھا۔ ہر شخص ان کا مذاق اور تمسخر سے ذکر کرتا تھا۔ فوجی کی چھبیلی بیوی ان کو ”قلم کی ناک،، کہتی تھی، چچا پیوتر ان کو عطار اور جادوگر کہتے تھے اور نانا ابا کہتے تھے کہ وہ عمل سفلی کرتے ہیں۔

”یہ کیا کرتے ہیں؟،، میں نے اپنی نانی سے پوچھا مگر انہوں نے جلدی سے جواب دیا:

”تم سے واسطہ۔ کسی وقت اپنی زبان بند بھی رکھا کرو۔،،

ایک دن میں اپنی پوری ہمت سے کام لے کر ان کی کھڑکی کے پاس گیا اور بمشکل اپنے اشتیاق کو دبا کر پوچھا:

”آپ کیا کر رہے ہیں؟،،

وہ چونک پڑے اور عینک کے پیچھے سے مجھے گھور کر دیکھا۔ پھر انہوں نے اپنا جھلسا ہوا ہاتھ آگے بڑھایا:

''آؤ - اندر آ جاؤ - ''

انہوں نے جو مجھے دروازے کے بجائے کھڑکی سے اندر آنے کو کہا تو ان کی عزت میری نظروں میں بڑھ گئی - وہ ایک بکس پر بیٹھ گئے، مجھ کو اپنے سامنے بٹھایا، ادھر ادھر گھمایا اور آخرکار پوچھا :

''کہاں سے ٹپک پڑے بھئی تم؟''

یہ سوال بڑا عجیب تھا کیونکہ میں دن میں چار بار ان کے ساتھ کھانے کی میز پر بیٹھتا تھا!

''میں یہاں نواسہ کہلاتا ہوں - ''

''اچھا - ہاں'' انہوں نے کہا اور پھر اپنی ایک جھلسی ہوئی انگلی کو کھوئے ہوئے انداز میں غور سے دیکھنے لگے -

میں نے سوچا کہ معاملہ ذرا اور صاف کردوں :

''لیکن میں کاشیرین نہیں ہوں - میں پیشکوف خاندان سے ہوں -''

''پشکوف؟'' انہوں نے غلط جگہ زور دیتے ہوئے کہا - ''بہت خوب - ''

پھر انہوں نے مجھے ایک طرف دھکیلا، اٹھے اور میز کی طرف گئے -

''اچھا بیٹھ جاؤ - اور دیکھو شور نہ کرنا - ''

میں بڑی دیر تک وہاں بیٹھا دیکھتا رہا کہ وہ کس طرح تانبے کے ٹکڑے کو چمٹے میں پکڑ کر اس کا برادہ بنا رہے ہیں - جب کافی برادہ بن گیا تو انہوں نے اس سنہری ریت کو بٹور کر ایک موٹے سے پیالے میں رکھ دیا - پھر انہوں نے ایک برتن میں نمک کی طرح سفید سفید کوئی سفوف نکالا اور اس کو برادے پر ڈال کے اس پر کوئی سیاہ سیال چیز ڈال دی - پیالہ میں بھرا ہوا مادہ شائیں سے ابل پڑا اور اس میں سے ایسی تیز بو نکلی کہ میں زور زور سے کھانسنے لگا - جادوگر نے ذرا اکڑ کے پوچھا :

''کیوں، بری ہے بو؟''

''ہاں - ''

''آ ہا ہا ہا! پھر تو ٹھیک ہے بھائی - ٹھیک، بہت ٹھیک ہے، بہت اچھا ہے!''

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس میں اترانے کی کیا بات تھی۔
''اگر یہ بری چیز ہے تو پھر کیسے ٹھیک ہے، کیسے اچھا ہے؟''
انہوں نے اپنی آنکھیں جھپکائیں ''ارے ایسے نہ کہو۔ ہمیشہ یہ بات ٹھیک تھوڑا ہی ہو سکتی ہے، بھائی۔ اچھا تم کو گلی ڈنڈا پسند ہے؟''
''گلی ڈنڈا؟''
''ہاں، گلی ڈنڈا۔''
''ہاں ہاں، پسند ہے۔''
''اچھا تمہارے لئے ایک گلی بنادوں؟ خوب ہاتھ صاف کرنا اس پر۔''
''ہاں، یہ بات ٹھیک ہے۔''
''چلو تو ہو جائے گلی ڈنڈا ذرا۔''
وہ دھواں نکلتا ہوا پیالہ ہاتھ میں لئے میرے قریب آئے۔
''میں گلی کو چکنا کرونگا تمہارے لئے۔ مگر تم وعدہ کرو کہ اب یہاں پھر نہیں آؤ گے'' انہوں نے ایک آنکھ سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔
مجھے اس بات سے بہت کوفت ہوئی۔ جل کے اور تن کے بولا:
''میں ویسے بھی اب نہیں آؤں گا۔''
اور باغ کی طرف چلا گیا۔ وہاں نانا ابا سیب کی جڑوں میں کھاد ڈال رہے تھے۔ خزاں اپنے پورے جوبن پر تھی اور درختوں کے پتے گر رہے تھے۔
نانا ابا قینچی میری طرف بڑھاتے ہوئے بولے:
''لو۔ رس‌بھری کی جھاڑیاں تو چھانٹو ذرا۔''
''یہ ''بہت خوب'' کیا بناتے رہتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔
''گندگی پھیلاتا رہتا ہے اور کیا'' وہ غصیلی آواز میں بولے۔ ''سارا کمرہ خراب کر دیا ہے۔ فرش تو جلا ہی ڈالا ہے۔ دیوار کے کاغذ پر دھبے ڈال دئے ہیں، ایک جگہ سے نوچ بھی دیا ہے۔ اس کو چلتا کرنا پڑے گا۔''
میں نے ان سے اتفاق کرتے ہوئے کہا ''ٹھیک ہے'' اور پھر رس بھری کی جھاڑیاں چھانٹنے لگا۔

لیکن بعد کو مجھے معلوم ہوا کہ میں نے یہ کہنے میں جلد بازی سے کام لیا تھا۔

جس شام پانی برستا اور نانا ابا کہیں باہر گئے ہوئے ہوتے تو نانی اماں محفل جماتیں، گھر والے، چپراسی، طرار پیترووونا اور کبھی کبھی تو وہ رنگین مزاج عورت بھی آ جاتی تھی جو وہیں رہتی تھی۔ ایسے میں ''بہت خوب،، ہمیشہ تندور کے پاس کونے میں بیٹھتے تھے — خاموش، بے حس و حرکت۔ گونگے بہرے استیوپا اور تاتاری والئی میں تاش چلتا۔ والئی استیوپا کی ناک پر پتے مارتا اور کہتا:

''شیطان کہیں کے۔ پھوس شیطان!،،

چچا پیوتر ایک بڑی سی ڈبل روٹی اور ایک مرتبان بھر کے رس بھری کا مربہ لاتے۔ روٹی کی قاشیں تراشتے، اس پر مربہ کی موٹی سی تہ جماتے اور اپنی ہتھیلی پر رکھ کر مہمانوں کے سامنے پیش کرتے۔

''لیجئے جناب۔ مہربانی کرکے آپ لوگ خود لیتے جائیے صاحب! تکلف نہ کیجئے،، وہ جھک جھک کر کہتے۔ جب بھی کوئی قاش اٹھا لیتا تو وہ اپنی سنولائی ہوئی ہتھیلی کو الٹ پلٹ کر دیکھتے اور مربہ کا جو بھی ایک آدھ قطرہ لگا ہوتا اس کو چاٹ لیتے۔

پیترووونا چیری کی شراب لاتی اور رنگین مزاج عورت میوہ اور مٹھائی مہیا کرتی۔ اور پھر دعوت شروع ہو جاتی۔ یہ نانی اماں کا بڑا ہی محبوب مشغلہ تھا۔

''بہت خوب،، نے مجھے اپنے کمرے سے دور رکھنے کے سلسلے میں جو رشوت دی تھی اس کے کچھ دن بعد نانی اماں نے اس طرح کی پارٹی کی۔ خزاں کی بارش کی مدھم پھوار پڑ رہی تھی، ہوا تیزی سے چل رہی تھی اور درخت آہیں بھر رہے تھے، لگتا تھا کہ وہ گھر کی دیواروں کو ناخنوں سے کھرچ رہے ہیں۔ باورچی خانے میں بڑی آرام دہ گرمی تھی، لوگ ایک دوسرے سے سٹے بیٹھے تھے اور آج غیرمعمولی طور پر خاموش اور مودب تھے اور نانی اماں بھی آج اپنی کہانیاں غیرمعمولی المناکی اور دلچسپی کے ساتھ بیان کر رہی تھیں۔

وہ تندور پر بیٹھی تھیں، سیڑھی پر پاؤں رکھے، آگے کو لوگوں کی طرف جھکی ہوئی۔ ٹین کے چراغ سے نکلتی ہوئی روشنی سے لوگوں کے

چہرے چمک رہے تھے - جب کبھی وہ جوش میں ہوتی تھیں تو ہمیشہ تندور پر ایک اونچی جگہ پر بیٹھتی تھیں - لوگوں کو سمجھاتے ہوئے وہ کہنے لگیں :

''اونچی جگہ بیٹھ کر اپنی بات سمجھانا زیادہ آسان ہے - اس لئے میں یہاں اوپر بیٹھ کر بات کرتی ہوں - ،،

میں ان کے بعد والی سیڑھی پر بیٹھا تھا، قریب قریب ''بہت خوب،، کے سر کے اوپر - نانی اماں ''ایوان جنگجو اور میرون درویش،، کی دلچسپ کہانی کہہ رہی تھیں - خوبصورت کہانی آہنگ اور روانی کے ساتھ جاری تھی :

کسی زمانے میں گوردین نامی ایک سپہ‌سالار تھا
بےایمان اس کی روح سیاہ تھی اور اس کا دل تھا چٹان -
سچ سے اس کو نفرت تھی، برائی سے محبت تھی
اور برائی کی کھوہ میں بل بنانے کی اسے عادت تھی -
یہ گوردین جس شخص سے سب سے زیادہ نفرت کرتا تھا
وہ میرون درویش کی شخصیت تھی -
میرون امن اور عشق کا دلدادہ تھا
حق اور انصاف کا شیدا تھا -
اب گوردین سپہ سالار نے
اپنے وفادار سپاہی ایوانشکا کو بلایا اور کہا کہ
''جا تو میرون بزرگ کے سامنے
اور اس ضعیف کو ختم کر دے،
اس کے غرور کو بھسم کر دے!
اس کا سر قلم کرنا،
کٹے سر کو داڑھی پکڑ کر اٹھانا اور میرے پاس لانا
اور میرے کتوں کی ضیافت کا سامان کرنا!،،

چنانچہ ایوان فرمانبرداری سے چلا
اور راستے میں سوچتا رہا
''میں پشیمان ہوں، یہ عمل خود نہیں کر رہا ہوں
بلکہ دوسرے کا حکم بجا لا رہا ہوں

اور خداوند تعالی کی مرضی پوری کر رہا ہوں۔"
جب درویش کے پاس پہونچا
تلوار کو کوٹ کے اندر چھپایا،
جھک کر درویش کی خدمت میں آداب بجا لایا بولا:
"اے درویش بزرگ تیرا حال کیا ہے
اور خدا نے اپنی رحمت کا کونسا حصہ تجھہ کو بخش دیا ہے؟"
عالم بزرگ درویش میرون مسکرایا
اور حکمت کے ساتھہ ایوان دلیر کو یوں مخاطب کیا:
"حق سے بڑھہ کر کیا ہے، کیوں تو نے دھوکہ کیا ہے
جبکہ خداوند یسوع مسیح نے تمام باتوں کو دیکھہ لیا ہے
اور خیر و شر دونوں کو اپنے قانون میں رکھا ہے
اور تیرا بدارادہ اس پر واضح ہے۔"
ایوانشکا پشیمان ہوا
لیکن گوردین کے انتقام سے ہراسان ہوا،
چمڑے کی نیام سے تلوار کھینچ لی،
دلیری سے اپنے دامن سے اس کی دھار صاف کی۔
کہا "میں تجھے یہ تلوار دکھانا نہ چاہتا تھا۔
مگر اب تو آخری بار درگاہ خداوندی میں دعا مانگ لے،
ہر انسان کے لئے، اپنے لئے اور میرے لئے
تاکہ اس کے بعد میں تیرا سر پاک قلم کر سکوں۔"
بزرگ درویش دوزانو ہو گیا۔
اس کے گھٹنوں کے پاس شاہ بلوط کا ایک پودا تھا،
جو بزرگ کے سامنے سر جھکا رہا تھا۔
اور بزرگ درویش مسکراتا تھا
اور آہستگی سے کلام کرتا تھا:
"اے ایوان ذرا اپنے دل میں تو سوچ
کہ تجھے کب تک میرا انتظار کرنا پڑے گا۔
انسان کی روح کے لئے جو دعائیں کی جاتی ہیں
وہ بڑی طویل ہیں،
اچھا ہوتا کہ تو میری زندگی پہلے ہی ختم کر دیتا

اور خاتمہ کرکے اپنی راہ جلد لیتا۔،،
یہاں پر ایوان کی پیشانی پر بل پڑ گیا
اور غرور و تمکنت سے بولا:
''جیسا کہا گیا ھے ویسا ھی کیا جائے گا،
تو دعا مانگ، چاھے مجھکو ایک عمر کیوں نہ انتظار کرنا پڑے۔،،
پھر درویش رات آنے تک دعا مانگتا رھا،
رات سے لے کر پو پھٹنے تک دعا مانگتا رھا،
نور کے تڑکے سے لے کر اندھیرا پھیلنے تک دعا مانگتا رھا،
موسم گرما سے لے کر خزاں کے آنے تک دعا مانگتا رھا۔
ایک سال کے بعد دوسرا، اس کے بعد دوسرا
اور اس کے بعد دوسرا سال آتا رھا،
اور بزرگ درویش دعا مانگتا رھا۔
شاہ بلوط پودے سے پیڑ بن کر آسمان سے بات کرنے لگا
اور اس کے بھی بیج جھڑجھڑ کر اور درخت اگ آئے،
درویش کے چاروں طرف جنگل کھڑا ھوگیا۔
پھر بھی اس کی دعائیں عرش کی طرف پرواز کرتی رھیں۔
اور آج تک دور جنگل میں وہ درویش بزرگ
ان تھک دعائیں کر رھا ھے
انسانوں کے لئے خدا کی رحمتیں اور کریمی طلب کر رھا ھے،
پاک بی‌بی مریم سے انسانوں کو
مسکراھٹ بخش دینے کی درخواست کر رھا ھے۔
اور اس کے نزدیک ایوان جنگ‌جو پڑا ھے
تلوار اور نیام خاک اور زنگ سے آلودہ ھے،
زرہ بکتر اور خود کو زنگ کھا گیا ھے،
کپڑے گل چکے ھیں
گرمی سے جھلس چکا ھے، کیڑے لگ گئے ھیں۔
بھیڑیوں کو اس کے بھیانک وجود سے نفرت ھے،
ریچھوں کو اس کے وجود سے حقارت ھے،
طوفان اس کے پاس سے نہیں گذرتے،
برف اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتی۔

وہ اپنی جگہ سے نہ ہٹ سکتا ہے،
نہ ہاتھ اٹھا سکتا ہے، نہ کھڑا ہو سکتا ہے۔
اور یہی اس انسان کی سزا ہے
جس نے کان برائی کی رغبت پر دھرا ہو،
جس نے دوسروں کے کہنے پر اپنے ضمیر کو بیچا ہو۔
اور بزرگ درویش کی دعائیں
ہم گنہ‌گار انسانوں کے حق میں
آج بھی عرش تک پہونچتی ہیں،
آج بھی اس طرح پرواز کرتی ہیں
جیسے چشمہ کی دھاریں
آخرکار سمندر میں جاکر گرتی ہیں۔

میں غور کر رہا تھا کہ داستان کے شروع ہوتے ہی ''بہت خوب،، نہ جانے کس وجہ سے بہت پریشان سے تھے، کبھی عینک اتارتے، کبھی لگاتے، کبھی مثنوی کے اشعار کے ترنم پر عینک گھمانے لگتے، سر ہلاتے، آنکھوں پر انگلیاں رکھتے اور پیشانی اور گالوں پر سے پسینہ پونچھتے۔ اگر کوئی ذرا سا ہلتا یا کھانستا یا فرش پر جوتے رگڑتا تو وہ آہستہ سے مگر بےتابی سے کہتے:

''ش ش ش!،،

جب نانی اماں ختم کر چکیں تو وہ دونوں ہاتھ پھیلا کے بڑبڑاتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور گول گول گھومتے ہوئے خود ہی خود بدبدانے لگے:

''واہ وا! بہت ہی عمدہ! ارے اس کو تو لکھ لینا چاہئے۔ کسی طرح بھی لکھ لینا چاہئے! کس قدر سچ ہے، کس قدر حقیقت!،،

اور اب مجھے یہ بھی صاف نظر آ رہا تھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور بہہ بہہ کر ان کے گالوں پر سے ڈھلک رہے تھے۔ یہ بڑی ہی عجیب بات تھی، بڑا اثر ہوا دل پر۔ وہ باورچی‌خانے میں پھدک رہے تھے اور بار بار عینک لگانے کی کوشش کر رہے تھے جس کی کمانی ان کے کانوں پر بیٹھ ہی نہیں رہی تھی۔ چچا پیوتر ہنسنے لگے۔ لیکن باقی سب لوگوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا

کہ کیا کیا جائے اس لئے بے تکی خاموشی رہی۔ نانی اماں جلدی سے بولیں:

"ہاں ہاں۔ تو پھر لکھونا، اس میں کیا کوئی گناہ تھوڑا ہی ہے۔ میں ایسے بہت سے قصے جانتی ہوں۔"

"نہیں نہیں۔ بس یہ والی! اس میں کیسی روسی روح ہے"، وہ بڑے جوش میں زور سے بولے۔ یکایک وہ بیچوں بیچ کمرے میں کھڑے ہوگئے اور داہنا ہاتھ ہلا ہلا کر زوروں سے بات کرنے لگے، بایاں ہاتھ کانپ رہا تھا اور اسی میں انہوں نے عینک پکڑ رکھی تھی۔ وہ بڑے جوش سے بڑی دیر تک بولتے رہے۔ لفظوں پر زور دینے کے لئے وہ بار بار اپنی آواز بلند کرتے اور پیر پٹکتے۔

"آہ! اپنے ضمیر کو کسی اور کے حوالہ کر دینا کس قدر غلط ہے، کس قدر غلط!"، وہ باربار کہتے۔

پھر یکایک وہ چپ ہو گئے۔ انہوں نے سب پر نظر ڈالی اور چپ چاپ، سر جھکائے مجرم کی طرح نکل گئے۔ لوگ بے تکے پن سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے ہنسے۔ نانی تندور پر دور ہٹ گئیں جدھر سایہ گہرا تھا اور زور زور سے ٹھنڈی سانس لینے لگیں۔

پیتروونا نے اپنے موٹے موٹے سرخ لبوں پر ہاتھ پھیرا اور پوچھا:

"یہ اس کو ہو کیا گیا ہے؟"

"کچھ بھی تو نہیں"، چچا پیوتر نے جواب دیا۔ "یہ تو یہی کیا کرتا ہے۔"

نانی اماں تندور سے اتر پڑیں اور سماوار گرم کرنے لگیں۔

"یہ سفید پوش لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں — سودائی!"، چچا پیوتر نے بڑے اطمینان سے اپنی رائے دی۔ والئی نے لقمہ دیا:

"کنوارے رہنے کا یہی انجام ہوتا ہے۔"

سب ہنسنے لگے۔ چچا پیوتر بولے:

"دیکھو ذرا رو رہا ہے۔ اب کسی کی عادت دال کھانے کی ہو تو پلاؤ کب ہضم ہو۔"

باورچی خانے کے ماحول پر اداسی چھا گئی۔ میرے دل میں بھی غم کی چبھن سی ہونے لگی۔ "بہت خوب"، کو دیکھ کر

مجھے بہت تعجب ہوا تھا اور مجھے ان پر ترس بھی آیا تھا ۔ ان کی آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھیں مجھے بھولتی نہیں تھیں ۔

پھر وہ رات بھر گھر سے غائب رہے اور دوسرے دن بھی کھانے کے وقت کے بعد آئے ۔ ان پر گھبراہٹ طاری تھی اور کچھ عجب سلی دلی سی حالت تھی ۔ ایسا لگتا تھا جیسے اب تمام باتوں سے توبہ کر آئے ہیں ۔ وہ نانی اماں سے اس طرح مخاطب ہوئے جیسے کوئی چھوٹا سا قصور وار بچہ ہو :

''کیا آپ خفا ہیں؟،،

''میں کیوں خفا ہوتی ۔ ،،

''وہ میں نے کل جو بکواس کی تھی؟،،

''تو تم نے کسی کا کچھ بگاڑا تو نہیں ۔ ،،

مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے نانی اماں ان سے کچھ ڈرتی ہیں ۔ انہوں نے ان سے آنکھیں بھی چار نہیں کیں اور اتنی مدھم آواز میں بول رہی تھیں جو بالکل ہی غیر فطری لگ رہی تھی ۔

''بہت خوب،، نانی اماں کے پاس بالکل پہونچ گئے اور بڑی سادگی سے بولے :

''دیکھئے، بات یہ ہے کہ میں بالکل تنہا ہوں، دنیا میں میرا کوئی نہیں! اور جب انسان مدتوں تک کسی سے بات ہی نہ کرے تو پھر ایک لمحہ ایسا آتا ہے جب اس کی روح ساری زنجیریں توڑ کر آزاد ہو جاتی ہے ۔ پھر تو وہ چٹانوں اور درختوں سے بھی باتیں کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے ۔ ،،

نانی اماں ان سے ذرا الگ کھسکتی ہوئی بولیں :

''تم شادی کیوں نہیں کرلیتے ہو؟،،

''آہ!،، وہ ہاتھ سے سنغ کرتے ہوئے زور سے بولے اور پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے باہر چلے گئے ۔

نانی اماں ان کو باہر جاتے دیکھتی رہیں، پھر ایک چٹکی نسوار لی اور مڑ کر مجھ سے بولیں :

''دیکھ! تو اس کے آس پاس مت پھٹکیو ۔ نہ جانے کس طرح کا آدمی ہے ۔ ،،

لیکن جب انہوں کہا ''میں بالکل تنہا ہوں،، تو مجھے پھر ان میں کشش محسوس ہونے لگی۔ میں نے دیکھا کہ ان کا چہرہ کس طرح بدل گیا ہے اور اس بات نے میرے ذہن پر اثر کیا۔ ان کی بات میرے دل کو لگ رہی تھی اور میں ان کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔

پہلے ان کے کمرے کی کھڑکی سے جھانکا۔ کمرہ خالی تھا اور عجیب و غریب چیزیں بکھری پڑی تھیں ــ چیزیں جو اپنے مالک کی طرح ہی عجیب اور بےکار سی لگتی تھیں۔ میں باغ میں گیا۔ تلاش کرتے کرتے وہ مجھے گڑھے میں ملے۔ ایک جلی ہوئی شہتیر پر بےڈھنگےپن سے بیٹھے تھے، گھٹنوں پر کہنیاں ٹکائے، دونوں ہاتھ گردن کے پیچھے کرکے باندھے ہوئے۔ شہتیر تمام خاک‌آلود تھی اور اس کی ایک نوک گھاس پھوس، کانٹوں اور جھاڑ جھنکاڑ سے اوپر کو اٹھی ہوئی تھی۔ یقیناً وہاں بیٹھنے سے ان کو تکلیف ہو رہی تھی اور اس بات سے میں اور بھی ان کی طرف کھنچ گیا۔

کچھ دیر تو وہ الو جیسی اندھی آنکھوں سے خلا میں گھورتے رہے جیسے مجھے انہوں نے دیکھا ہی نہیں۔ پھر ایک دم سے ذرا خفگی کے انداز میں بولے:

''مجھے بلانے آئے ہو؟،،

''نہیں۔،،

''تو پھر کیا ہے؟،،

''کوئی خاص بات تو نہیں ہے۔،،

انہوں نے اپنی عینک اتاری اور اسے ایک رومال سے جس پر سرخ اور سیاہ دھبے پڑے ہوئے تھے، پونچھتے ہوئے بولے:

''اچھا تو پھر آؤ، اتر آؤ!،،

جب میں ان کے برابر میں جاکر بیٹھ گیا تو انہوں نے مجھے کھینچ کر گلے لگا لیا۔

''آؤ بیٹھو۔ بس ہم لوگ بیٹھیں گے۔ کہیں گے کچھ نہیں۔ ٹھیک ہے؟ اس طرح۔ تم ہو بڑے ضدی لڑکے؟،،

''ہاں۔،،

''بہت خوب!،،

10*

ہم لوگ بغیر بات‌چیت کئے بیٹھے رہے - وہ شام بڑی خاموش اور لجیلی تھی -- آغاز خزاں کی اداس شام جب پھول آنکھوں کے سامنے مرجھاتے نظر آتے ہیں، جب زمین سے گرمی کی نرم خوشبوئیں اٹھہ جاتی ہیں اور صرف سیلن کی نمناک اور ٹھنڈی مہک رہ جاتی ہے - ہوا عجیب طرح شفاف ہو جاتی ہے، کوے آسمان کی شفق میں ڈوبتے جاتے ہیں اور اداس خیالات کے بادل ذہن میں اڈنے لگتے ہیں - ہر چیز پر ایک سناٹا اور بےزبانی کا عالم طاری تھا - مدھم سے مدھم آواز— پرندےکے پروں کی سرسراھٹ، کسی پتے کے ٹوٹ کے گرنے کی آھٹ سے بھی وہ گونج ہوتی تھی کہ انسان چونک پڑے اور چاروں طرف دیکھنے لگے - اور پھر سناٹے میں ڈوب جائے جیسے سناٹے نے پوری دنیا کو اپنی آغوش میں لے لیا ہو -

ایسے ھی لمحات میں وہ خیالات پیدا ہوتے ہیں جو پاکیزہ تو ہوتے ہیں مگر اتنے نازک، ایسے شفاف جیسے مکڑی کا جالا، جنہیں الفاظ کے تاروں میں باندھا نہیں جا سکتا، جو شہاب‌ثاقب کی طرح چمک اٹھتے ہیں اور پھر ڈوب جاتے ہیں، جو کسی روح میں غم کے بیج بوتے ہیں، کبھی اس کو گلے لگاکر تسکین دیتے ہیں اور کبھی اس کو چھیڑ دیتے ہیں جس سے روح ابل ابل کر صاف ہوتی جاتی ہے اور مستقل پیچ‌وخم اختیار کرتی ہے — ایسے ھی لمحات میں کردار ڈھلتے ہیں -

اپنے ساتھی کے گرم جسم سے لپٹا ہوا میں بھی اس کے ساتھہ سیب کی ٹہنیوں کی سیاہ جالیوں کے پار جھانکتا اور دیکھتا رہا کہ سرخ سرخ آسمان کے پس‌منظر میں فاختائیں ہوا میں تیر رہی ہیں، ھدھد گاجروں کے ٹھونٹوں میں چونچ مار رہے ہیں، بھورے بھورے بادلوں کے چیتھڑے اور ان کے زرد زرد گالے کھیتوں کے اس پار سے اس پار گذر رہے ہیں اور ان کے نیچے سے کوؤں کی قطاریں اپنے گھونسلوں کی سمت بڑھتی جا رہی ہیں - یہ تمام سماں خوب تھا — ذہن پر حدد‌رجہ چھا جانے والا -

کبھی کبھی میرا ساتھی ایک آہ بھرتا اور کہتا:

”کیوں بھائی ہے نا شاندار؟ سردی تو نہیں لگ رہی‌ہے؟ ایں؟،،

جب آسمان پر سیاہی چھا گئی اور تمام چیزیں رات میں گھل مل گئیں تو انھوں نے کہا:

''ہم سمجھتے ہیں اتنا کافی ہے۔ ہے نا؟ آؤ چلیں۔''

جب ہم لوگ باغ کے پھاٹک پر پہنچے تو وہ رک گئے۔

''یہ جو تمھاری نانی ہیں نا بڑی عجیب و غریب عورت ہیں،'' انھوں نے کہا۔ ''آہ، کیا دنیا ہے!''

پھر وہ آنکھیں بند کرکے مسکرانے لگے اور بہت آہستہ سے مگر بہت صاف آواز میں بولے:

اور یہی اس انسان کی سزا ہر
جس نے کان برائی کی رغبت پر دھرا ہو،
جس نے دوسروں کے کہنے پر اپنے ضمیر کو بیچا ہو۔

''یہ یاد رکھو بھائی ضرور!''

پھر مجھے آگے کو دھکیلتے ہوئے پوچھا:

''تم کو لکھنا آتا ہے؟''

''نہیں۔''

''تو سیکھو۔ اور جب سیکھ جاؤ تو جو کچھ تمھاری نانی سناتی ہیں نا لکھ لینا۔ یہ سب بہت ضروری ہے۔''

اس کے بعد میں اور وہ پکے دوست بن گئے۔ اور اس کے بعد جب میرا جی چاہتا تو ''بہت خوب'' کے یہاں پہنچ جاتا۔ چیتھڑوں سے بھرے ہوئے ایک بکس پر بیٹھ جاتا اور ان کو بے روک ٹوک کے دیکھتا رہتا۔ وہ یا تو سیسے کا برادہ پگھلاتے رہتے یا تانبہ گرم کرتے رہتے۔ جب وہ خوب دھک جاتا تو ایک نہائی پر رکھ کر چھوٹی چھوٹی پلیٹیں بناتے۔ پھر وہ ایک ریتی اور ریگ مال اور طرح طرح کی ریتیوں سے خوب گھسائی کرتے۔ ان میں سے ایک ریتی ایسی باریک تھی جیسے بال۔ وہ تمام چیزیں ننھی ننھی ترازوؤں میں تولتے۔ سفید پیالوں میں عرقوں کو ملاتے اور کمرہ بدبودار دھویں سے بھر جاتا۔ پھر ایک بڑی سی کتاب میں کچھ ادھر ادھر دیکھتے، کچھ بدبداتے اور اپنے سرخ ہونٹ کاٹتے یا آہستہ سے گاتے:

آہ اے گل شاراں

''یہ آپ کیا بنا رہے ہیں؟''

''ایک چیز ۔ ''

''کیسی چیز ؟''

''اب دیکھو بھئی، میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ کس طرح تم کو سمجھاؤں جو تمہاری سمجھ میں ٹھیک سے آ جائے ۔ ''

''نانا ابا کہتے ہیں کہ آپ شاید جعلی روپیہ بناتے ہیں...''

''نانا ابا؟ ہوں! یہ سب یوں ہی ہے ۔ روپیہ بھی کوئی ایسی چیز ہے بھائی کہ جس کی خاطر تکلیف اٹھائی جائے !''

''مگر آپ یہ بتائیے کیا روپیہ کے بغیر آپ روٹی خرید سکتے ہیں؟''

''ہاں، روٹی تو اس کے بغیر نہیں خریدی جا سکتی ۔ ''

''اور نہ گوشت...''

''ہاں گوشت بھی نہیں ۔ ''

وہ چپکے چپکے ہنسنے لگے جو مجھے بہت اچھا لگتا تھا اور اس طرح میرے کان اینٹھے جیسے میں کوئی پلہ ہوں ۔

''بھئی تم سے ہم نہیں جیت سکتے ۔ تم تو بس بولتی بند کر دیتے ہو ہمیشہ ۔ رہنے دو، اب بات ہی نہیں کرتے...''

کبھی کبھی وہ کام روک دیتے اور میرے قریب آ کر کھڑکی کے نزدیک بیٹھ جاتے جہاں ہم دونوں دیکھتے رہتے کہ سیب کے درختوں سے پتے گر رہے ہیں یا گھاس سے بھرے ہوئے احاطے میں پھوار پڑ رہی ہے ۔ ''بہت خوب''، باتیں کم کرتے تھے لیکن جو بات کہتے تھے وہ پتے کی ۔ کبھی کبھی وہ مجھے کسی خاص چیز کی طرف توجہ دلانا چاہتے تو صرف کہنی مارتے اور اس چیز کی طرف صرف آنکھ مار کر یا ایک نظر ڈال کر اشارہ کر دیتے ۔

مثلاً مجھکو اپنے احاطے میں کوئی خاص بات نظر نہیں آتی تھی لیکن ان کے اس طرح کے متعدد اشاروں سے اور کبھی کبھی کہے ہوئے الفاظ سے یہ ہوا کہ اب میں جس چیز کو بھی دیکھتا اس کے خاص خاص پہلو میرے لئے اہمیت اختیار کرکے ذہن پر نقش ہو جاتے ۔ ایک مرتبہ ایک بلی احاطے کے اس پار سے اس پار دوڑ رہی تھی ۔ رستے میں پانی کا چھلا تھا ۔ وہ رکی اور اس میں اپنی پرچھائیں دیکھ کر اس پر حملہ کرنے کے لئے پنجہ اٹھایا ۔ ''بہت خوب''، آہستہ سے بولے :

''افوہ ۔ بلیاں بھی کس قدر مغرور اور خودسر ہوتی ہیں ۔ ''
سنہری مائل سرخ رنگ کا مرغا سمائی ایک بار اڑا اور جنگلہ پر جا بیٹھا اور پر پھڑپھڑائے، گرتے گرتے بچا، جھنجھلایا اور آگے کو گردن بڑھا کر زور سے ککڑوں کوں ککڑوں کوں کرنے لگا ۔
''دیکھو اپنے کو اہم سمجھ رہا ہے، جنرل ٹھیرا نا ۔ مگر کچھ زیادہ عقل نہیں پائی ہے بیچارے نے ۔ ''
والئی کیچڑ میں چل رہے تھے، گڑبڑا گڑبڑا کر کچھ عجیب طرح گھوڑوں کی طرح بھاری قدم اٹھا رہے تھے ۔ باربار اپنا چوڑا پھولا ہوا منہ اٹھا اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھتے اور آنکھیں میچ لیتے، خزاں کے سورج کی ایک کرن ٹھیک ان کے سینے پر پڑ کر جیکٹ میں لگے ہوئے پیتل کے بٹن کو چمکا رہی تھی ۔ تاتاری رکا اور بٹن کو اپنی ٹیڑھی میڑھی انگلیوں سے چھونے لگا ۔
''ایسا لگتا ہے جیسے ابھی سینے پر تمغہ لگائے چلے آرہے ہیں ۔ ''
مجھے جلدی ہی یہ احساس ہوگیا کہ ''بہت خوب'' سے مجھے بہت محبت ہوگئی ہے ۔ اب وہ میرے تمام غموں اور خوشیوں کا ایک ضروری عنصر بن گئے تھے ۔ وہ خود تو فطرتاً خاموش تھے لیکن جو کچھ میرے جی میں ہوتی وہ مجھے کہنے سے کبھی نہ روکتے ۔ اس کے برخلاف نانا ابا میری بات کاٹ دیا کرتے تھے:
''بس، بند کر اپنی ٹرٹر! دماغ میں ہوا ہی بھرگئی ہے ۔ ''
نانی اماں اپنی فکروں میں خود ہی ایسی گھری رہتی تھیں کہ وہ دوسروں کی بات کیا سنتیں، کیا سمجھتیں ۔
لیکن ''بہت خوب'' ہمیشہ میری بات غور سے سنتے اور اکثر مسکرا کر کہتے:
''یہ تو سچ نہیں بھئی ۔ یہ تو تم نے گڑھا ہے ۔ ''
ان کے چھوٹے چھوٹے فقرے بہت ہی فی‌البدیہہ اور برمحل ہوتے تھے جیسے ان کو معلوم ہو کہ میرے دل‌ودماغ پر کیا گذر رہی ہے ۔ الفاظ لبوں پر آتے بھی نہ تھے کہ ان کو صحیح اور غلط کا پتہ چل جاتا تھا ۔ اور اس بات کو سمجھتے ہی وہ بس چند الفاظ میں خاتمہ کر دیتے تھے، تیز الفاظ جو بڑے پیار سے کہے جاتے تھے:

''بھئی تم جھوٹ بول رہے ہو!،،

کبھی کبھی میں ان کی اس ساحرانہ طاقت کو آزمانے کے لئے جھوٹ کہانیاں گڑھتا اور سچ بنا کر بیان کرتا۔ لیکن ایک منٹ سننے کے بعد وہ لا محالہ طور پر سر ہلاتے اور کہتے:

''بھئی تم جھوٹ بول رہے ہو۔،،

''آپ کو کیسے معلوم؟،،

''ارے مجھے خوب معلوم ہے۔،،

نانی اماں اکثر مجھے سینایا چوک لے جایا کرتی تھیں جہاں پانی کا نل تھا۔ وہاں سے وہ پانی لایا کرتی تھیں۔ ایک دن ہم نے دیکھا کہ وہاں شہر کے پانچ آدمی ایک کسان کو پیٹ رہے ہیں۔ انہوں نے اس کو زمین پر گرا دیا تھا اور کتوں کی طرح اس سے لپٹے ہوئے تھے۔ نانی اماں نے بہنگی سے بالٹیاں نکال کر الگ کیں اور بہنگی کا ڈنڈا لے کر لپکیں اور مجھ کو انہوں نے آواز دی:

''بھاگ بھاگ!،،

اور خود ان شہریوں پر ٹوٹ پڑیں۔ لیکن مجھے ڈر لگ رہا تھا۔ لہذا میں ان کے پیچھے دوڑا اور دشمن پر پتھر برسانے لگا۔ نانی اماں نے بڑی جرأت کے ساتھ بہنگی کے ڈنڈے سے ان کو کونچنا اور سر اور کندھوں پر مارنا شروع کیا۔ اور لوگ بھی لڑائی میں شریک ہوگئے اور شہریوں کو مار کے بھگا دیا گیا۔ نانی اماں نے کسان کے زخم دھوئے۔ اس کا چہرہ بری طرح کچل گیا تھا۔ آج تک اس منظر کو یاد کرکے مجھے کپکپی ہونے لگتی ہے کہ کس طرح وہ غریب کسان اپنی گندی انگلیوں سے اپنی پھٹی ہوئی ناک دبائے تھا اور کھانستا روتا جا رہا تھا اور خون اس کی آنگلیوں پر سے بہہ بہہ کر میری نانی کے چہرے اور سینے پر لگ گیا تھا۔ وہ خود بھی زور زور سے چیخ اور کانپ رہی تھیں۔

جب ہم لوگ گھر پہونچے تو میں دوڑ کر ''بہت خوب،، کے پاس پہونچا اور ان کو سب حال بتانے لگا۔ انہوں نے اپنا کام روک دیا اور ہاتھ میں ایک ریتی تلوار کی طرح تولے ہوئے کھڑے رہے۔ عینک کے نیچے سے وہ بڑے غور اور سختی کے ساتھ مجھے تکتے رہے، پھر ایک دم سے غیرمعمولی جوش کے ساتھ بولے:

''کمال ہے! ایسا ہی ہوا تھا، ایسا ہی - بہت اچھے، بہت اچھے!''

میں اس واقعہ سے اور جو کچھ میں نے دیکھا تھا اس سے اتنا زیادہ متاثر تھا کہ میں نے غور ہی نہیں کیا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں - لیکن اپنی کہانی جاری رکھی - انہوں نے مجھے اپنے بازوؤں میں لے لیا اور ادھر ادھر ٹہلنے لگے:

''بس اتنا کافی ہے، کافی ہے! تم کو جو کچھ کہنا تھا کہہ چکے! سمجھے؟ کافی ہے -''

میں بولتے بولتے چپ ہوگیا - شروع میں تو مجھے ان کے اس طرح روک دینے سے کوفت ہوتی لیکن جب میں نے معاملہ پر غور کیا تو اس نتیجہ پر پہونچ کر حیران رہ گیا کہ انہوں نے مجھے اس وقت روکا جبکہ میں درحقیقت سب کچھ کہہ چکا تھا -

''ایسی باتیں سوچ سوچ کر اپنے دماغ کو پریشان نہ کیا کرو'' وہ بولے - ''ایسی باتیں یاد نہیں رکھتے، بھول جانے کی کوشش کرو!''

بعض وقت وہ غیرمتوقع طور پر ایسی باتیں کہہ دیتے تھے جو مجھے زندگی بھر یاد رہیں - نروایا کوچہ کا ایک لڑکا تھا کلیوشنیکوف جو ان لڑکوں میں تھا جن سے میری مستقل جنگ چھڑی رہتی تھی - وہ بھاری بھرکم تھا اور سر بڑا - میں اور وہ ایک دوسرے کے مدمقابل تھے، نہ مجھ سے وہ جیت سکتا تھا نہ میں اس سے - ''بہت خوب'' کو جب میں نے اپنی اس مشکل سے آگاہ کیا تو انہوں نے غور سے سن کر جواب دیا:

''انہہ بیکار! ایسی قوت کس کام کی! یہ بھی کوئی طاقت ہے! اصلی مضبوطی تو یہ ہے کہ پھرتی ہو - جتنی پھرتی ہوگی اتنا ہی انسان مضبوط ہے - سمجھو؟''

چنانچہ اگلے اتوار کو میں نے اپنی مکابازی میں زیادہ پھرتی استعمال کی اور کلیوشنیکوف کو خوب چاٹ دی - اس بات سے میرے دل میں ''بہت خوب'' کی رائے کی عظمت اور بھی بڑھ گئی -

''ہر چیز کو حاصل کرنے کی صلاحیت ہونی چاہئے - سمجھے؟ یہ بہت مشکل کام ہے — کچھ حاصل کرنا - ہے کام مشکل!''

ان کی اس طرح کی اور بھی بہت سی باتیں مجھے یاد رہتی تھیں اگرچہ اس وقت میں ان کا مطلب اچھی طرح نہیں سمجھتا تھا۔ غالباً وہ باتیں مجھے اس لئے یاد رہ جاتی تھیں کہ ان میں ایک عجیب قسم کی پریشان کن سی پراسراریت ہوتی تھی اور ساتھہ ھی سادگی بھی۔ پتھر اٹھانے میں، یا روٹی کا ٹکڑا ھاتھہ میں لینے میں، یا کوئی پیالہ یا ھتھوڑی سنبھالنے میں آخر ایسی بات ھی کیا تھی۔

ھمارے گھر کے لوگوں کو رفتہ رفتہ ''بہت خوب،، سے اور زیادہ نفرت ھوتی چلی گئی یہاں تک کہ ان رنگین‌مزاج خاتون کی پالتو بلی جو ھر ایک کے پاس چلی جاتی تھی ''بہت خوب،، کے گھٹنوں پر بیٹھنے سے انکار کر دیتی تھی۔ وہ اس کو پیار سے بلاتے لیکن وہ کبھی نہ جاتی۔ میں نے اس بات کے لئے اس کو مارا بھی اور اس کے کان بھی کھینچے یہاں تک کہ ان سے خوف نہ کھانے کےلئے اس کو بہلانے میں کھسیا کھسیا کے رو تک پڑا لیکن وہ راہ پر نہ آئی۔

''میرے کپڑوں سے تیزاب کی بو آتی ھے اس لئے یہ میرے پاس نہیں آتی،، وہ بولے۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ گھر کے سب لوگوں کا، نانی اماں سمیت، کچھہ اور ھی رویہ تھا۔ وہ سب کے سب ''بہت خوب،، کے خلاف تھے اور مجھے یہ بات بہت ھی غلط اور تکلیف‌دہ محسوس ھوتی تھی۔

نانی اماں غصے میں بھر کر پوچھتیں:

''تو اس کے آس پاس کیوں منڈلایا کرتا ھے اے؟ ذرا ھوشیار رھنا۔ ورنہ تجھے بھی مداری پنا سکھا دیگا۔،،

سرخ بالوں والے نانا ابا کو تو جب کبھی پتہ چلتا کہ میں ''بہت خوب،، کے یہاں گیا ھوں تو مجھے بڑی بےدردی کے ساتھہ بیدوں سے مارتے۔ ظاھر ھے کہ میں نے ''بہت خوب،، کو تو نہیں بتایا کہ مجھے ان سے ملنے کو منع کیا جاتا ھے لیکن لوگوں کے جو خیالات ان کے متعلق تھے وہ میں البتہ ان کو بتا دیا کرتا تھا۔

''نانی اماں آپ سے ڈرتی ھیں۔ وہ کہتی ھیں کہ آپ عمل‌سفلی کرتے ھیں۔ نانا ابا بھی یہی کہتے ھیں۔ وہ کہتے ھیں کہ آپ خدا سے منحرف ھیں اور لوگوں کا آپ سے تعلقات رکھنا خطرناک ھے۔،،

انہوں نے اپنا سر ھلایا جیسے مکھی اڑا رھے ھوں، پھیکے

چہرے پر مسکراہٹ سے سرخی آ گئی جس کو دیکھ کر میرا دل ڈوبنے لگا، سر چکرانے لگا۔

''میں یہ سب کچھ سمجھتا ہوں بھئی۔ بڑی بری بات ہے۔ ہے نا؟،، انہوں نے آہستہ سے کہا۔

''ہاں ہاں۔ ،،

''بہت بری بات ہے۔ ،،

آخرکار لوگ ان کو نکال کر ہی رہے۔

ایک دن صبح ناشتے کے بعد میں نے دیکھا کہ وہ سامان باندھ رہے ہیں۔ وہ زمین پر بیٹھے تھے اور اپنی چیزیں ایک بکس میں رکھتے ہوئے گنگناتے جا رہے تھے ''آہ اے گلشاراں،،۔

''اچھا بھئی، الوداع۔ ہم تو جا رہے ہیں۔ ،،

''کیوں؟،،

جواب دینے سے پہلے انہوں نے ایک منٹ مجھے غور سے دیکھا۔

''کیا تمہیں نہیں معلوم؟ یہ کمرہ تمہاری ماں کے لئے درکار ہے۔ ،،

''کون کہتا ہے؟،،

''تمہارے نانا ابا۔ ،،

''وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ ،،

''بہت خوب،، نے مجھے گلے لگا لیا اور جب میں ان کے نزدیک فرش پر بیٹھ گیا تو آہستہ سے بولے:

''خفا نہ ہونا۔ میں سمجھا کہ تم کو سب کچھ معلوم ہے اور تم نے مجھ سے کہا ہی نہیں۔ بھائی، میں نے سوچا، یہ بات ٹھیک نہیں...،،

میرے دل پر سخت چوٹ لگی۔

پھر وہ مسکراکے بہت ہی مدھم آواز میں بولے:

''سنو۔ تم کو یاد ہے نا کہ میں نے تم سے کہا تھا کہ مجھ سے نہ ملا کرو؟،،

میں نے اقرار کرتے ہوئے سر ہلایا۔

''تم کو اس وقت میری بات سے تکلیف پہونچی تھی؟ ہے نا؟،،

''ہاں۔ ،،

''میرا یہ منشا ہر گز نہ تھا۔ لیکن مجھے یہ معلوم تھا کہ اگر تم مجھ سے دوستی کروگے تو تم پر سختی کی جائے گی۔''

وہ اس طرح بات کر رہے تھے جیسے میرے ہم‌عمر ہوں اور مجھے ان کے الفاظ نے بڑی مسرت بخشی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جو بات وہ مجھ سے کہہ رہے تھے وہ مجھے بہت پہلے سے معلوم تھی۔

''یہ تو مجھے بہت پہلے سے معلوم تھا!'' میں نے کہا۔

''بھئی واہ، خوب۔ تو دیکھ لو بھائی، یہ معاملہ ہے۔ ہوں!''

میرے دل میں ناقابل برداشت درد اٹھ رہا تھا۔

''لیکن لوگ آپ کو کیوں پسند نہیں کرتے؟''

انہوں نے مجھے بھینچ کر گلے لگا لیا اور زور زور سے آنکھیں جھپکاتے ہوئے بولے:

''کیونکہ میں ان کی طرح جو نہیں ہوں۔ سمجھے؟ ساری بات یہی ہے۔ میں ان کی طرح نہیں ہوں۔''

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہوں۔ خاموشی کے ساتھ ان کی آستین سے کھیلتا رہا۔

''دیکھو غصہ نہ کرنا'' وہ آہستہ سے بولے۔ پھر میرے کان میں دھیمے سے کہنے لگے ''اور آنسو بھی نہ بہانا۔''

لیکن خود ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے جو عینک کے دھندلاتے ہوئے شیشوں سے گذر کر گالوں پر ڈھلک رہے تھے۔

اس کے بعد ہم دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ ہاں کبھی کبھار ہمارے منہ سے ایک آدھ بات نکل جاتی۔

اس شام سب سے بڑی محبت سے رخصت ہوکر اور مجھے خوب گلے لگاکر وہ چلے گئے۔ میں پھاٹک سے باہر نکلا۔ جیسے ہی گھوڑاگاڑی کے پہئے برف کی نالیوں پر آکر ٹکے وہ پھرتی سے اس پر چڑھ گئے۔ ان کے جانے کے ساتھ ہی نانی اماں نے گندے کمرے کو صاف کرنا شروع کردیا اور میں جان بوجھ کر ایک کونے سے دوسرے کونے میں بھاگتا پھرنے لگا کہ ان کی صفائی میں اڑچن لگاؤں۔ وہ ایک بار مجھ سے ٹکرائیں:

''ارے ہٹ!''

''آپ لوگوں نے ان کو کیوں نکال دیا؟،،
''تجھه سے ان باتوں سے واسطه؟،،
''تم سب احمق ہو - سب! آوے کا آوا،، میں نے کہا - وہ ایک بھیگے چیتھڑے سے مجھه کو بھگانے لگیں :
''ارے تو کیا تو بالکل ہی پاگل ہو گیا ہے! ہیں کیوں؟،،
''تمہارے سوا سب پاگل ہیں،، میں نے کہا - لیکن وہ اس بات سے خوش نہیں ہوئیں -
کھانے کی میز پر نانا ابا پھر بولے :
''افوہ - چلو اچھا ہوا جو وہ چلا گیا! میں تو جب اس کو دیکھتا تھا تو کلیجے میں چھری سی لگتی تھی، کسی نه کسی طرح تو نکالنا ہی تھا اسے!،،
مجھے اتنا غصه آیا که میں نے ایک چمچه توڑ ڈالا اور پھر اس بات پر میری خوب سرمت ہوئی -
اس طرح میری وہ دوستی ختم ہوئی جو ان بےشمار انسانوں میں سے ایک سے تھی جو اپنے وطن میں اجنبی ہیں، وہ انسان جو مادر وطن کے بہترین فرزند ہیں -

۹

اگر میں اپنے بچپن کو تشبیه دینا چاہوں تو شہد کے چھتے سے تشبیه دینا چاہئے جس میں بہت سے عام اور معمولی انسانوں نے اپنے معلومات اور تجربات کا شہد نچوڑا اور ہر ایک نے میرے کردار کے ارتقا اور نشوونما کے سرمایه میں اضافه کیا - اکثر یه شہد میلا بھی ہوتا تھا اور تلخ بھی لیکن چونکه وہ معلومات کا ہی حصه ہوتا تھا اس لئے ہوتا تھا شہد ہی -
''بہت خوب،، کے چلے جانے کے بعد میں نے چچا پیوتر سے دوستی کی پینگیں بڑھانی شروع کیں - وہ نانا ابا کی طرح سوکھے ہوئے تھے اور ان ہی کی طرح صاف ستھرے رہتے تھے - نانا سے بھی ٹھگنے قد کے تھے - معلوم ہوتا تھا که کسی لڑکے نے مذاقاً بڑے بوڑھوں جیسا لباس پہن رکھا ہے - ان کا چہرہ چمڑے کے باریک تاروں سے بنے ہوئے

پنجرے کی طرح لگتا تھا جس میں سے جھانکتی ہوئی ان کی جھلملاتی ہوئی آنکھیں دو ننھی ننھی چہچہاتی ہوئی چڑیوں کی طرح لگتی تھیں ۔ ان کے سفید بال گھونگریالے تھے، داڑھی چھلے دار تھی ۔ وہ پائپ پیا کرتے تھے جس میں سے ان کے بالوں کے رنگ کا دھواں نکلا کرتا تھا ۔ یہ دھواں پیچ کھاتا ہوا ان کے سر پر صدقےواری ہوا کرتا ۔ ان کی باتیں لچھے دار ہوتیں، دھویں کی طرح، اور محاوروں سے سجی ہوئی ۔ ان کی آواز بھنبھناتی ہوئی تھی جو ویسے تو نرم اور محبتبھری لگتی تھی لیکن مجھے ہمیشہ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ لوگوں کا مذاق اڑا رہے ہوں :

''شروع میں میں جن بیگم صاحبہ کے یہاں ملازم تھا ان کا نام تاتیان تھا، باپ کے نام کی وجہ سے الیکسئیونا تھا ۔ وہ کہتیں ''لوھاری کا کام سیکھہ لے،، ۔ لیکن لوھاری بس شروع کی ھی تھی کہ کہنے لگیں ''باغ میں مالی کو کام میں مدد دیا کرو،، ۔ مجھے اس پر بھی کوئی اعتراض نہ تھا ۔ مگر وہ جو کہتے ھیں نا کہ ایک ٹھکانہ نہیں تو کچھہ نہیں ۔ ایک بار وہ کہنے لگیں کہ ''پیوتر تم مچھلی پکڑنا کیوں نہ سیکھہ لو،، ۔ میں نے کہا ''چلو یہی ٹھیک ہے،، ۔ لیکن بس جیسے ھی مچھلیوں پر ذرا ھاتھہ جمنے لگا تو مجھے اٹھا کر شہر پھینک دیا گیا کہ ٹھیلہ چلاؤ ۔ تو بھئی ہم اس طرح ٹھیلے والے بن گئے اور اب جو چاھو کہو اور کرواؤ ۔ لیکن اس کے بعد مجھے کسی اور کام پر لگانے کا موقع نہیں ملا کیونکہ زرعی سدھار نے سارا معاملہ ھی الٹ دیا ۔ میں آزاد ھو گیا تو انہوں نے بس اٹھا کر گھوڑا ھمارے حوالے کر دیا ۔ اور اب تک ھم بیگم صاحبہ کے بجائے گھوڑے کی چاکری کر رہے ھیں ۔،،

یہ گھوڑا بوڑھا اور سفیدی مائل تھا گویا کسی مصور نے نشہ کے عالم میں پچرنگا برش اس پر جابجا مار دیا ھو، جیسے کوئی بےھنگم سا صرفہ جس کے پاؤں ٹیڑھے ھوں، چمڑا ڈھیلا ڈھالا، پٹھے کھچے ھوئے اسپرنگ کی طرح ۔ ان میں گردن جڑی ھوئی اور گردن سے لٹکتا ھوا ھڈیلا سر جس میں دھندلی دھندلی آنکھیں جڑی ھوئی ۔ چچا پیوتر اس گھوڑے کے ساتھہ نہایت احترام سے پیش آیا کرتے تھے، اس کو کبھی نہیں مارتے تھے اور اس کا نام ''تانیا،، رکھہ چھوڑا تھا ۔

نانا ابا نے ایک دفعہ ان سے پوچھا بھی کہ گھوڑے کا نام مسیحی نام کیوں رکھا، وہ تو جانور ہے۔ انہوں نے جواب دیا:

''نہیں تو واسیلی واسیلیوچ! ھرگز نہیں۔ تانیا مسیحی نام ھے ھی نہیں۔ مسیحی نام تو تاتیانا ھے نا!،،

چچا پیوتر کو پڑھنا بھی آتا تھا اور انجیل کی ان کو خوب معلومات تھیں۔ میرے نانا اور وہ اکثر خوب بحثا کرتے تھے کہ معصومین میں سب سے زیادہ معصوم کون تھا۔ انجیل میں جن گنہگاروں کا ذکر تھا ان پر بے دردی سے فیصلے صادر کئے جاتے۔ خاص طور پر ابسولم پر سب سے زیادہ لعنت بھیجی جاتی۔ کبھی ان دونوں کی بحث میں محض الفاظ اور قواعد کے پہلوؤں پر زیادہ زور دیا جاتا۔ میرے نانا کہتے ''بدمعاشیت،، ''غیرقانونیت،، ''بت‌پرستیت،، اور چچا پیوتر کہتے کہ نہیں ان لفظوں کا اصلی تلفظ ''بدمعاشی،، ''غیرقانونی،، ''بت‌پرستی،، ھے۔

''تمہارا قاعدہ تمہارے ساتھہ اور میرا قاعدہ میرے ساتھہ!،، نانا ابا غصے میں سرخ ھو جاتے، منہ پھول جاتا۔ ''تمہاری ایسی کی تیسی!،،

لیکن چچا پیوتر بڑے پرسکون طریقے سے بیٹھے پائپ پیا کرتے اور اس کا دھواں ان پر صدقے واری ھوا کرتا۔

''تمہاری ''ت،، ھی کون سی بہتر ھے،، وہ حقارت کے ساتھہ کہتے۔ ''خدا کی نظر میں یہ کون بڑھہ کر ھے۔ ھو سکتا ھے خدا تمہاری نمازوں کو سن کر کہتا ھو کہ ھاں لمبی چوڑی تو بہت ھیں یہ نمازیں لیکن قیمت میں کوڑی برابر نہیں!،،

نانا ابا مجھہ پر چلائے ''الیکسئی، تم بھاگو یہاں سے،،۔ ان کی سبز آنکھیں چمکنے لگتیں۔

پیوتر کو صفائی ستھرائی اور باقاعدگی بہت پسند تھی۔ جب بھی وہ احاطے میں چلتے پھرتے تو رستے میں پڑی ھوئی لکڑیاں یا ھڈیاں پاؤں سے ادھر ادھر سرکا دیتے اور منہ بنا کر بدبداتے جاتے:

''تو یہ کسی کام کا نہیں یہ کوڑا۔ جب دیکھو تب پاؤں میں آتا رھتا ھے!،،

وہ خوب باتیں کیا کرتے تھے اور دیکھنے والوں کو ایسا محسوس

ہوتا کہ بڑے ملنسار اور خوش مزاج ہیں لیکن کبھی کبھی ان کی آنکھوں میں مردوں کی آنکھوں کی طرح دھندلاپن چھا جاتا۔ اور اکثر ایسا ہوتا کہ وہ کسی تاریک اور اندھیرے کونے میں خاموش اور رنجیدہ بیٹھے دکھائی پڑتے اپنے گونگے بہرے بھتیجے کی طرح۔

''کیا بات ہے چچا پیوتر؟''

''دور ہو''، وہ اکتائی ہوئی سختی کے ساتھ جواب دیتے۔

پھر ہماری گلی میں ایک مکان میں ایک آدمی آکر ٹھہرا جس کے ماتھے پر گومڑا تھا اور اس کی ایک عجیب و غریب عادت تھی۔ اتوار کے دن وہ کھڑکی میں بیٹھ جاتا اور بندوق سے کتوں، بلیوں، مرغیوں اور کوؤں یہاں تک کہ اگر موج آجاتی تو انسانوں پر بھی چھرے کا نشانہ لگایا کرتا۔ ایک دن اس نے ''بہت خوب''، کو نشانہ بنایا۔ چھرا ان کے چمڑے کے جیکٹ میں سے تو خیر نہیں پار ہوا لیکن اس کے کچھ ٹکڑے جیب میں رہ گئے۔ مجھے یاد ہے کہ انہوں نے جیب میں سے کچھ ٹکڑے نکال کر ہاتھ پر رکھ کر غور سے دیکھا بھی تھا۔ نانا ابا نے ان سے کہا کہ پولیس میں اطلاع دیں لیکن انہوں نے وہ ٹکڑے باورچی خانے کے ایک کونے میں پھینک دئے اور بولے:

''چھوڑو بھی۔ اب کون اس کے لئے جھنجٹ کرتا پھرے۔''

اگلی بار نشانہ باز نے نانا ابا کی ٹانگ پر چھرا جڑ دیا۔ نانا ابا کو بے حد غصہ آیا۔ انہوں نے اس جرم کی اطلاع پولیس میں کر دی اور ان گواہوں کو اکٹھا کرنا شروع کیا جو نشانہ بن چکے تھے۔ لیکن وہ حضرت یکایک غائب ہو گئے۔

جب کبھی بھی اس شخص کی بندوق کی آواز آتی تو چچا پیوتر جلدی سے اپنی پرانی بڑے بڑے کنگورے والی ہیٹ جو وہ اتوار کو پہنا کرتے تھے، پہن لیتے اور پھاٹک سے باہر نکل جاتے۔ باہر رستے پر پہونچ کر وہ اپنے کوٹ کے پچھلے حصوں کے نیچے ہاتھ ڈال کر ان کو دونوں طرف سے مرغے کی دم کی طرح اٹھا لیتے، توند آگے کو نکال لیتے اور بڑی شان سے قدم اٹھاتے اس نشانہ باز کے گھر کے سامنے سے گذرتے۔ ہمارے گھر کے سب لوگ تماشہ دیکھنے کے لئے پھاٹک پر اکٹھا ہو جاتے۔ کھڑکی سے فوجی کا زرد چہرہ جھانکتا نظر

آتا اور اس کے اوپر بیوی کا روشن چہرہ دکھائی دیتا۔ بیٹلنگ کے یہاں سے بھی سب لوگ اپنے احاطے میں اکٹھے ہو جاتے۔ صرف اوفسیانیکوف کا مکان بے جان کھڑا رہتا۔

بعض مرتبہ چچا پیوتر کے چکر بیکار جاتے۔ ظاہر ہے کہ نشانہ‌باز ان کو اپنے نشانے کے لائق نہیں سمجھتا، لیکن کبھی کبھی اس کی بندوق کی دھائیں سنائی دے جاتی۔

کبھی کبھی چچا پیوتر اسی طرح آهسته چلتے ہوئے هم لوگوں تک آ پہونچتے اور بڑے اطمینان سے رپورٹ پیش کرتے:

''بس کوٹ کی نوک میں لگی!،،

ایک دن چھرا ان کی گردن اور کندھے میں لگا۔ نانی اماں سوئی سے چھرے کا سیسہ نکالتی ہوئی بولیں:

''بھلا تم ایسے مجنون کو کیوں چھیڑتے ہو؟ کسی دن چھرا مارکے آنکھیں نکال لےگا!،،

''ارے نہیں، اکولینا ایوانوونا،، چچا پیوتر نے حقارت سے جواب دیا۔ ''وہ بھی کوئی نشانہ‌باز ہے!،،

''پھر بھی اس کو یہ فتح کا احساس کیوں دو؟،،

''اس کا احساس؟ میں تو اسے چھیڑنے کے لئے کرتا ہوں۔،،

پھر اپنی ہتھیلی پر چھرے کے ٹکڑوں کو غور سے دیکھتے ہوئے بولے:

''بالکل نشانہ باز نہیں وہ۔ اب وہ بیگم صاحبہ جو تھیں نا تاتیان الیکسئی‌ونا، تو وہ یوں هی عارضی شادیاں کر لیا کرتی تھیں۔ وہ تو نوکروں کی طرح شوہر بدلتی تھیں۔ تو انہوں نے ایسی هی عارضی شادی ایک فوجی سے کی تھی جس کا نام ماموںنت ایلیچ تھا۔ وہ تھا البتہ نشانہ باز! نانی اماں، وہ تو صرف گولیاں چلاتا ہے۔ یہ جو پگلا ایگنشکا ہے نا اس کو وہ دور کھڑا کر دیتا تھا، کوئی چالیس قدم پر، اور اس کی پیٹی میں ایک بوتل لٹکتی رہتی تھی دونوں ٹانگوں کے بیچ میں۔ اور ایگنشکا تو تھا هی احمق۔ کھڑا کھل کھل هنسا کرتا۔ پھر ماموںنت ایلیچ نشانہ لگاتے — اور ڈز! سیدھی بوتل میں جاکر لگتی۔ صرف ایک بار ایسا هوا تھا کہ شاید ایگنشکا کو مکھی وغیرہ نے کاٹا تو وہ هل گیا اور گولی اس کے گھٹنے پر لگی، هڈی پر!

پھر لوگوں نے جلدی سے ڈاکٹر کو بلایا اور پلک جھپکتے میں پاؤں کاٹ دیا گیا، یوں! اور اس کو دفنا دیا گیا۔،،

''اور ایگنشکا؟،،

''ارے وہ ٹھیک تھا۔ احمق کو ھاتھ پاؤں کی ایسی ضرورت بھی کیا ھے۔ وہ تو اپنی حماقت پر زندہ رھتا ھے۔ بیوقوفوں کو سبھی چاھتے ھیں۔ یہ بے چارے بے ضرر جو ھوتے ھیں نا، وہ جو کہتے ھیں نا کہ نہ بدھی ھوگی نہ برائی ھوگی۔ ،،

اس کہانی سے میری نانی اماں پر تو کوئی خاص اثر نہیں ہوا — ان کو ایسے درجنوں واقعات معلوم تھے — لیکن میرے تو رونگٹے کھڑے ھوگئے۔ میں نے پیوتر سے پوچھا:

''کیا یہ بھی ھوتا تھا کہ کوئی بڑا آدمی کسی کو جان سے بھی مار ڈالے؟،،

''کیوں نہیں؟ بالکل مار سکتا تھا۔ ایک دوسرے کو بھی مار ڈالتے تھے۔ ایک دفعہ ایک اور فوجی افسر تاتیان الیکسئیونا سے ملنے آیا تو اس کی لڑائی ماسونت سے ھوگئی۔ بس دونوں نے پستول سنبھالے اور پارک میں چلے گئے اور وھاں جھیل کے کنارے روش پر اس فوجی افسر نے جو ماسونت کو دی ھے تو سیدھی جگر میں جاکے لگی! ڈز! خیر، ماسونت شہید مرا اور فوجی افسر کو قفقاز میں جلا وطن کر دیا گیا۔ اور بس یہ خاتمہ ھوا! تو دیکھا تم نے ایک دوسرے کو بھی مار ڈالتے ھیں یہ لوگ! اور جہاں تک کسانوں اور اس طرح کے لوگوں کا سوال ھے وہ تو — تھو — جتنے چاھو مار ڈالو، خاص کر اب آجکل جب اسامی کمیرے نہیں ھوتے ھیں۔ پہلے تو ذرا پھر بھی خیال کرتے تھے کیونکہ آخرکار کسان ان ھی کی جائداد اور ملکیت ھوتے تھے!،،

''تب بھی کون بہت پرواہ کرتے تھے،، نانی اماں بیچ میں بولتیں۔

''بالکل صحیح ھے۔ جائداد تو تھے مگر کس قدر حقیر اور سستی جائداد تھے۔ ،،

چچا پیوتر مجھ سے خاص مہربانی سے پیش آیا کرتے تھے اور بڑوں کے مقابلے میں مجھ سے زیادہ محبت سے اور آنکھیں چار کرکے

بات کیا کرتے تھے لیکن ان میں کچھ ایسی بات تھی جو مجھے نہ جانے کیوں اچھی نہیں لگتی تھی - جب وہ ہم لوگوں کو اپنا پسندیدہ سربہ کھلاتے تو دوسروں کے مقابلے میں میری روٹی پر زیادہ موٹی تہ جماتے - بازار جاتے تو میرے لئے سونٹھہ کی ٹکیاں لے آتے، خشخاش لے آتے اور ہمیشہ مجھہ سے بہت سکون اور سنجیدگی سے بات کرتے -

''کہو مردخدا، ہم بڑے ہوں گے تو کیا بنیں گے — کلرک یا سپاهی؟،،

''سپاهی - ،،

''هاں تمہارے لئے ٹھیک ھے - آجکل سپاهی بننا کوئی ایسی مشکل بات نہیں ھے اور پادری لوگ بھی تو مزے میں رہتے ھیں — بس ادھر آئے ادھر گئے اور پکارنے لگے ''تعریف ھو خدا کی،، اور بس! پادری بننا تو سپاهی بننے سے بھی زیادہ آسان ھے - لیکن سب سے آسان مچھیرا بننا ھے - اسے کچھہ جاننے سیکھنے کی ضرورت ھی نہیں ھے - بس عادت ڈال لے — بس!،،

وہ بڑے مزے میں نقل کرتے تھے کہ مچھلی کانٹے کے چاروں طرف کس طرح گول گول گھومتی ھے اور روھو اور بام اور سال جب پھنستی ھیں تو کس کس طرح پیچ و تاب کھاتی ھیں اور کیسی کشمکش کرتی ھیں -

''اب دیکھو نا جب تمہارے نانا تم کو پیٹتے ھیں تو تم بالکل خفا ھو اٹھتے ھو - ھے نا؟،، وہ مجھے تسکین دینے والے انداز میں کہتے - ''لیکن بھلے آدمی ایسے معاملے میں پاگل ھونے کی بالکل کوئی وجہ نہیں ھے - یہ تمہارے ھی فائدہ کے لئے ھے اور ویسے یہ پٹائی ھے بھی بالکل بچوں کا کھیل - لیکن ھاں وہ تاتیان الیکسئی‌ونا کی بات البتہ تھی - وہ جو تم کو پٹواتی تو پتہ چلتا - وہ اس کام کے لئے ایک خاص ملازم رکھتی تھی - اس کا نام کریستوفر تھا - وہ ایسا ماھر تھا اس فن میں کہ آس پاس کے زمیندار بیگم صاحبہ کو کہلا کہلا کر بھیجا کرتے تھے — تاتیان الیکسئی‌ونا ذرا فلاں کو پٹوانا ھے، مہربانی کرکے اپنے کریستوفر کو ذرا عاریتاً دے دیتیں! وہ اس کو بھیج دیتی تھی - ،،

وہ بڑے اطمینان سے جذباتی ھوئے بغیر تفصیل سے بیان کرتے

11*

کہ کس طرح بیگم صاحبہ اُپنی کوٹھی کے بڑے بڑے ستونوں والے بر آمدے میں سرخ آرام کرسی پر بیٹھتیں، جسم پر صاف شفاف سفید لباس ہوتا، کندھوں سے نیلے رنگ کا گلوبند لپٹا ہوتا اور اس طرح وہ اپنے اسامی مردوں اور عورتوں کے کریستوفر کے ہاتھہ سے چابکیں کھانے کا نظارہ کرتیں۔

''یہ کریستوفر ریازان کا رہنے والا تھا، خانہ‌بدوش یا یوکرینی قسم کا تھا، مونچھ ایک کان سے دوسرے کان تک اور داڑھی مونڈنے سے چہرہ نیلا نیلا۔ اور معلوم نہیں سچ مچ ہی اس کا دماغ چلا ہوا تھا یا یوں ہی مفت‌خوری کے لئے بن گیا تھا۔ باورچی خانے میں گھس آیا، کسی برتن میں پانی لیا، ایک مکھی یا تل‌چٹا یا کوئی بھی کیڑا لیا اور اس کو پانی میں ڈبوکر مار رہا ہے — لکڑی کی نوک سے دبائے جا رہا ہے، دبائے جا رہا ہے۔ کبھی اپنی کالر میں سے کوئی چیلر نکال لیتا اور اسی کو ڈبونے لگتا...،،

میں نے اپنے نانا ابا اور نانی اماں سے ایسی بہت سی کہانیاں سنی تھیں، اسی لئے میں ایسی کہانیوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ یہ کہانیاں مختلف ہوتے ہوئے بھی اس ایک بات میں ایک ہی سی ہوتی تھیں — کہ ان میں انسان کی ذلت اور صعوبت کا ذکر بھرا ہوتا تھا۔ مجھے ایسی کہانیوں سے متلی ہوتی تھی۔

''کوئی اور سی کہانی کہئے!،، میں کہتا۔

چچا پیوتر نے اپنے چہرے کی ساری جھریاں سکیڑ کر منہ کے پاس اکٹھی کر لیں اور پھر حامی بھری تو سب پھیل کر آنکھوں کے آس پاس چلی گئیں۔

''اچھا اچھا لالچی — لو اور سی۔ ایک بار ہمارے یہاں ایک باورچی تھا...،،

''کس کے یہاں؟،،

''بیگم صاحبہ تاتیان الیکسئی‌ونا کے یہاں۔ ،،

''آپ ان کو مردوں کی طرح تاتیان کیوں کہتے ہیں؟ وہ مرد تو نہیں تھیں نا؟ یا تھیں؟،،

''نہیں نہیں۔ وہ تو خاتون تھیں بلکہ — ان کے مونچھہ تھی، چھوٹی سی، کالی۔ وہ سانولے جرمنوں کی اولاد تھیں، وہ قوم کچھہ

خانہ بدوشوں کی سی ہوتی ہے۔ اچھا خیر۔ تو پھر ہمارا جو یہ باورچی تھا نا... اچھا اب یہ کہانی بڑی مزے دار ہے جناب عالی...''

اور بعد میں معلوم ہوا کہ یہ مزے دار کہانی یوں تھی کہ ایک بار باورچی نے کوئی سالن خراب کر دیا تھا تو اس کو یہ سزا دی گئی کہ وہ سارا خراب سالن اس کو ایک دم کھلایا گیا جس کے نتیجے کے طور پر اسے خوب قے آئی۔

مجھے کوفت ہوگئی۔ بولا:

''اس میں کیا مزےدار ہے؟''

''تو پھر مزے دار ہوتا کیا ہے؟''

''معلوم نہیں۔''

''تو پھر اپنی چونچ بند رکھو!''

اور پھر انہوں نے وہی اپنی پرانی اکتا دینےوالی کہانیاں کہنی شروع کر دیں۔

کبھی کبھی میرے ماموں زاد بھائی اتوار کو ہم لوگوں سے ملنے آ جایا کرتے تھے — میخائل ماموں کا مرجھایا کمہلایا ہوا ساشا اور یاکوف ماموں کا صاف ستھرا اور سمجھدار ساشا۔ ایک دن ہم تینوں شاگرد پیشے کی چھتوں پر چڑھے ٹامک ٹوئیاں مار رہے تھے کہ ہم لوگوں کی نظر بیٹلنگ والے احاطے میں گئی۔ وہاں ایک صاحب لکڑی کے ایک ڈھیر پر چڑھے بیٹھے کتے کے کچھ پلوں سے کھیل رہے تھے۔ وہ جسم پر تو ایک لمبا سا سبز کوٹ پہنے ہوئے تھے جس میں سمور کا استر لگا ہوا تھا لیکن سر ننگا تھا اور چھوٹی سی پیلی چندیا خوب چمک رہی تھی۔ میرے بھائیوں میں سے ایک کی رائے ہوئی کہ ایک پلا اڑا لیا جائے۔ فوراً پلان بن گیا۔ ترکیب یہ تھی کہ میرے دونوں بھائی باہر گلی میں جاکر بیٹلنگ والے پھاٹک کے پاس چھپ کر کھڑے ہو جائیں اور میں ان بھلے آدمی کو کسی طرح ڈراکے وہاں سے بھگاؤں۔ جب وہ بھاگ جائیں تو میرے بھائی موقع پاکر دوڑ پڑیں اور ایک پلا لے اڑیں۔

''لیکن میں ان کو وہاں سے بھگاؤں گا کیسے؟'' میں نے سوال کیا۔

''ارے اس کی چندیا پر تھوک دینا'' میرے بھائیوں میں سے ایک نے رائے دی۔

میں نے بڑے بڑے جرائم ہوتے دیکھے تھے اور سنے تھے اس لئے میرے نزدیک چندیا پر تھوکنا کوئی ایسا سنگین جرم نہ تھا۔ اس لئے مجھے اس فرض منصبی کو ادا کرنے میں قطعی پس و پیش نہ محسوس ہوا۔

لیکن اس حرکت پر وہ قیامت مچی کہ بس ھی بس۔ بیٹلنگ کے یہاں سے عورتوں اور مردوں کی ایک فوج نے ہمارے احاطے پر ھلہ بول دیا۔ آگے آگے ایک خوبرو جوان فوجی تھا۔ اور چونکہ جرم کے وقت میرے دونوں بھائی بڑی معصومیت کے ساتھہ گلی میں کھیل رہے تھے اس لئے آئی گئی میرے سر پڑی۔ اور مجھہ کو ھی وہ مار بھی کھانی پڑی جو نانا ابا نے نہایت باقاعد گی اور شان کے ساتھہ مجھہ کو کھلائی تاکہ بیٹلنگ خاندان کی جو ھتک ہوئی تھی اس کا کچھہ ازالہ ہوجائے۔

جب میں باورچی خانے میں تندور کے اوپر تختے پر لیٹا ھوا تھا، خوب پٹا کٹا، زخمی، سارا جسم دکھتا ھوا تو چچا پیوتر مجھے دیکھنے پہونچے — خوب اچھے کپڑے پہنے اور خوب ھشاش بشاش

''واہ جوان، خوب سوجھی!،، انہوں نے آھستہ سے کہا۔ ''خوب ٹھیک کیا، بڈھا بکرا کہیں کا۔ ان سبھوں پر تھوکنا چاھئے! اگر اس کے پچپچے سر پر ایک گما دے مارتے تو اور بھی اچھا ھوتا!،،

میری نظروں میں ان جنٹلمین کا چھوٹا سا، بچوں کا سا چکنا چہرہ پھرنے لگا۔ قیمتی سبز کوٹ پہنے وہ کس طرح کھسیا کھسیا کے چیں چیں کرتے جا رہے تھے اور ننھے ننھے ھاتھوں سے اپنی زرد چندیا پر سے تھوک پونچھتے جا رہے تھے۔ مجھے اس وقت تو اپنے بھائیوں سے سخت نفرت ھوئی تھی اور اپنے آپ سے شرمندگی محسوس ھونے لگی تھی۔ لیکن اس وقت جو میں نے چچا پیوتر کا ٹوکری‌نما چہرہ دیکھا تو سب بھول گیا۔ ان کا چہرہ اسی خوفناک اور نفرت انگیز طریقے سے کانپ رھا تھا جس طرح میرے نانا ابا کا جب وہ مجھے پیٹ رہے تھے۔

''دور ھو!،، میں نے اپنے ھاتھوں اور پاؤں سے انہیں دھکیلتے ہوئے کہا۔ انہوں نے خاموشی سے ھنکارا بھرا، آنکھہ ماری اور تندور پر سے اٹھہ گئے۔

اس وقت کے بعد پھر کبھی میرا جی نہ چاہا کہ ان سے بات کروں بلکہ ان سے پہلو بچانے لگا اور ان پر شبہ کی نظر رکھنے لگا جیسے میں مبہم طور پر کسی آنے والے خطرے کا منتظر ہوں۔

اس واقعہ کے بعد جلد ہی ایک اور واقعہ ہوا۔

مجھے اوفسیانیکوف کے خاندان کے گھر سے جس پر ہمیشہ سناٹا سا چھایا رہتا تھا، ایک پراسرار سی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی جیسے اس پرانے بھورے مکان میں کہیں نہ کہیں پریوں کی کوئی داستان چھپی بیٹھی ہو۔

بیٹلنگ کے گھر میں ہمیشہ خوب شور شغب، چہل پہل رہتی تھی، کئی نوجوان اور خوبصورت لڑکیاں وہاں رہتی تھیں اور بہت سے طالبعلم اور افسران وہاں آیا کرتے اور خوب باتیں کرتے، ہنستے، گاتے اور کھیلتے۔ سارے مکان پر رنگین سی فضا چھائی رہتی، کھڑکیاں چوپٹ کھلی رہتیں، ان میں سے پودوں کی روشن سبزی جھانکتی رہتی اور خاص طور پر نمایاں رہتی۔ میرے نانا ابا کو اس مکان سے نفرت تھی، گھر میں رہنے والوں کو اکثر عام طور سے ''کافر، بے دین'' کہتے اور عورتوں کے لئے ایک خاص فحش لفظ استعمال کرتے۔ اس لفظ کے معنی چچا پیوتر نے ایک دفعہ بڑے فحش انداز میں خوب مزے لے لے کر سمجھائے تھے۔

لیکن اوفسیانیکوف کا جو مکان تھا اس کے وقار اور خاموشی سے نانا ابا نہایت مرعوب تھے۔

یہ اونچا مکان ایک ہی منزل کا تھا اور اس کے پچھلے حصے میں ایک بڑا سا کھلا ہوا احاطہ تھا جس میں سبز گھاس کا فرش بچھا تھا۔ احاطے کے بیچوں بیچ کنواں تھا جس پر دو ستونوں پر ٹکی ہوئی چھت بھی تھی۔ مکان گلی سے کچھ اس طرح الگ تھا جیسے گلی سے چھپ جانا چاہتا ہو۔ مکان کے اگلے حصے کی سجاوٹ تین کھڑکیوں سے ہوتی تھی جو پتلی پتلی تھیں، خم کھائی ہوئی۔ ان کے شیشوں پر سورج کی روشنی پڑتی تو قوس‌قزح کے سے رنگ دمکنے لگتے۔ پھاٹک کے داہنے ہاتھ کو اناج کی ایک کوٹھی بنی ہوئی تھی اور اس میں بھی ان تینوں کھڑکیوں سے ملتی جلتی کھڑکیاں بنی تھیں۔ لیکن یہ کھڑکیاں صرف دکھاوے کی تھیں اور اس طرح بنی تھیں کہ

بھوری دیوار میں چوکھٹے کو جما کر کھڑکی کی شکل دے دی گئی تھی اور پٹ وغیرہ صرف رنگ دئے گئے تھے۔ یہ اندھی کھڑکیاں بہت بری لگتی تھیں اور اناج کی کوٹھی کا وجود بھی گویا یہ ظاہر کرتا تھا کہ یہ مکان کوئی آڑ چاہتا ہے جس کے پیچھے چھپ چھپ کر وہ اپنی زندگی اس طرح بسر کر سکے کہ کوئی اسے نہ دیکھے۔ اناج کی کوٹھی اور خالی اصطبلوں اور ان کے بڑے پھاٹکوں سمیت یہ پوری عمارت ایسی محسوس ہوتی تھی کہ کسی پوشیدہ صدمے کو بڑے باوقار حلم کے ساتھ برداشت کر رہی ہے۔

کبھی ایک لمبا آدمی — داڑھی صفاچٹ، سفید مونچھیں سوئیوں کی طرح نوکدار نکلی ہوئی، احاطے میں ادھر سے ادھر لنگڑا لنگڑا کے چلتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ کبھی کبھار ایک اور آدمی، ٹیڑھی سی ناک، گل مچھے رکھے، ایک بھورے رنگ کے گھوڑے کو اصطبل سے نکالتا ہوا نظر آتا۔ باہر احاطے میں نکل کر یہ گھوڑا جس کا سینہ اور پاؤں بہت دبلے تھے دھیرے دھیرے سر ہلاتا جیسے کسی نیک طبیعت بڑھیا کی طرح، ہر ایک کی طرف محبت سے جھک جھک کر اس کو پہچان رہا ہو۔ بوڑھا اور لنگڑا آدمی اس کو زور زور سے ٹھونکتا، سیٹی بجاتا، پھر ٹھنڈی سانس بھرتا اور پھر گھوڑے کو واپس اندھیرے اصطبل میں بھیجوا دیتا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے یہ بوڑھا اس مکان سے بھاگ جانا چاہتا ہے لیکن کسی افسوں کے تحت وہاں رہنے پر مجبور ہے۔

تقریباً تمام دن، دوپہر سے لے کر شام تک، احاطے میں چھوٹے چھوٹے تین لڑکے کھیلتے رہتے تھے۔ وہ سب ایک سے بھورے پتلون اور کرتے اور ایک ہی سی ٹوپیاں پہنے رہتے تھے اور صورت میں بھی ایک دوسرے سے اس قدر ملتے جلتے تھے کہ میں صرف سائز کے حساب سے ان کو الگ الگ پہچان پاتا تھا — سب کے گول گول چہرے، بھوری بھوری آنکھیں۔

چہاردیواری کے ایک چھید میں سے جھانک کر میں ان کو دیکھا کرتا تھا لیکن اس بات سے مایوسی ہوتی تھی کہ ان کو کبھی میرا پتہ نہیں چلتا تھا۔ وہ لوگ جو کھیل کھیلا کرتے تھے وہ مجھ کو معلوم نہ تھے لیکن جس محبت اور پیار سے وہ مل جل کر کھیلتے

تھے وہ دیکھنا مجھے اچھا لگتا تھا۔ مجھے ان لوگوں کے کپڑے بھی اچھے لگتے تھے اور یہ بات بھی اچھی لگتی تھی کہ وہ لوگ ایک دوسرے کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ خاص طور پر بڑے بھائی سب سے چھوٹے کا بہت خیال رکھتے تھے جو بڑا ھی دلکش اور گل گتھنا تھا۔ اگر وہ گر پڑتا تو وہ لوگ ھنستے تو ضرور تھے۔ جیسے کوئی بھی گر پڑے تو لوگ ھنستے ھی ھیں۔ لیکن ان کی ھنسی میں کوئی کمینہ پن نہ ھوتا تھا۔ فوراً دوڑ کر وہ اٹھنے میں اس کی مدد کرتے اور اس کے ھاتھ اور گھٹنے درخت کے پتوں یا اپنے رومالوں سے جھاڑ کر صاف کرتے۔

"اے بھوندو"، منجھلا والا کہتا۔

نہ وہ لوگ کبھی لڑتے تھے نہ ایک دوسرے کو بیوقوف بناتے تھے اور تینوں کے تینوں مضبوط اور پھرتیلے اور توانا تھے۔

ایک دن میں نے درخت پر چڑھ کر سیٹی بجائی۔ سیٹی کی آواز سن کر وہ کھیلتے کھیلتے تھم گئے، نظریں مجھ پر پڑیں اور ایک دوسرے کے قریب ھو کر کچھ صلاح مشورہ کرنے لگے۔ میرا خیال تھا کہ شاید مجھ پر پتھر پھینکیں گے اس لئے میں درخت سے اترا اور قمیص اور پتلون کی جیب میں خوب روڑے بھر کر پھر درخت پر چڑھا۔ لیکن وہ لوگ احاطے کے ایک دوروالے کونے میں پھر کوئی کھیل کھیل رہے تھے اور غالباً مجھ کو بھول چکے تھے۔ یہ بڑی ھی افسوسناک بات تھی لیکن میں جنگ میں سبقت نہیں کرنا چاھتا تھا۔ اسی وقت کسی نے کھڑکی سے پکارا:

"بچو گھر میں آؤ۔ جلدی!"

وہ لوگ فرمانبرداری کے ساتھ مڑے اور بطخوں کی طرح آھستہ آھستہ چلتے ھوئے روانہ ھو گئے۔

پھر میں احاطے کی چہاردیواری کے پار درخت پر کئی بار اس امید میں چڑھا کہ وہ لوگ مجھے اپنے ساتھ کھیلنے کو بلالیں لیکن انھوں نے کبھی نہ بلایا۔ میں تخیل ھی تخیل میں ان کے کھیلوں میں شریک ھوتا یہاں تک کہ چلانے اور ھنسنے بھی لگتا اور ایسے موقعوں پر وہ تینوں میری طرف دیکھتے اور آپس میں کچھ پھسپھساتے۔ میں بوکھلا کر درخت سے پھسلتا ھوا اتر آتا۔

ایک دن وہ لوگ آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ سنجھلا بھائی چور بنا تھا اور اناج کی کوٹھی کے ایک کونے میں دونوں ہاتھوں سے آنکھیں بند کئے کھڑا تھا تاکہ دکھائی نہ دے اور اس کے دونوں بھائی چھپ رہے تھے۔ بڑا لڑکا تو جلدی سے ایک گاڑی میں چڑھ گیا جو چھجے کے نیچے کھڑی تھی لیکن ننھا بھائی کنویں کے چاروں طرف چکر کاٹنے لگا۔ اس کی سمجھ ھی میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں چھپے۔ اتنے میں جو لڑکا چور بنا تھا اس نے آواز دی:

''ایک... دو...،،

ننھا کنویں کی مینڈھ پر چڑھ گیا، لٹکتی ہوئی رسی پکڑی اور اچھل کر خالی ڈول میں بیٹھ گیا۔ ڈول فوراً نظر سے غائب ہو گیا اور کنویں کی دیواروں سے اس کے ٹکرانے کی آواز آنے لگی۔

میں نے جو دیکھا کہ رسی جلدی جلدی اور خاموشی سے کھلتی جا رہی ھے تو خوف سے میرا خون جم گیا۔ لیکن میں فوراً درخت پر سے احاطے میں کودا اور چیختا ہوا بھاگا:

''ارے وہ کنویں میں گر گیا!،،

سنجھلا بھائی بھی تقریباً میرے ساتھ ھی ساتھ کنویں پر پہونچا اور لپک کے رسی پکڑی، اس کے پیر زمین سے اٹھ گئے اور رسی کی رگڑ سے ہاتھ چھل گئے۔ اتنے میں میں نے بھی رسی پکڑلی اور پھر بڑا بھائی بھی دوڑتا ہوا آ پہونچا اور ہم لوگوں کے ساتھ مل کر ڈول کو اوپر کھینچتا ہوا بولا:

''اتنی زور سے نہ کھینچو!،،

ہم لوگوں نے بچے کو اس میں سے نکالا۔ وہ بری طرح ڈرا ہوا تھا، داھنے ہاتھ کی انگلیوں سے خون جاری تھا، ایک گال پر بھی بڑے بڑے کھرونچے آئے تھے، کمر تک پانی میں بھیگا ہوا۔ چہرے پر موت کی زردی چھائی ہوئی تھی لیکن کانپتا ہوا مسکرا کر بولا:

''میں کیچھا گلا۔،،

''اے بھوندو۔ بیوقوف،، سنجھلے بھائی نے اس کو گلے لگاکے تتلاتے ہوئے کہا اور اس کے چہرے سے خون پونچھنے لگا۔ بڑے والے کے چہرے پر بل پڑ گئے اور بولا:

''چلو، اب تو یہ بات چھپ نہیں سکتی۔ چلو اب چلنا ہی پڑے گا ہم لوگوں کو۔''

''کیا تم لوگوں کو ''چاٹ'' ملے گی؟''

اس نے ہاں کہتے ہوئے سر ہلایا اور اپنا ہاتھ بڑھایا:

''تم بہت تیز بھاگے بھئی!''

میں اس کی تعریف سے اتنا متاثر ہوا کہ اس کا ہاتھ پکڑنا بھی بھول گیا۔ پھر اس نے سنجھلے بھائی سے کہا:

''آؤ بھی، نہیں تو اس کو سردی لگ جائے گی! ہم لوگ کہہ دینگے بس گر پڑا۔ کنویں والی بات کہنے میں کوئی عقلمندی نہیں ہے۔''

''ہاں'' ننھے نے سر ہلایا۔ ''کہہ دیں گے گلھے میں گل پلے۔''

اور وہ لوگ اندر چلے گئے۔

یہ تمام واقعہ اس تیزی سے ہوا کہ جب میں نے مڑ کر درخت کی اس شاخ کو دیکھا جس پر میں بیٹھا تھا تو وہ ابھی تک ہل رہی تھی اور اس کے زرد زرد پتے گر رہے تھے۔

اس کے بعد تقریباً ایک ہفتے تک وہ تینوں بھائی احاطے میں نہیں دکھائی دئیے۔ اور حب دکھائی دئیے تو پہلے سے زیادہ ہشاش بشاش۔ بڑے لڑکے نے جیسے ہی مجھے دیکھا زور سے آواز دی:

''آؤ آؤ۔ ہمارے ساتھ کھیلو!''

ہم سب مل کر چھجے کے نیچے گاڑی میں چڑھ بیٹھے اور بڑی دیر تک وہاں دوستی بگھارتے رہے۔

''کیا مار پڑی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

بڑے نے جواب دیا ''ہاں خوب پڑی۔''

یہ یقین کرنا ذرا مشکل ہی لگتا تھا کہ ان لڑکوں پر بھی میری طرح ''چاٹ'' پڑتی تھی اور میرے خیال میں یہ سخت ناانصافی تھی۔

چھوٹے نے مجھ سے پوچھا:

''تم چڑیاں کیوں پکڑتے ہو؟''

''کیونکہ وہ گاتی بہت اچھا ہیں۔''

''اب مت پکڑنا۔ ان کو آزاد چھوڑ دو کہ جہاں چاہیں جائیں۔ ''

''اچھا۔ اب نہیں پکڑوں گا!''

''مگر پہلے ایک پکڑ کر مجھ کو دے دینا۔ ''

''کونسی؟''

''کوئی اچھی چہچہانے والی۔ پنجرے والی۔ ''

''ہاں تو وہ بلبل ہو سکتی ہے۔ ''

ننھا بھائی بولا:

''بلی جو مار ڈالے گی اس کو اور پھر ابا بھی تو نہیں پالنے دیں گے۔ ''

''ہاں اور کیا'' بڑے نے اس سے اتفاق کیا۔

''تم لوگوں کی ماں نہیں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں'' بڑے نے کہا لیکن منجھلے نے اس کو صحیح کیا:

''ہے، لیکن دوسری ہے۔ ہماری نہیں ہے۔ ہماری مر گئی۔''

''تو اس طرح ماں سوتیلی ماں کہلاتی ہے'' میں نے کہا۔

''ہاں اور کیا'' بڑے نے سر ہلایا۔

تینوں کے تینوں پر ایک اداس سی خاموشی چھا گئی۔

نانی اماں کی کہانیوں سے مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ سوتیلی مائیں کیسی ہوتی ہیں۔ میں ان کی خاموشی کو سمجھ سکتا تھا۔ وہ تینوں اس طرح ایک دوسرے سے لگے سٹے بیٹھے تھے جیسے مٹر کے تین دانے۔ مجھے وہ کہانی یاد آئی جس میں سوتیلی ماں جادوگرنی تھی اور اس نے چالبازی سے اصلی ماں کی جگہ لے لی تھی۔ میں نے ان لوگوں کو تسکین دینے کی کوشش کی:

''پریشان نہ ہو! تم لوگوں کی اصلی ماں آ ہی جائیں گی۔ ''

بڑا لڑکا کندھے ھلا کر بولا:

''کیسے آ جائیں گی؟ وہ تو مر گئیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ ''

ایسا کبھی نہیں ہوتا؟ اے خدا نہ جانے کتنی بار آبحیات چھڑکنے سے نہ صرف مردے جاگ اٹھے تھے بلکہ وہ لوگ بھی جی گئے تھے جن کے سینکڑوں ٹکڑے کر دئے گئے تھے۔ کتنی بار یہ ظاہر ہو چکا تھا کہ یہ موت اصلی موت — خدا کی بھیجی ہوئی موت

نہ تھی بلکہ جادوگروں اور جادوگرنیوں کی بلائی ہوئی موت تھی۔

میں نے نانی اماں کی کہانیوں کا سلسلہ بڑے جوش کے ساتھ بیان کرنا شروع کیا لیکن بڑا لڑکا حقارت سے ھنسا اور بولا:

''ارے یہ ھم نے بھی سنا ھے۔ مگر یہ سب تو کہانیاں ھیں، صرف کہانیاں۔''

اس کے دونوں چھوٹے بھائی خاموشی سے سنتے رھے — ننھے کے چہرے پر بل تھے، ھونٹ بھنچے ھوئے تھے، منجھلا ایک گھٹنے پر کہنی رکھے تھا اور دوسرا ھاتھ ننھے کے گلے میں ڈالے اسے میری طرف جھکائے ھوئے تھا۔

شام کافی آ چکی تھی۔ مکانوں کی چھتوں پر گلابی بادل بیٹھتے جا رھے تھے کہ یکایک وہ سفید مونچھوں والا آدمی ھم لوگوں کے درمیان میں گھس پڑا۔ وہ پادری جیسا لمبا بھورا کوٹ پہنے ھوئے تھا، اس کے سر پر سمور کی ٹوپی تھی۔

''یہ کون ھے؟'' اس نے میری طرف انگلی اٹھا کر کہا۔

بڑے لڑکے نے کھڑے ھوکر نانا ابا کے مکان کی طرف گردن سے اشارہ کیا:

''یہ وھاں سے آئے ھیں۔''

''کس نے اس کو بلایا؟''

تینوں کے تینوں لڑکے فرمانبرداری کے ساتھ گاڑی سے باھر نکل آئے اور گھر کے اندر چلے گئے جس سے مجھے پھر احساس ھوا کہ وہ غلام بطخوں کی طرح تھے۔

بڈھے نے میرے کندھے پکڑے اور احاطے میں سے ھوتا ھوا مجھے پھاٹک پر لایا۔ ڈر کے مارے میری آنکھوں میں آنسو ابل آئے لیکن وہ اتنی تیزی سے چل رھا تھا کہ مجھے رونے کا موقع ھی نہ ملا۔ اب میں گلی میں کھڑا تھا اور وہ پھاٹک پر۔ وہ ایک انگلی اٹھا کر دھمکاتے ھوئے بولا:

''خبردار اب کبھی ھمارے یہاں آنے کی ھمت نہ کرنا!''

میں نے غصے میں جواب دیا:

''تیرے یہاں کون آیا تھا، بڑھے کھوسٹ شیطان؟''

اس نے اپنا لمبا هاتهه بڑھا کر پھر مجھه کو دبوچا اور گلی سے گھر کی طرف لے چلا، رستے میں باربار زور زور سے ایک هی سوال پوچھتا جاتا تھا جیسے ھتھوڑی سر پر مار رھا ھو:

''تیرا نانا گھر پر ھے؟ تیرا نانا گھر پر ھے؟،،

بدنصیبی سے نانا ابا گھر پر هی تھے۔ وہ اس دخل در معقولات کرنے والے بڈھے کے سامنے کھڑے تھے۔ سر اٹھا ھوا، داڑھی آگے کو نکلی هوئی، کرنل کی بجھی هوئی آنکھوں میں دیکھتے هوئے نانا نے کہا:

''اس کی ماں یہاں ھے نہیں۔ میں کام کاج میں پھنسا رھتا ھوں۔ کوئی دیکھنے بھالنے والا نہیں ھے۔ معاف کیجئے گا کرنل صاحب!،،

کرنل صاحب نے ایک ایسی گرج سنائی جو سارے گھر میں گونج گئی، ایڑی پر گھوم گئے اور مارچ کرتے هوئے روانه ھو گئے۔ ذرا دیر بعد میں دھکیلا گیا تو چچا پیوتر کے ٹھیلے میں جا کر گرا۔

''کیوں بھئی پھر پٹائی هوئی؟،، وہ گھوڑے کا ساز کھولتے هوئے بولے۔ ''اب کی بار کیوں پڑی؟،،

جب میں نے ان کو قصه سنایا تو وہ غصے سے لال ھوگئے۔ خوں خوں کرتے ھوئے بولے:

''لیکن تم کو ایسے لوگوں سے دوستی کرنے کی کیا پڑی ھے؟ یه صاحبوں کے بچے، دیکھو ان کی بدولت تمھاری کیا گت بنی۔ اب سے موقع ھو تو تم ان کو اتنی هی رسید کرنا!،،

وہ دیر تک بپھرتے رھے۔ پہلے تو میں اپنے مار کھانے کی وجه سے ان کی بدبداھٹ سے تسکین محسوس کرکے ان سے اتفاق کرتا رھا، لیکن ان کا ٹوکری نما چہرہ کچھه اس مکروہ طریقے سے کانپ رھا تھا که مجھے ایک دم سے خیال آیا که آخر ان لڑکوں بیچاروں نے بھی تو مار کھائی ھوگی اور ظاھر ھے که ان لوگوں نے میرا کچھه بگاڑا نہیں تھا۔

''میں کیوں ان کو پیٹوں؟ وہ اچھے بچے ھیں،، میں نے الٹ کے جواب دیا۔ ''اور تم جو کچھه کہه رھے ھو یه سب جھوٹ کی پوٹ ھے اور بس۔،،

انہوں نے تیز نظروں سے میری طرف دیکھا:
''نکل میرے ٹھیلے سے!،،
''بےوقوف،، میں نے باہر کودتے ہوئے کہا۔
''میں بےوقوف؟ میں جھوٹا؟ ٹھہر۔ تجھے بتاتا ہوں،، وہ مجھے پکڑنے کے لئے احاطے میں دوڑانے لگے لیکن پکڑ نہیں پائے۔ اتنے میں نانی اماں باورچی خانےوالے برآمدے میں نکل آئیں اور وہ ان سے میری شکایت کرنے لگے:
''یہ لونڈا مجھے چین نہیں لینے دیتا۔ زبان سنبھالتا نہیں، وہ مجھے ماں کی گالیاں دیتا ہے۔ مجھ کو دیکھو اور اس کو دیکھو بھلا کیا میں اس کے برابر ہوں؟،،
جب لوگ میرے منہ پر صاف جھوٹ بولتے تھے تو میں کچھ ایسا حیران رہ جاتا تھا کہ ہوش‌حواس کھو بیٹھتا تھا۔ چنانچہ میں جہاں کھڑا تھا وہیں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ الفاظ ہی نہیں مل رہے تھے جو کچھ کہوں۔ لیکن نانی اماں بڑے استقلال سے بولیں:
''اچھا پیوتر، اچھا۔ اب تم بڑھتے ہی چلے جا رہے ہو۔ مجھ سے تو نہ کہنا کہ اس نے تم کو ماں کی گالی دی!،،
نانا ابا اگر ہوتے تو ضرور چچا پیوتر کی بات کا یقین کر لیتے۔
اس دن کے بعد ان کے اور میرے درمیان صرف خاموش اور کینہ‌پرور جنگ کا رشتہ رہ گیا۔ وہ ہر موقع ڈھونڈتے کہ مجھے لگاموں سے یا چابک سے کونچیں یا چاٹ دیں جیسے اتفاق سے ایسا ہوگیا ہو، میری چڑیاں کھول کے اڑا دیتے اور ایک دن تو انہوں نے میری چڑیوں پر بلی لگا دی۔ نانا ابا سے ہمیشہ میری شکایت کرتے رہتے اور اس کا سبب بڑھا چڑھا کر بیان کرتے۔ میرے لئے ناممکن ہو گیا کہ اب میں ان کو کسی اور طرح تصور کر سکوں سوائے اس کے کہ وہ بھی میرے برابر کا لڑکا تھا جس نے اتفاق سے بوڑھوں کا لباس پہن لیا تھا۔ اپنے موقع پر میں بھی ان کی چپلوں سے رسی اور فیتے چپکے سے کھول دیتا اور جب وہ پہننے چلتے تو ساری چپل الگ الگ بکھر پڑتی۔ ایک دن میں نے کالی مرچ پیس کر ان کی ٹوپی میں چھڑک دی اور وہ گھنٹے بھر تک ادھر ادھر چھینکتے پھرے۔ غرضیکہ میں اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی ہر ممکن کوشش کرتا تھا۔ اتوار کے دن

وہ سارا سارا دن میرے خلاف جاسوسی کرتے اور متعدد بار انھوں نے مجھہ کو ''صاحب کے بچوں،، سے ''غیر قانونی،، تعلقات پیدا کرتے ہوئے پکڑا۔ ایسے موقعوں پر وہ سیدھے جا کر میرے نانا سے رپورٹ کرتے تھے۔

میں نے ان لڑکوں سے اپنی دوستی برابر جاری رکھی اور اس میں مجھے بہت لطف آتا تھا۔ نانا ابا کے مکان اور اوفسیانیکوف کے احاطے والی چہار دیواری میں ایک کونہ سا بنتا تھا جس کی آڑ دو درختوں سے ہوتی تھی۔ وہاں رس‌بھری کی جھاڑیاں بھی بھری ہوئی تھیں۔ جھاڑیوں کے نیچے چہاردیواری میں میں نے ایک چھوٹا سا سوراخ کاٹ دیا تھا۔ ان بھائیوں میں سے ایک ہمیشہ پہرے پر کھڑا رہ کر یہ دیکھا کرتا کہ کرنل ہمیں نہ پکڑ پائیں اور دو دو کر کے یا باری باری سے اس کونے میں آجاتے اور ہم لوگ چپکے چپکے خوب باتیں کیا کرتے۔

وہ لوگ مجھے اپنی اکتائی ہوئی زندگی کے بارے میں بتاتے اور مجھے اس سے بہت کوفت ہوتی۔ میری چڑیوں کے متعلق اور دوسری بچوں کی دلچسپیوں کے بارے میں بات چیت ہوتی لیکن جہاں تک مجھے یاد ھے وہ لوگ اپنے باپ یا سوتیلی ماں کا ذکر کبھی نہیں کرتے تھے۔ اکثر تو وہ بڑے بھولے پن سے مجھہ سے کہتے کہ کہانیاں سناؤں اور میں بڑی ذمہ‌داری کے ساتھہ اپنی نانی سے سنی ہوئی ساری کہانیاں دھراتا۔ اگر بیچ میں کچھہ بھول جاتا تو ان سے ٹھہرنے کو کہہ کر دوڑا دوڑا جاتا اور نانی اماں سے مدد لیتا۔ وہ نہایت خوشی سے بتا دیتیں۔

ان لوگوں کو میں اکثر اپنی نانی کے متعلق بتاتا۔ ایک دن بڑے لڑکے نے ٹھنڈی گہری سانس لے کر کہا:

''سب نانیاں اچھی ہوتی ہوں‌گی۔ ہماری بھی ایک بڑی اچھی نانی اماں ہوا کرتی تھیں۔،،

وہ اکثر اور کچھہ غمناک انداز میں یہ فقرے استعمال کرتا تھا ''کسی زمانے میں،، ''ہوا کرتی تھیں،، ''میرے پاس تھا،، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کی عمر گیارہ سال کی نہیں بلکہ زندگی کے سو سال پورے کر چکا ھے۔

مجھے یاد ہے کہ اس کے ہاتھ بہت نازک تھے، لمبی لمبی پتلی پتلی انگلیاں۔ وہ خود بھی دبلا پتلا اور نازک تھا اور اس کی آنکھیں ایسی شرمیلی اور شفاف تھیں جیسے گرجے میں مقدس شبیہوں کے آگے جلنے والا لیمپ ۔ مجھے اس کے دونوں بھائی بھی اچھے لگتے تھے ۔ ان سے ہمدردی محسوس ہوتی تھی اور ان کو دیکھ کر ان کے ساتھ محبت کا برتاؤ کرنے کا شوق پیدا ہوتا تھا۔ لیکن میرے دل میں اصلی چاہت بڑے کی تھی۔

کبھی کبھی میں آپس کی بات چیت میں ایسا کھو جاتا تھا کہ چچا پیوتر کی آمد کا پتہ ہی نہ چلتا تھا۔ وہ ایک دم آتے اور ہم لوگوں کو اپنی اونچی کھینچتی ہوئی آواز سے چونکا دیتے:

''کیوں... ں... ں، پھر وہی حرکت؟''

میں غور کر رہا تھا کہ آج کل ان کے خاموشی کے دورے بڑھتے جا رہے ہیں۔ میں یہ بھی پہچاننے لگا تھا کہ جب وہ کام سے واپس آتے ہیں تو ان موڈ کیا ہے۔ عام طور پر وہ دھیرے دھیرے پھاٹک کھولتے تھے اور قبضوں میں سے ایک تسلسل کے ساتھ چوں... ں... ں... ں نکلتی تھی، لیکن جب ان کا موڈ خراب ہوتا تو قبضوں میں سے یکایک تیز آواز نکلتی جیسے درد کی چیخ ہو۔

ان کا گونگا بھتیجا شادی کرنے دیہات چلا گیا تھا اور چچا پیوتر اپنی نیچی چھت‌والی کوٹھری میں تنہا ہی رہتے تھے۔ یہ کوٹھری اصطبل کے اوپر بنی تھی، اس میں ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی اور اندر سے ہمیشہ تارکول، پرانے چمڑے، تمباکو اور پسینے کے بھبکے آیا کرتے تھے۔ اسی بو کی وجہ سے میں ان کی کوٹھری میں کبھی نہیں جاتا تھا۔ آج کل وہ سوتے تو چراغ نہیں بجھاتے تھے۔ نانا ابا کو یہ بات بہت بری لگتی تھی۔

''دیکھو پیوتر ۔ ذرا ہشیار رہنا! کبھی سارا گھر پھونک کے دھر دو!''

''ارے نہیں! ایسا کوئی ڈر نہیں۔ میں چراغ کو پانی کے کونڈے میں رکھ کر سوتا ہوں''، وہ نظر چرا کے جواب دیتے۔

آج کل وہ اکثر گھبرا کر ادھر ادھر دیکھتے، نہ نانی اماں کی پارٹیوں میں شریک ہوتے، نہ ہم لوگوں کو مربہ کھلاتے۔ ان

کا چہرہ مرجھا گیا تھا، جھریاں اور گہری ہو گئی تھیں اور چلتے تھے تو بیمار کی طرح لڑکھڑاتے تھے۔

ایک دن رات کو بے تحاشا برف گری۔ صبح کو میں اور نانا ابا بیلچوں سے برف کھود رہے تھے کہ پھاٹک کا کھٹکا بڑی شان سے کھلا اور پولیس کا ایک آدمی احاطے میں داخل ہوا، دروازہ بند کیا، اس کی طرف پیٹھ کرکے کھڑا ہو گیا اور نانا ابا کو انگلی کے اشارے سے بلایا۔ جب نانا ابا اس کے پاس پہونچے تو اس نے اپنی لمبی ناک تقریباً نانا کے چہرے میں گھسا دی اور کوئی بات کہی جس کے جواب میں نانا ابا جلدی سے گھبراکے بولے:

''یہاں۔ کب؟ مجھے تو یاد نہیں پڑتا۔،،

پھر ایک دم سے چونکے اور چیخے:

''خدا کی پناہ! سچ؟ نہیں؟،،

''ش... ش،، پولیس‌والے نے خبردار کیا۔

نانا ابا نے چاروں طرف دیکھا اور مجھے دیکھ کر بولے:

''بیلچے اٹھاکے اندر چل، گھر میں!،،

میں گھر کی دیوار کی آڑ میں چھپ گیا اور دیکھتا رہا کہ وہ لوگ اصطبل تک پہونچ کر چچا پیوتر کی کوٹھری مں داخل ہو رہے ھیں۔ پولیس‌والے نے اپنے داھنے ھاتھ کا دستانہ اتار لیا تھا اور اسے زور زور سے بائیں ھاتھ پر پھٹپھٹا رہا تھا۔

''وہ خوب سمجھتا ھے۔ دیکھئے گھوڑے کو چھوڑ چھاڑ اپنے آپ چھپ گیا۔،،

میں یہ سب ماجرا سن کے نانی اماں کو بتانے کے لئے دوڑا دوڑا باورچی خانے میں پہونچا۔ وہ آٹا گوندھ رہی تھیں، آٹے کے کچھ ذرے ان کے بالوں میں بھی لگے تھے۔ جب میں سب کچھ سنا چکا تو بڑی بےنیازی اور سکون سے سر ھلا کر بولیں:

''ارے کچھ چرایا ہوگا یا اور کچھ بات ہوگی۔ تو جا کر باھر کھیل نا! تجھے ان باتوں سے مطلب؟،،

میں پھر احاطے میں بھاگا۔ نانا ابا اپنی ٹوپی ھاتھ میں لئے ننگے سر پھاٹک پر کھڑے، آسمان کی طرف نظریں اٹھائے جلدی جلدی اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنا رہے تھے۔ ان کے رونگٹے کھڑے

ہو گئے تھے، چہرے پر غصہ تھا اور ایک پاؤں کپکپا رہا تھا۔ زور سے پیر پٹک کر بولے:

''تجھ سے کہا نا کہ گھر میں چل!،،

اور میرے پیچھے پیچھے ہی گھر میں داخل ہوئے۔ باورچی خانے میں پہونچ کر بولے:

''وروارا کی ماں، یہاں آنا!،،

پھر دونوں دوسرے کمرے میں گئے اور دیر تک کھسر پھسر کرتے رہے۔ جب نانی اماں واپس آئیں تو ان کے چہرے پر ایک نظر ڈالتے ہی میں سمجھ گیا کہ کوئی خطرناک معاملہ ہے۔

''نانی اماں، آپ کیوں گھبرا رہی ہیں؟،،

وہ آہستہ سے بولیں ''تو چپ رہ۔،،

دن بھر گھر پر ایک عجیب تناؤ اور پریشانی کا عالم طاری رہا۔ نانی اماں اور نانا ابا ایک دوسرے کو معنیٰخیز نظروں سے دیکھتے اور ایک دوسرے سے دبے دبے لفظوں میں نہ جانے کیا کہتے جس سے پریشانی کی فضا اور بڑھتی۔

''تمام مقدس شبیہوں کے چراغوں کو روشن کر دو، وروارا کی ماں،، نانا ابا نے اپنا گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔

جلدی جلدی دونوں نے کھانا کھایا جیسے کوئی آنے والا ہو۔ نانا ابا تھکے ہارے انداز میں باربار گال پھلاتے، بدبداتے اور آہستہ سے کہتے:

''افوہ، انسان کہاں تک شیطان کا مقابلہ کرے! اب اسی کو دیکھو، یوں اچھا خاصہ متقی پرہیزگار آدمی لگتا تھا پر دیکھو کیا کر بیٹھا۔،،

نانی اماں نے ٹھنڈی سانس بھری۔

جاڑوں کا وہ چمکیلا دن کسی طرح ختم ہی ہونے میں نہ آتا تھا اور ہر گھڑی گھر کی فضا میں بےچینی اور گھبراہٹ بڑھتی جاتی تھی۔ شام ہوتے ہوتے پولیس کا ایک اور سپاہی آپہونچا۔ وہ موٹا سا تھا اور اس کے بال سرخ تھے۔ باورچی خانے کے ایک بنچ پر بیٹھ کر وہ اونگھنے لگا۔ وہ سر ہلا ہلا کے خر خر کر رہا تھا۔

''ان لوگوں کو پتہ کیسے چلا؟،، نانی اماں نے پوچھا۔

وہ ذرا رک کے خرخراتا ہوا بولا:

''فکر نہ کیجئے۔ ہم سب پتہ چلا لیں گے!،،

مجھے یاد ہے کہ میں کھڑکی کے قریب بیٹھا تھا اور سینٹ جارج کی چھاپ کا ایک سکہ منہ میں رکھہ کر گرم کر رہا تھا تاکہ اس سے برف جمی ہوئی کھڑکی پر چھاپ بنا سکوں۔

یکایک باہر گلیارے میں بڑی گڑبڑ ہونے لگی اور دروازہ دھڑام سے کھل پڑا۔ پیتروونا دہلیز پر کھڑی چیخ رہی تھی:

''جاؤ، جاؤ! دیکھو تمہارے باغ میں کیا ہو رہا ہے!،،

پولیس والے کو دیکھتے ہی وہ الٹے پاؤں گلیارے میں بھاگی لیکن اس نے لپک کر اس کا لہنگا پکڑ لیا اور بھی خوفناک آواز میں چیخا:

''ایک منٹ ٹھہرو! کون ہو تم؟ باہر کیا ہو رہا ہے؟،،

چوکھٹ پر وہ گھٹنوں کے بل گر پڑی اور رونے لگی۔ روتے روتے آنسو گھونٹ کر الفاظ چبا چبا کر بولی:

''میں گائے دوہنے گئی تھی اور ایک‌دم سے کاشیرین کے باغ میں جوتوں کی ایک جوڑی مجھے چلتی ہوئی نظر آئی۔،،

نانا ابا غصے میں بھر کر بولے:

''یہ جھوٹ ہے، رنڈی کہیں کی! ہمارے باغ میں کیوں دکھائی دیتا کچھہ؟ چہاردیواری اتنی اونچی ہے اور اس میں کوئی چھید بھی نہیں۔ جھوٹ بولتی ہے! وہاں کوئی نہیں!،،

''ہائے میں مر گئی!،، پیتروونا نے ایک ہاتھہ پولیس‌والے کی طرف بڑھایا اور دوسرے سے اپنا سر پکڑا۔ ''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، میں تو جھوٹ ہی کہہ رہی ہوں! میں جا رہی تھی تو میں نے دیکھا کہ تمہارے باغ کی طرف پیروں کے نشان بنے ہوئے تھے اور ایک جگہ پر برف بالکل کچلی اور دبی پڑی تھی۔ تو میں جنگلے پر چڑھی کہ دیکھوں کیا بات ہے۔ تو وہاں وہ پڑا ہوا تھا۔،،

''کون؟،،

یہ چیخ سنائی دی بے کار، بےمعنی۔ اور پھر ایک دم سے سب اس طرح ایک دوسرے کو دھکیلتے باورچی خانے سے نکل کر باغ کی طرف بھاگے جیسے ان پر جنون سوار ہو۔ برف کے گڑھے میں چچا

پیوتر پڑے ہوئے تھے، ان کی پیٹھ ایک جلی ہوئی شہتیر پر ٹکی ہوئی تھی، سر سینے پر - دھنے کان کے بالکل نیچے ایک بڑا سا زخم تھا جیسے کوئی سرخ دھانہ کھلا ہوا ہو - اس کے نیلے کنارے دانتوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے - میں نے خوف کے مارے آنکھیں بند کر لیں اور پلکوں سے جھانک کر دیکھا کہ چچا پیوتر کی زین سازوں کی چھری ان کے گھٹنے پر رکھی ہے اور اسی پر ان کا دھنا ہاتھ تھا جس کی انگلیاں مڑی تڑی اور سنولائی ہوئی تھیں - بایاں ہاتھ برف میں گرا ہوا تھا - ان کے پتلے دبلے جسم کے نیچے سے برف پگھلتی جا رہی تھی، سفید جھاگ سی برف میں پڑا ہوا جسم اس وقت بالکل بچوں کا سا لگ رہا تھا - ان کی داھنی طرف کو برف پر ایک عجیب و غریب سرخ ڈیزائن بن گیا تھا جو کسی پرندے کی طرح لگتا تھا - لیکن بائیں طرف کو برف بالکل صاف ستھری اور بےداغ تھی اور چکنی چکنی چمک رہی تھی - ان کا سر بڑے انکسار کے ساتھ ان کے سینے پر جھکا ہوا تھا اور جھکنے کی وجہ سے ان کی چھلے دار داڑھی سینے پر جھک گئی تھی - اور اس کے نیچے سے ایک بڑی سی پیتل کی صلیب دکھائی دے رہی تھی جس کے چاروں طرف خون کی دھاریں بہہ کر جم گئی تھیں - لوگوں کی آوازوں اور جمگھٹ سے میرا سر چکرانے لگا - پیتروونا مسلسل چیخ رہی تھی - پولیس‌والے نے چیخ کر والئی سے کہیں جانے کو کہا، نانا ابا چلا رہے تھے:

"دیکھو، دیکھو، قدموں کے نشان نہ مٹنے پائیں!"

پھر وہ ایک دم سے چہرے پر بل ڈال کر اور نظریں جھکا کر پولیس‌والے سے بولے: "آخر اس طرح چلانے سے کیا فائدہ افسر صاحب! یہ خدا کا کرنا ہے، خدا کا انصاف ہے اور آپ ہیں کہ اپنا انتظام کر رہے ہیں - تھو... و... و، کیا لوگ ہیں!"

سب لوگ خاموش ہوکر اپنے سینوں پر صلیب کا نشان بنانے لگے اور اس مرے ہوئے انسان کو غور سے دیکھنے لگے -

احاطے سے اور پیتروونا کے گھر کی طرف سے کچھ لوگ جھاڑیوں پر سے چڑھ چڑھ کر باغ میں دوڑے دوڑے آنے لگے، اس چپقلش میں بہت سے گر بھی پڑے اور بڑبڑانے لگے لیکن شور بالکل نہیں ہو رہا تھا یہاں تک کہ نانا ابا نے مڑ کر دیکھا اور عاجز ہو کر زور

سے چیخے: ''ارے بھلے آدمیو! تمھیں شرم نہیں آتی؟ ساری رس‌بھری کی جھاڑیاں توڑے دے رہے ہو!،،

نانی اماں میرے ھاتھ پکڑ کر گھر کے اندر چلی گئیں۔

''کیا کیا انہوں نے؟،، میں نے پوچھا۔

''ارے تم نے دیکھا نہیں؟،، وہ بھنبھناتی ہوئی بولیں۔

شام بھر اور رات گئے اجنبی لوگ باورچی خانے اور اس کے پاس والے کمرے میں آتے جاتے رہے۔ پولیس‌والے احکامات دیتے رہے اور ایک آدمی جو پادری سا لگتا تھا ایک نوٹ‌بک میں نوٹ کرتے کرتے بطخ کی طرح قین قین کرتا جاتا تھا:

''یہ کیا ہے؟ وہ کیا ہے؟،،

نانی اماں نے سب کے لئے چائے بنائی۔ میز پر ایک موٹا سا، ماتا کے داغ‌والا مونچھیل بیٹھا چیں چیں کرتی ہوئی آواز میں کہتا جا رہا تھا:

''اس کا اصلی نام کسی کو معلوم نہیں، بس لوگوں کو اتنا ھی معلوم ھے کہ وہ ایلاتما سے آیا تھا لیکن وہ جو گونگا تھا وہ ھماری آپ کی طرح تھا۔ اس نے سب بتا دیا اور اس تیسرے نے بھی قبول کر لیا — تیسرا آدمی بھی اس میں شریک تھا۔ یہ لوگ نہ جانے کب سے گرجوں سے چیزیں چرا رہے تھے۔ یہی ان کا خاص پیشہ تھا۔،،

پیترووونا بولی ''اے پروردگار!،، وہ بالکل پسینے میں ڈوبی ہوئی تھی، چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

میں تندور کے اوپروالے تختے پر لیٹا ان سب کو دیکھ رہا تھا اور مجھے یہ سب کے سب پستہ‌قد، موٹے اور بدھیت لگ رہے تھے۔

۱۰

ایک بار، سنیچر کے دن سویرے سویرے میں پیترووونا کے باغ میں لال لال سینے والی گوریاں پکڑنے گیا۔ میں جال ڈالے دیر تک پڑا رہا۔ چڑیاں اکڑ اکڑ کے مزے میں پھدکتی پھرتیں مگر کسی طرح دام میں نہ آتیں۔ چڑیاں بڑے ٹھاٹ سے چاندی جیسی برف پر پھدکتیں

اور مٹکتیں، پھر سے اڑتیں اور جھاڑیوں میں چھپ جاتیں، جھاڑیوں کی ٹہنیوں پر بیٹھه جاتیں اور آنکھیں کھولتے ہوئے پھولوں کی طرح ہوا میں ہلکورے کھاتیں - ٹہنیوں سے برف کا غبار نیلگوں چنگاریوں کی طرح جھڑ جاتا - یه تماشا اتنا پیارا، اتنا سہانا تھا که شکار کی ناکامی سے دل ذرا نه بجھا - ویسے بھی میں کوئی ایسا جوشیلا شکاری نه تھا - مجھے ہمیشه شکار سے زیادہ شکار کی تیاریوں اور اہتمام میں مزا آتا تھا - زیادہ لطف تو چڑیوں کو دیکھنے میں، ان کے بارے میں سوچنے میں آتا تھا -

اس سے زیادہ لطف کی بات اور کیا ہو سکتی ھے که مزے میں کسی برف‌پوش کھیت کے کنارے، جاڑے کے سناٹے میں بیٹھے ھیں اور چڑیوں کی چہچہاھٹ سن رھے ھیں - کہیں دور سے بھاگتی ہوئی ترویکا گاڑی کی گھنٹیوں کی گونج سنائی دے رھی ھے — روسی جاڑے کے اس پرندے کا اداس نغمه فضا میں تھر تھرا رھا ھے -

جب میری ھڈیاں تک پالے سے ٹھٹھر گئیں اور لگا که کانوں کو پالا مار گیا تو میں نے جال سمیٹا اور پنجرے سنبھالے، چہاردیواری پھاند کر نانا کے باغ میں کودا اور گھر کا رخ کیا - پھاٹک کھلے ہوئے تھے - کوئی گرانڈیل اجڈ گنوار ایک بڑی سی بند برف‌گاڑی کے تینوں گھوڑوں کی لگام تھامے ہوئے تھا - گھوڑوں کے نتھنوں سے بھاپ کے بادل نکل رھے تھے - دیہاتی بڑے مزے میں مگن سیٹی بجا رہا تھا - میرا دل دھک سے ہو گیا -

"کس کو لائے ہو تم؟"

وہ مڑا - اس نے پیشانی پر ھاتھه رکھه کر مجھے دیکھا اور اچھل کر اپنی جگه پر بیٹھه گیا -

"پادری کو -"

بھلا اس سے مجھے کیا لینا دینا — پادری ھے تو پھر کسی کرایه‌دار کے ھاں آیا ہوگا -

"چل بیٹے چل!" دیہاتی چابک سے گھوڑوں کو چھیڑتے ہوئے چلایا - گھوڑے اچھل کر آگے بڑھے اور فضا میں گھنٹیوں کی جھن جھن، جھن جھن تیر گئی - میں نے گھوڑوں کو آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہوئے دیکھا - میں نے پھاٹک بند کیا اور گھر کے اندر چلا گیا -

جب میں باورچی خانے میں پہنچا تو مجھے اپنی ماں کی گونجتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''اچھا تو اب میں کیا کروں — پھندہ ڈال کر جھول جاؤں، ایں؟''

میں نے پنجرے پھینک دئے اور کوٹ اتارے بنا گلیارے میں بھاگا۔ وھاں نانا میاں سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ انہوں نے میرے شانوں پر ھاتھہ جمائے اور میرے چہرے کو وحشی آنکھوں سے دیکھا، بڑی تکلیف کے ساتھہ تھوک گھونٹ کر ھانپتے ہوئے بولے:

''ماں آئی ھے تیری — جا وھاں جا! ٹھہر!'' انہوں نے مجھے اتنے زور سے جھٹکا دیا کہ میری ٹانگیں لڑکھڑا گئیں۔ انہوں نے مجھے کمرے میں دھکیل دیا: ''جا، جا!''

میں دروازے کو کریدتا رہا۔ ٹھٹھری اور کانپتی ہوئی انگلیوں سے چٹخنی کھولے نہ کھل رہی تھی۔ آخر چٹخنی کھلی اور میں گم سم چو کھٹ پر کھڑا ہو گیا۔

''ارے یہ رہا...'' ماں بولیں۔ ''اوئی اللہ — کیسا لم ڈھینگا ہو گیا ھے! کیوں اب تو مجھے پہچانیگا بھی نہیں؟ ھائے ھائے ذرا کپڑے لتے تو دیکھو! اور لو دیکھو اس کے کان پالے سے ٹھٹھر گئے ھیں! ماں ذرا پھرتی سے ھنس کی چربی تو دیجیو! جلدی ماں جلدی!''

ماں کمرے کے بیچوں بیچ مجھہ پر جھکی رھیں۔ وہ میرے کپڑے اتارتی رھیں اور مجھے گیند کی طرح چاروں طرف لئے پھریں۔ ماں کا بھاری بھر کم جسم گرم لال لباس میں چھپا ہوا تھا، خوب ڈھیلا ڈھالا لباس، بالکل مردوں کے لبادے جیسا۔ بڑے بڑے کالے بٹنوں کی قطار شانے سے کمر تک ترچھی اترتی چلی گئی تھی اور پھر کمر سے بالکل دامن کے کنارے تک۔ میں نے ایسا لباس کاھیکو کبھی دیکھا ہوگا۔

مجھے ماں کا چہرہ پہلے سے چھوٹا نظر آیا، چھوٹا اور زیادہ سفید۔ آنکھیں پھیل گئی تھیں اور گہری ہو گئی تھیں۔ بال کا رنگ اور سنہرا ہو گیا تھا۔ انہوں نے میرے کپڑے اتار اتار کر الگ کونے میں پھینک دئے۔ پورے وقت ان کے سرخ ھونٹ مڑتے رھے اور ان کی تیز آواز گونجتی رھی:

''ارے چپ کیوں ہے؟ خوش ہے نا؟ ہے، ہے، کیسی چکٹ قمیص ہے...''

اس کے بعد ماں نے میرے کانوں پر ہنس کی چربی ملی۔ میرے کان دکھ رہے تھے۔ پر ماں سے ایسی تازگی بخش، ایسی میٹھی خوشبو اٹھ رہی تھی کہ میرے کانوں کا درد بھی کم ہو گیا۔ میں ماں سے اور بھی زور سے لپٹ گیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ دیں۔ جی کا کچھ عجیب حال تھا۔ مارے ہیجان کے زبان سے ایک لفظ بھی تو نہ نکلا... ماں کی باتوں کے ساتھ ساتھ مجھے نانی کی دبی دبی دکھی آواز سنائی دے رہی تھی۔

''لونڈ بالکل ہاتھ سے گیا... نانا کا بھی تو ڈر نہیں رہا اس کے دل میں۔ آہ واریا، ارے واریا...''

''اب دکھڑا نہ رو اماں ــ سب ٹھیک ہو جائے گا!''

ماں کے سامنے چاروں طرف ہر چیز بڑی حقیر، گھسی پٹی اور بےجان معلوم ہو رہی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں خود بوڑھا ہوں، نانا کی طرح بوڑھا۔ ماں نے مجھے گھٹنوں کے درمیان دباتے ہوئے اپنے گرم اور بھاری ہاتھوں سے میرے سر کو سہلاتے ہوئے زور سے کہا:

''بال کٹنے چاہئیں! اسکول جانا ہوگا! چاہتا ہے تو پڑھنا؟''

''پڑھ چکا۔''

''تھوڑا اور پڑھنا چاہئے۔ ارے تو کتنا کڑیل چھوکرا ہے ایں؟''

ماں مجھ سے کھیلتے ہوئے ہنسیں۔ ان کی ہنسی میں بڑی گونج، بڑی گرمی تھی۔

نانا اندر آئے۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں، آنکھیں لال انگارا۔ ماں نے مجھے ہلکے سے پرے دھکیل دیا اور زور سے پوچھا:

''کیوں ابا؟ تو پھر جائیں ایں؟''

نانا ابا کھڑکی کے پاس کھڑے ہو گئے اور ناخن سے شیشے پر برف کریدنے لگے اور منہ سے ایک لفظ نہ پھوٹے۔ فضا میں اتنا تناؤ پیدا ہو گیا کہ لگا جیسے میری آنکھیں اور کان پھیل رہے ہیں یہاں تک کہ میرا پورا وجود کانوں اور آنکھوں میں ڈوب کر رہ گیا۔ میرا

سینہ پھولتا اور پھٹتا ہوا معلوم ہو رہا تھا - بے اختیار جی چاہ رہا تھا کہ چیخ پڑوں -

''الیکسئی بھاگ جا یہاں سے،، نانا نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا -

''کیوں؟،، ماں نے پھر مجھے گلے لگاتے ہوئے کہا -

''تم اب کہیں نہیں جاؤگی - میں اجازت نہیں دے سکتا - ،،

ماں اٹھیں اور پورے کمرے میں ڈوبتے سورج کی سرخ روشنی میں نہاتے ہوئے بادل کی طرح تیرتی نظر آئیں -

''سنو ابا...،، ماں نے نانا کے پیچھے رکتے ہوئے کہا -

''خاموش !،، نانا نے مڑتے ہوئے چیخ کر کہا -

''ہاں میں اپنے اوپر چیخنے نہ دونگی، نہیں،، ماں نے آہستہ سے کہا -

''ورواراّ!،، نانی صوفے سے اٹھیں اور انگلی سے دھمکاتے ہوئے چلائیں -

نانا بڑبڑاتے ہوئے کرسی پر بیٹھہ گئے :

''ٹھہرو ! میں ہوں کون؟ ایں؟ یہ سب کیا ہے؟ ہاں اسے کیا کہتے ہیں !،،

یکایک وہ مڑے اور بولے ''ورواراّ تونے میری ناک کٹوا دی - ہاں تو نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا ورواراّ !،،

''جا تو یہاں سے...،، نانی نے مجھے حکم دیا -

میں بجھے ہوئے دل کے ساتھہ باورچی خانے میں گیا اور تندور پر چڑھہ گیا - میں دیر تک دوسرے کمرے سے آتی ہوئی آوازیں سنتا رہا - کبھی سب کے سب ایک ساتھہ بڑے جوش سے بولنے لگتے، کبھی سب چپ ہو جاتے، جیسے یکایک سب کو نیند آ گئی ہو - وہ لوگ کسی بچے کے بارے میں بات کر رہے تھے - بچہ ماں کا تھا جسے وہ کسی کے ساتھہ چھوڑ آئی تھیں - پر یہ سمجھہ میں نہ آتا تھا کہ نانا کیوں لال پیلے ہو رہے ہیں — اس لئے کہ ماں نے ان سے پوچھے بنا بچے کو جنم دیا یا اس لئے کہ وہ بچے کو کیوں ساتھہ نہ لائیں -

آخر نانا بھی باورچی خانے میں آ گئے، تمتمائے ہوئے اور پریشان حال، تھکے تھکے، نڈھال - ان کے پیچھے پیچھے نانی بھی آئیں - وہ کرتے کے دامن کے کونے سے آنسو پونچھہ رہی تھیں - نانا سلسلا کر

بنچ پر بیٹھ گئے اور ھاتھوں کے سہارے جھکتے ہوئے سفید ہونٹ کاٹنے لگے۔ ان کا چہرہ بگڑ رہا تھا۔ نانی ان کے آگے گھٹنوں کے بل گرگئیں اور آهسته آهسته مگر بڑے جذباتی انداز میں بولیں:

''وروارا کے ابا، بیٹی کو معاف کردو۔ یسوع مسیح کے نام پر بخش دو اسے! بڑی بڑی لحیم شحیم برف گاڑیاں تک ٹوٹ جاتی ھیں۔ کیا بڑے بڑے شریفوں میں ایسے قصے نہیں ہوتے، سوداگروں کے ایسے گل نہیں کھلتے کیا؟ ذرا دیکھو تو — کیسی عورت ہے! معاف کردو اسے وروارا کے ابا، تم جانو ہم میں کوئی فرشتہ نہیں...،،

نانا دیوار پر اڑ گئے اور نانی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بڑبڑائے:

''اوہ، ھاں بےشک! کیوں نہیں؟ تم تو کسی کو بھی معاف کر دوگی! تم تو کچھ بھی معاف کر سکتی ہو۔ آخ! تھو... و...و، کیا لوگ ھیں!،،

پھر وہ نانی کی طرف جھکے۔ انہوں نے نانی کے شانے پکڑے اور انہیں زور سے جھٹکے دئے۔

''اور خدا؟ پروردگار تو نہیں معاف کرتا نا؟ دیکھ‌لو، ہم قبر میں پیر لٹکائے بیٹھے ہیں، اور دیکھو کیسی سزا مل رہی ہے ہمیں — زندگی کے آخری دن ہیں، ذرا چین نہیں، خوشی کی ایک کرن نہیں — نہ امید! اور ہاں گرہ سے باندھ رکھو میری بات — دیکھ لینا ہم بھیک مانگیں گے، بھیک!،،

نانی نے نانا کے ھاتھ اپنی مٹھیوں میں لئے اور ان کے پہلو میں بیٹھتے ہوئے دھیرے سے ھنسیں۔

''تو کیا ہوا؟ تم بھکاری بننے سے اتنا ڈرتے کیوں ہو؟ اچھا تو بھکاری ھی سہی! دیکھو تم بیٹھیو گھر اور میں جاؤں گی در در — کوئی مجھے خالی ھاتھ چلتا نہ کرے گا۔ ہم بھوکوں نہیں مریں گے! چھوڑو یہ سب! کیوں جی ھلکان کرو، بیکار!،،

یکایک وہ کھنکارے اور بکرے کی طرح سر گھمایا، نانی کی گردن میں بازو ڈالے اور زور سے چمٹ گئے۔ وہ اس وقت بہت ھی دبے کچلے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے نانی اماں کے بازوؤں میں کھو سے گئے۔

''بیوقوف! ارے بیوقوف، اللہ کی رحمت ہو تجھ پر! بس تو ہی تو ایک دوست رہ گئی ہے میرے پاس! تو نادان ہے، تو کچھ نہیں سمجھتی۔ تو تو بس چلے تو اپنا سب کچھ لٹا دے۔ یاد ہے، ہم نے اپنے بچوں کی خاطر کس طرح کام کیا، میں نے ان کی خاطر کتنے پاپ کئے! اور اب دیکھو انجام — اپنے پاس ایک کوڑی نہیں، کچھ بھی نہیں...،،

یہ سن کر میں برداشت نہ کر سکا۔ میں تندور سے کودا اور ان کے پہلو میں جا گرا۔ میری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ میں خوشی سے سسکیاں لے رہا تھا کہ لو ماں آ گئیں۔ میں خوش تھا کہ دونوں اتنی محبت سے ایک دوسرے سے باتیں کر رہے ہیں۔ وہ میرے ساتھ اپنا دکھ سکھ بٹا رہے تھے، دونوں مجھے چمکار رہے تھے، گلے لگا رہے تھے، اپنے آنسوؤں کی برسات میں مجھے نہلائے دے رہے تھے۔

''ارے شیطان، اچھا تو بھی یہاں موجود ہے،، نانا نے میرے کان میں سر گوشی کرتے ہوئے کہا۔ ''اب تیری ماں آ گئی۔ اب تجھے مجھ سے بھلا کیا کام — نانا، بڑھا خناس، ایں؟ اب نانی میں بھی کیا رکھا ہے — بڑھیا بکو... جو تجھے بگاڑنے کے سوا اور کوئی نیک کام جانتی ہی نہیں۔ تھو... و... و، کیا لوگ ہیں!،،

انہوں نے ہمیں ہاتھ سے الگ کیا اور خود اٹھ کھڑے ہوئے۔

''ہر شخص ہمیں چھوڑ رہا ہے، ہر شخص ہم سے دور بھاگنا چاہتا ہے... سب کو اپنی اپنی پڑی ہے... خیر بلاؤ اس کو!،، انہوں نے سنک کر کہا۔ ''جلدی کرو۔،،

نانی اماں باورچی خانے سے نکلیں اور نانا یسوع مسیح کی شبیہہ کے پاس گئے۔

''اے رحیم و کریم، اے پروردگار — ذرا دیکھ۔ دیکھ تو سہی یہ کیا ہو رہا ہے!،،

وہ سر جھکاتے ہوئے بڑبڑائے اور سینے پر دوہتڑ مارا۔ مجھے یہ بات ذرا نہ جچی۔ ویسے عام طور پر خدا سے ان کے بات کرنے کا انداز مجھے ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ وہ خدا کے سامنے ایسی دون کی جو لیتے تھے۔

ماں باورچی خانے میں آئیں - ان کے سرخ لباس کی روشنی نے کمرے کو منور کر دیا - وہ بنچ پر بیٹھیں اور ان کے پہلو میں نانا نانی - ماں کی ڈھیلی ڈھالی آستینیں ماں باپ کے شانوں پر جھول رہی تھیں - ماں ان سے دھیرے دھیرے اور گمبھیرتا سے باتیں کر رہی تھیں - وہ چپ چاپ ماں کی باتیں سنتے رہے - دونوں ماں کے پہلو میں اتنے ننھے منے سے لگ رہے تھے کہ لگتا تھا وہی ماں ہیں اور یہ دونوں ان کے بچے -

دل کے طوفان نے مجھے تھکا دیا اور میں تخت پر پڑ کر سو گیا -

اس دن شام کو بڑے میاں اور بڑی بی نے اپنے زرق برق لباس پہنے اور گرجا گھر عبادت کو سدھارے - نانی نے چھکتے ہوئے نانا کی طرف آنکھ ماری جو ریچھ کی کھال کا کوٹ اور برجس پہنے ہوئے تھے - آنکھ ماری اور بولیں:

''ذرا دیکھنا کیا دھلا دھلایا بکرا ہے تیرا باپ!،، انہوں نے ماں کی کہنی مارتے ہوئے کہا -

ماں نے خوش ہو کر قہقہہ لگایا -

جب میں اور ماں کمرے میں اکیلے رہ گئے تو وہ صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھیں اور صوفے کو تھپتھپاتے ہوئے مجھے پاس بلایا:

''یہاں آ، بیٹھ تو ذرا - بتا کیا حال ہے؟ حال پتلا ہے، ایں؟،،

هاں کیا حال تھا؟

''مجھے کیا معلوم -،،

''کیوں نانا خوب پٹائی کرتے ہیں نا؟،،

''اب اتنا زیادہ نہیں کرتے -،،

''سچ؟ کچھ کہہ، کچھ بول، جو جی چاہے بتا -،،

میں نانا کے بارے میں کچھ کہنا نہیں چاہتا تھا - سو میں نے کہنا شروع کیا اس کمرے میں ایک بھلا مانس رہتا تھا - بڑا اچھا آدمی تھا وہ - پر وہ کسی کو ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا - نانا نے تو آخر اسے نکال باہر کیا - میں سمجھ گیا کہ ماں کے دل کو یہ کہانی کوئی خاص لگی نہیں - اور وہ بولیں:

''کچھ اور سناؤ!،،

میں نے تین چھوٹے بچوں کا قصہ سنایا اور یہ بھی بتایا کہ کرنل بہادر نے کس طرح مجھے احاطے سے نکال باہر کیا تھا۔

ماں نے مجھے گلے لگایا اور بولیں:

''بڑا برا آدمی تھا۔،،

پھر وہ خاموش ہوگئیں اور آنکھیں میچ کر فرش کو غور سے دیکھتی اور سر ہلاتی رہیں۔

''نانا تم سے اتنے خفا کیوں ہیں؟،، میں نے پوچھا۔

''قصور میرا ہے۔،،

''تم بچے کو ان کے پاس لے آتیں تو...،،

وہ چونک گئیں، ان کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ وہ ہونٹ کاٹنے لگیں۔ پھر انہوں نے زور سے قہقہہ لگایا اور پھر مجھے چمٹا لیا۔

''بیوقوف، بھولا! پر خبردار جو پھر یہ بات زبان پر لایا، سنا؟ خبردار — زبان بالکل بند رکھ۔ اس کے بارے میں سوچ بھی مت!،،

کچھ دیر تک وہ بولتی رہیں، آہستہ آہستہ۔ ان کی باتیں دل کو کاٹنے والی تھیں اور سمجھ میں نہ آنے والی۔ پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئیں اور فرش پر ادھر ادھر ٹہلنے لگیں۔ وہ انگلی سے ٹھوڑی کو گد گدا رہی تھیں۔ ان کی گھنی بھوئیں آہستہ آہستہ لرز رہی تھیں۔

ایک موم بتی میز پر جل رہی تھی، موم پگھل رہی تھی اور اس کا عکس آئینے میں جھلملا رہا تھا۔ فرش پر میلی پرچھائیاں رینگ رہی تھیں، کونے میں یسوع مسیح والا چراغ جل رہا تھا اور یخ بستہ کھڑکی میں چاندنی نے ٹھنڈی آگ لگا دی تھی۔ ماں کی نگاہیں چاروں طرف بھٹک رہی تھیں جیسے خالی دیواروں اور چھت پر کچھ ڈھونڈ رہی ہوں۔

''تو سوتا کب ہے؟،،

''تھوڑی دیر بعد۔،،

''ٹھیک ہے آج سہ پہر کو تو سویا بھی ہے،، انہوں نے ٹھنڈی سانس لی۔

''کیا تم یہاں سے چلی جاؤگی؟،،

''کہاں جاؤں‌گی؟،، انہوں نے کچھ حیرانی سے پوچھا۔ انہوں

نے میرا سر اٹھایا اور اتنی دیر تک میری آنکھوں میں دیکھتی رہیں کہ میرے آنسو چھلک پڑے۔

''ارے تو روتا کیوں ہے؟،،

''گردن دکھ رہی ہے۔،،

لیکن سچ سچ میرا دل زیادہ دکھ رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ اس گھر میں نہیں رہ سکتیں۔ وہ ضرور چلی جائیں گی...

''دیکھنا تو اپنے باپ پر جائے گا،، انہوں نے دری کو پیر سے ایک طرف ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''نانی نے تجھے باپ کے بارے میں تو ضرور بتایا ہوگا؟،،

''ہاں۔،،

''ہاں اماں تیرے باپ پر جان دیتی تھیں۔ بہت چاہتی تھیں۔ اور وہ بھی نانی کو بہت چاہتے تھے...،،

''جانتا ہوں۔،،

ماں نے موم بتی کو دیکھا، ان کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ انہوں نے موم‌بتی بجھا دی۔

''ایسے ٹھیک ہے...،، انہوں نے کہا۔

موم بتی بجھ گئی تو لگا کمرے میں تازہ اور صاف ہوا آ رہی ہے۔ فرش پر جو گھناؤنی پرچھائیاں تیر رہی تھیں ان کی جگہ نیلی چاندنی کے گل بوٹے چمک اٹھے اور کھڑکی کے شیشے پر سنہرے سائے جھلملانے لگے۔

''تم یہاں آنے سے پہلے کہاں رہتی تھیں؟،،

انہوں نے چند شہروں کے نام بتائے، کچھ اس طرح جیسے بھولی بسری باتیں یاد کر رہی ہوں۔ پورے وقت وہ کمرے کے چکر لگاتی رہیں۔

''یہ لباس تمہیں کہاں ملا؟،،

''میں نے خود بنایا ہے۔ میں اپنا سارا کام خود کرتی ہوں۔،،

یہ دیکھ کر میرا جی کھلا جا رہا تھا کہ وہ اوروں کی طرح نہیں ہیں، وہ کچھ اور ہیں۔ لیکن وہ اتنا کم بولتی تھیں کہ میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ اگر میں کچھ نہ پوچھتا تو وہ بھی کچھ نہ کہتیں۔

ایک بار پھر وہ میرے پاس صوفے پر بیٹھ گئیں۔ ہم چپ

چاپ ویسے هی بیٹھے رهے ایک دوسرے سے چمٹے هوئے - هم اس وقت تک اسی طرح بیٹھے رهے جب تک که بڑے میاں اور بڑی‌بی نه آ گئے - ان کے جسم سے موم بتی اور لوبان کی خوشبو آ رهی تھی - وہ بڑے گمبھیر اور بھلے مانس نظر آ رهے تھے -

کھانے پر بھی یہی گمبھیرتا اور خاموشی چھائی رهی - هم بہت کم بولے - بولے تو بہت سنبھل کر بولے - جیسے اندیشه هو که کہیں هماری باتوں سے کسی کی هلکی نیند نه اچٹ جائے -

جلد هی ماں نے میری ''غیرمذهبی'' تعلیم کا بیڑا اٹھایا - وہ میرے لئے چند کتابیں لے آئیں - ان میں ایک تھی ''روسی کا قاعدہ'' - اس کتاب سے میں نے چند هی دن میں حروف تہجی سیکھه لئے - لیکن ماں فوراً مجھے زبانی شاعری یاد کروانے پر اتارو هو گئیں - اس طرح ایک دوسرے کی دل‌آزادی کا دھندا شروع هوا -

شعر تھا:

راسته پیچ و خم کھاتا هوا جس کی نہیں انتہا
خدا کے کھیتوں میں دوڑتا هوا راسته
جسے پھاوڑوں اور کدالوں نے نہیں کاٹا
نرم راسته، گرد و غبار سے اٹا هوا راسته

میں ''خم'' کی جگه ''غم'' کہتا تھا -

''پر ذرا سوچ تو راسته ''غم'' کیسے کہا سکتا ہے'' ماں احتجاج کرتیں - ''بیوقوف! ''خم'' کہه ''خم''... هاں ''خم'' کہنا پڑیگا تجھے!''

میں سمجھه گیا مگر وهی ''غم'' کی رٹ لگائے رها - میں اپنی اس غلط رٹ پر خود هی حیران اور پریشان تھا -

ماں کو غصه آ گیا - انہوں نے کہا که میں هٹی اور احمق هوں - یه بہت هی تکلیف‌دہ الزام تھا مجھه پر - اور میں نے ان منحوس شعروں کو یاد کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا. دل هی دل میں تو میں سارے شعر بغیر غلطی کے پڑھه لیتا - پر جب زبانی سنانے کی باری آتی تو میں لفظوں کو گڈمڈ کرکے رکھه دیتا - مجھے ان شعروں سے نفرت هو گئی جو کسی طرح اپنے قابو هی میں نه آتے تھے -

میں چڑ گیا اور اب جان بوجھ کر ان کو بگاڑ کر پڑھنے لگا، ہم‌قافیہ لفظ چن‌چن کر پورا پورا انبار لگا دیتا۔ شعر جتنے بے معنی ھوتے اتنا ھی میرا جی خوش ھوتا۔

لیکن یہ تفریح خاصی گراں پڑی۔ ایک دن پڑھائی خاصی کامیاب رھی۔ آخر میں ماں نے کہا وہ شعر سناؤ۔ اور میں بے اختیار شعر یوں پڑھ گیا:

رستہ، خستہ پیچ و غم کھاتا ھوا،
جس کی نہیں ابتدا

لیکن جب تک جب تک مجھے پتہ چلے کہ کیا ھو رھا ھے تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ ماں میز پر ھاتھ رکھتے ھوئے کھڑی ھوگئیں اور ایک ایک لفظ پر زور دیتے ھوئے بولیں:

''یہ کہاں سیکھا تو نے؟،،

''میں کیا جانوں،، میرے دل پر چوٹ لگی۔

''ھاں تو جانتا ھے! بتا مجھے!،،

''بس یونہی۔،،

''بس یونہی کیا؟،،

''یونہی تفریح کے لئے۔،،

''جا وھاں کونے میں کھڑا ھوجا۔،،

''کیوں؟،،

''کونے میں!،، انہوں نے دھمکی کے انداز میں دوھرایا۔

''کس کونے میں؟،،

انہوں نے جواب نہیں دیا لیکن مجھے ایسی نظروں سے گھور کر دیکھا کہ میری سٹی گم ھوگئی۔ مجھے کچھہ ھوش نہ رھا کہ میں کر کیا رھا ھوں اور وہ چاھتی کیا ھیں۔ مقدس شبیہہ‌والے کونے میں ایک گول میز تھی جس پر گلدان رکھا تھا۔ گلدان خوشبودار خشک پھولوں اور گھاس سے بھرا ھوا تھا۔ ایک کونے میں صندوق تھا جو غالیچے سے ڈھکا ھوا تھا۔ تیسرے کونے میں پلنگ بچھا ھوا تھا۔ اور چوتھے کونے میں دروازہ تھا۔

''میری سمجھہ میں نہیں آتا کہ تم چاھتی کیا ہو؟،، میں نے ان کی بات سمجھنے کی کوشش کی اور بو کھلا کر بولا۔

وہ کرسی میں دھنس گئیں اور خاموشی سے بھوؤں اور رخساروں کو ملنے لگیں۔

''تجھے نانا ابا نے کونے میں کھڑا کیا ھے کہ نہیں؟،،

''کب؟،،

''کبھی بھی!،، انہوں نے دوبار میز پر مکہ مارتے ہوئے چیخ کر کہا۔

''نہیں، مجھے تو یاد نہیں آتا۔،،

''تو جانتا ھے یا نہیں — کونے میں کھڑا کرنا سزا ھے؟،،

''نہیں۔ کیوں کیا یہ سزا ھے؟،،

انہوں نے ٹھنڈی سانس لی۔

''اف! ادھر آ۔،،

''تم چیخ کیوں رہی ہو مجھہ پر؟،، میں نے پاس جاتے ہوئے کہا۔

''اور تو جان بوجھہ کر شعر کو بگاڑتا کیوں ھے؟،،

میں نے صفائی دی کہ جب میں آنکھہ بند کرکے شعر یاد کرتا ہوں تو جیسے شعر ہوتے ہیں ویسے ھی یاد آتے ہیں۔ مگر جب زور سے پڑھتا ہوں تو دوسرے بول نکل پڑتے ہیں منہ سے، کیا کروں؟

''بن رہا ھے ایں؟،،

''نہیں،، میں نے جواب دیا۔ لیکن اسی آن خیال آیا ''کون جانے شاید بن ھی رہا ہوں؟،، یکایک میں نے اطمینان سے شعر پڑھنا شروع کئے اور سب صحیح۔ میں حیران رہ گیا۔ میرا دل بھر آیا۔

مجھے لگاجیسے میرا منہ سرخ ہو رہا ھے اور کان جل رہے ہیں۔ میں ماں کے سامنے کھڑا تھا، شرم سے پانی پانی، آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ میں نے آنسوؤں کے پردے سے دیکھا — ماں کا چہرہ مایوسی سے بجھہ گیا، ان کے ہونٹ بھنچ گئے، بھوئیں جھک گئیں۔

''اس کا کیا مطلب؟،، انہوں نے ایک عجیب آواز سے پوچھا۔

''اچھا تو معلوم ہوتا ھے تو سچ مچ بن رہا تھا؟،،

''کون جانے۔ میں یہ چاھتا نہ تھا...،،

''تو بڑی ٹیڑھی کھیر ہے - تجھہ سے نبٹنا جان جوکھوں کام ہے،، انہوں نے سر جھکاتے ہوئے کہا - ''جا بھاگ جا!،،

انہوں نے مجھے اور زیادہ شعر یاد کرنے کو دینا شروع کئے مگر میرے دماغ نے ان کو قبول کرنے سے انکار کر دیا - ان مترنم مصرعوں کو بگاڑنے اور ان میں الٹے سلٹے لفظ جوڑنے کی خواهش زور پکڑتی چلی گئی - اس میں مجھے کوئی مشکل نه هوتی — ناخوشگوار لفظوں کا دریا چڑھتا چلا آتا - ناخوشگوار لفظ بڑی تیزی سے اصلی لفظوں کی جگه جمتے چلے جاتے - اکثر تو ایسا هوتا که پورا پورا مصرعه میں یاد کرنے کی، رٹنے کی کوشش کرتا اور وہ کسی طرح دماغ میں نه جمتے - میرے خیال میں شہزادے ویازیمسکی کا شکوہ نامه خاص طور پر بڑا زبردست درد سر بن گیا:

صبح سے شام تک
بیوائیں، یتیم،
بوڑھے نزار
کاسۂ گدائی لئے
در تونگر په
بھیک مانگتے هیں

آخری دو مصرعے میں همیشه پوری ثابت‌قدمی سے گول کر جاتا - آخر هارکر انہوں نے نانا سے شکایت کی که اس کی یاد بڑی خراب ہے -

''بگڑ گیا ہے، بالکل هاتھه سے جاتا رها!،، نانا نے خفا هوکر کہا - ''اس کی یاد واد کو کچھه نہیں هوا - اس کو ساری دعائیں مجھه سے بہتر فرفر یاد هیں - اس کی یاد تو پتھر کی طرح ہے — ایک بار جو لکیر پڑ جائے تو مٹائے نه مٹے - ذرا اس کی مرمت کرو!،،

نانی نے بھی نانا کی رائے پر مہر لگا دی:

''اس کو جادوٹونے کی کہانیاں اور گیت خوب یاد هیں - اور گیت اور شاعری میں فرق کون سا ہے!،،

یه سب سچ تھا - اور میرا دل مجھے هی قصوروار ٹھہراتا تھا - لیکن جیسے هی میں شعر یاد کرنے کی کوشش کرتا دوسرے

لفظ تل‌چٹوں کی طرح رینگتے ہوئے آتے اور ھاتھه باندھه کر کھڑے هو جاتے :

صبح سے شام تک، ہمارے پھاٹک پر
لنگڑے لولے یتیم و نادار ھیں کہ آتے ھی چلے جاتے ھیں
روتے ھیں، گڑگڑاتے ھیں، سر پٹکتے ھیں روٹی کے لئے
روٹی لے کر وہ جاتے ھیں، پیتروونا کے یہاں
بیچتے ھیں روٹی اور خریدتے ھیں گائے
پھر شراب پی کر مچاتے ھیں دھوسیں
صبح سے شام تک

رات کے وقت نانی کے پاس لیٹ کر میں کتاب کے یاد کئے ہوئے اور اپنے بنائے ہوئے شعر سناتا ۔ کبھی کبھی تو وہ ھنس پڑتیں ۔ مگر زیادہ تر میری خوب خبر لیتیں :

"دیکھه، تو کیا نہیں کر سکتا ۔ پر بھکاریوں پر پھبتی اچھی نہیں ۔ یسوع مسیح فقیر تھے اور تمام سنت سادھو بھی..."

میں بڑبڑاتا :

نفرت ھے مجھے بھکاریوں سے
اور نانا سے بھی
اے خدا تو ھی بچا
میں کیا کروں کس طرح جان بچاؤں
کس طرح بچوں نانا کے ڈنڈوں سے؟

"ارے تیری زبان میں کیڑے پڑیں نگوڑے مونڈی کاٹے!"

نانی کہتیں ۔ "نانا ابا کے کانوں میں بھنک پڑگئی تو؟"

"پڑنے دو!"

"آخر تو ھر وقت اپنی ماں کا دل کیوں کڑھاتا رہتا ھے؟ ویسے ھی اس کا جی‌جلا ہوا ھے ۔ اس پر تو جلے پھپھولوں پر نمک چھڑکتا رہتا ھے" نانی بڑی نرمی سے مجھے سمجھاتیں بجھاتیں ۔

"کیوں دل جلا ہوا کیوں ھے ماں کا؟"

"بند کر چپڑ چپڑ! تیرے بھیجے میں یہ باتیں کیا آئیں‌گی!"

''جانتا ہوں، یہ سب کی...''

''میں کہتی ہوں زبان بند رکھہ!''

میرا جی بہت کڑھتا۔ دل بھر آتا۔ مگر نہ جانے کیوں میں اپنے دل کی بات چھپا جاتا۔ میں نڈر اور سرکش بنتا چلا گیا۔ میری ماں کا سبق بڑھتا چلا گیااور ساتھہ ہی میرا درد سر بھی۔ حساب میں مجھے کوئی مشکل نہ ہوتی۔ لیکن مجھہ سے گرامر کا روگ کسی طرح پالا نہ جاتا۔ جس بات سے میرا سینہ شق ہوتا تھا یہ تھی کہ نانا کے گھر میں ماں کس طرح دبی کچلی ہوئی زندگی گزار رہی تھیں۔ وہ روز بروز بجھتی چلی گئیں، وہ ہر شخص کو اجنبی نظروں سے دیکھتیں۔ گھنٹوں کھڑکی پر بیٹھی باغ میں دیکھتی رہتیں۔ ان پر خزاں چھا رہی تھی۔ یہاں آنے کے بعد شروع کے چند دن تو ان کے اندر بجلی سی دوڑتی رہی۔ وہ خوش اور مگن رہیں۔ لیکن اب ان کی آنکھوں کے گرد سیاہ ہالے سے پڑ گئے تھے۔ وہ اپنے کپڑے، سنگار بناؤ کی بھی پروا نہ کرتیں۔ وہ دن دن بھر ملے دلے بلاؤز میں بھٹکتی رہتیں، بال شانے کو ترستے رہتے۔ ان کو اتنا بےرنگ اور بجھا بجھا دیکھہ کر میرا دل بہت کڑھتا — ان کو تو صاف ستھرا، لئے دئے اور خوبصورت نظر آنا چاہئے تھا، ان کو تو دنیا کی سب سے حسین ہستی ہونا تھا۔

سبق دیتے وقت وہ مجھہ سے آگے کہیں دور، کھڑکی سے باہر دیکھتی رہتیں یا دیوار پر نظر دوڑاتی رہتیں۔ ان کے سوال تھکی تھکی آواز میں سنائی دیتے۔ وہ میرا جواب سننا بھی بھول جاتیں۔ ذرا ذرا سی بات پر بھڑک اٹھتیں، مجھہ پر خوب گرجتیں برستیں۔ اس سے بھی میرا دل خون ہوتا۔ ماں کو تو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ نیک ہونا چاہئے، زیادہ انصاف سے کام لینا چاہئے، جس طرح جن پریوں کی کہانیوں میں ہوتا ہے۔

کبھی کبھی میں ان سے پوچھتا:

''کیا تم ہم سے خفا ہو؟''

''اپنے کام سے کام رکھہ''، وہ تڑخ کر جواب دیتیں۔

میں نے یہ بھی بھانپ لیا کہ نانا کوئی کھچڑی پکا رہے ہیں جس سے نانی اور ماں دونوں خوف‌زدہ ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا کہ نانا

ماں کے کمرے میں بند ہو جاتے اور چیختے بالکل گڈریے نیکانور کی بانسری کی طرح - ایک بار میری ماں اتنے زور سے چیخیں کہ گھربھر نے ان کی آواز سنی:

''یہ کبھی نہیں ہو سکتا، کبھی نہیں!،،

ماں نے زور سے دروازہ کھول دیا اور نانا دھاڑے -

شام کا وقت تھا - نانی باورچی خانے میں بیٹھی نانا کی قمیص سی رہی تھیں - وہ قمیص سیتی جاتی تھیں اور بڑبڑاتی جاتی تھیں - جب دروازہ بھڑ سے بند ہوا تو نانی بولیں:

''خدایا! لو وہ تو کرایہ‌داروں کے پاس چلی گئی!،،

یکایک نانا باورچی خانے میں دوڑے ہوئے آئے اور نانی کے سر پر گھونسہ مار کر اپنے ہاتھہ کو سہلاتے ہوئے پھنکارے:

''تو منہ بند رکھنا کب سیکھیگی بڑھیا ڈاین؟،،

''تم سٹھیا گئے ہو،، نانی بڑے دھیرج سے بال ٹھیک کرتے ہوئے بولیں - ''تم اس بھرے میں ہو کہ میری زبان پر تالا ڈال دوگے اور میں چپ رہوں‌گی؟ خاطرجمع رکھو میں جب کبھی تمہارے ارادے بھانپوں گی اسے ضرور بتاؤں‌گی...،،

نانا ٹوٹ پڑے نانی پر اور ان کی گردن مڑوڑنے لگے - نانی نے بچاؤ نہ کیا لیکن بولتی رہیں:

''مار، مجھے مار تو، بیوقوف! اور مار، جان لے لے!،،

میں تندور کے اوپروالے تختے پر بیٹھا تھا - وھیں سے میں نے نانا پر تکیے، کمبل اور جوتے پھینکنا شروع کئے - لیکن غصے کا بھوت کچھہ اس طرح سوار تھا کہ ان کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی - نانی فرش پر گر پڑیں - نانا ان کے سر کو ٹھوکر لگاتے رہے - ٹھوکر لگاتے لگاتے آخر وہ خود گر پڑے اور گرتے گرتے پانی کی بھری بالٹی الٹ دی - نانا تھوکتے کھنکارتے ہوئے اچھل کھڑے ہوئے - وہ وحشی نگاھوں سے دیکھتے ہوئے باورچی خانے سے نکلے اور دوچھتی میں اپنے کمرے تک بھاگتے چلے گئے - نانی کراھتی ہوئی اٹھیں اور بنچ پر بیٹھہ کر اپنے الجھے بال سلجھانے لگیں - میں تختے سے کود کر نیچے آ گیا -

''یہ سارے تکیے اور چیزیں اٹھا اور تندور پر رکھه،، نانی نے غصے میں کہا - ''خوب تماشا ھے، تکیے پھینکے جا رھے ھیں چاروں طرف - اپنے کام سے کام رکھنا سیکھه! اور ذرا دیکھو — وہ بڈھا بھی کس طرح آپے سے باھر ھوا ھے ھونہه!،،

یکایک ان کے منه سے ھلکی سی چیخ نکلی - ان کی تیوریاں چڑھه گئیں -

''ذرا دیکھنا تو یہاں،، انہوں نے سر جھکاتے ھوئے کہا - ''کیا ھے، دکھه کیوں رھا ھے؟،،

میں نے ان کے بال جو اٹھائے تو کیا دیکھتا ھوں که بالوں کا کانٹا گدی میں پیوست ھے - میں نے کانٹا نوچ لیا - دیکھتا کیا ھوں که دوسرا کانٹا بھی اسی طرح چبھا ھوا ھے - میری تو جان نکل گئی -

''ماں کو بلا لاؤں،، میں نے کہا ''میں ڈرتا ھوں!،،

''کیا کہا — ماں کو بلا لاؤں؟،، وہ ھاتھه ھلاتے ھوئے چلائیں - ''خدا کا شکر ادا کر که اس نے یه تماشا نہیں دیکھا اور تو اسے بلائیگا - بھاگ جا یہاں سے!،،

انہوں نے لیس بنانےوالوں کی چستی سے کام لیتے ھوئے خود ھی اپنے کالے بالوں میں انگلیاں گڑودیں اور کانٹے کو ٹٹولنے لگیں - میں نے دانت پیس کر ھمت کی اور دو اور کانٹے نکالنے میں نانی کا ھاتھه بٹایا -

''دکھه رھا ھے ایں؟،،

''بس یونہی! کل حمام گرم کروں‌گی، سر دھوؤں گی اور سارا درد ھوا ھو جائے گا - پر ماں سے کہتے مت پھریو — میری جان میرے کبوتر، اوں؟،، انہوں نے بڑی نرمی سے مجھے چمکارا - ''ویسے ھی وہ ایک دوسرے کے خلاف ادھار کھائے بیٹھے ھیں - کہنا مت — اوں؟،،

''نہیں - ،،

''بھولنا مت، ھاں! اچھا اب آؤ ھم یہاں سب ٹھیک ٹھاک کر دیں - دیکھنا ذرا میرے منه پر تو کوئی خراش وراش نہیں؟ نہیں؟ بس تو ٹھیک ھے - ،،

انہوں نے فرش صاف کرنا شروع کیا اور میں نے دل کی گہرائی سے کہا:

"تم تو ولی ہو ولی - لوگ تمہیں پیٹتے ہیں، ٹھوکریں لگاتے ہیں اور تم کچھ بھی تو نہیں کہتیں!"

"یہ کیا بات ہوئی، حماقت! ولی اونہہ! واہ ولی ڈھونڈنے کی تجھے سوجھی بھی تو کہاں سوجھی؟"

وہ دیر تک بڑبڑاتی رہیں اور چاروں ہاتھ پاؤں کے بل رینگتی رہیں - میں چوکھٹ پر بیٹھا نقشہ بنا رہا تھا کہ نانی کا انتقام نانا سے کس طرح لیا جائے -

نانا نے پہلی بار میری آنکھوں کے سامنے نانی کو اتنی بری طرح مارا پیٹا تھا - شام کے دھندلکے میں مجھے ان کا سرخ چہرہ تیرتا اور ان کے آگ جیسے بال اڑتے نظر آئے - میرا جی جل بھن کر کباب ہو رہا تھا - دل بہت اداس ہوگیا کہ انتقام کی کوئی مناسب تدبیر نہیں سوجھی -

دو دن بعد جو میں ان کی دوچھتی میں گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ نانا ایک کھلے ہوئے صندوق کے سامنے بیٹھے ہیں اور کاغذات الٹ پلٹ کر رہے ہیں - ان کے پاس ہی ان کی ولیوں والی محبوب جنتری رکھی ہوئی تھی — بھورے رنگ کے بھاری کاغذ کے بارہ تختے جن پر مہینوں کے دنوں کے خانے بنے ہوئے تھے اور خانوں میں ولیوں کی شبیہیں تھیں - نانا کو یہ جنتری جان سے زیادہ عزیز تھی - وہ مجھے یہ جنتری اس وقت دکھاتے تھے جب خلاف معمول مجھ سے بہت زیادہ خوش ہوتے تھے - اور یہ کبھی کبھار ہی ہوتا تھا - میں ان بھوری بھوری تصویروں کو کچھ عجیب جذبات کے ساتھ دیکھا کرتا تھا - میں ان میں سے بعض ولیوں کی زندگی کا حال جانتا تھا: کیریک اور اولیتا، شہید ورواراِ، پنتیلیمون، وغیرہ وغیرہ! خاص طور پر ولی الیکسئی کی المناک زندگی کا میرے دل پر بڑا اثر تھا - میری نانی نے ان کے بارے میں جو شاندار نظمیں سنائی تھیں دل میں گھر کر گئی تھیں - جب میں ان ولیوں کو دیکھتا تھا تو دل کو ڈھارس بندھتی تھی کہ ہمیشہ لوگ شہادت کا جام پیتے رہے ہیں -

لیکن اب میں نے اس جنتری کے پرزے اڑانے کی ٹھان لی - جب نانا کھڑکی کے پاس گئے اور ایک نیلے کاغذ کو پڑھنے میں محو ہو گئے جس پر عقاب بنے ہوئے تھے تو میں نے جھپٹ کر کئی تختے دبوچے

اور زینے پر یہ جا وہ جا، نانی کی میز سے قینچی اڑائی، اچھل کر تندور پر چڑھا اور ولیوں کے سر چھٹا چھٹ قلم کرنے لگا۔ جب میں نے ایک صف کی گردنیں اڑادیں تو میرا دل بھر آیا۔ اس لئے میں نے خانوں کی لکیروں کے کنارے کنارے کاٹنا شروع کیا۔ ابھی میں نے یہ خانے کاٹے بھی نہیں تھے کہ دروازے پر نانا آن دھمکے۔

''تجھے جنتری چھونے کی اجازت کس نے دی؟،، انہوں نے پوچھا۔

اچانک ان کی نظر ان چھوٹے چھوٹے چو کور ٹکڑوں پر پڑی جو تندور پر بکھرے ہوئے تھے۔ انہوں نے جھپٹ کر ٹکڑے اٹھا لئے اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان کو دیکھا۔ اب ان پر کھلا کہ اصل میں کیا گل کھل رہے ہیں۔ ان کا چہرہ بگڑ گیا اور داڑھی لرزنے لگی۔ انہوں نے اتنے زور سے سانس لی کہ کاغذ کے ٹکڑے پھرپھر اڑنے لگے۔

''یہ تو نے کیا کیا ایں؟،، آخرکار وہ چنگھاڑے اور میری ٹانگ پکڑ کر مجھے تندور سے کھینچنے لگے۔ میں بالکل ہوا میں قلا بازی کھا گیا۔ لیکن نانی نے مجھے تھام لیا۔

''مار ڈالوں گا!،، نانا چلائے اور میرا اور نانی دونوں کا کچومر نکالنے لگے۔

یکایک اماں آگئیں۔ میں اچھل کر ان کے پاس پہنچ گیا۔ وہ میرے آگے ڈھال بنی کھڑی تھیں۔ انہوں نے نانا ابا کے مکوں کو روکتے ہوئے ڈانٹ کر کہا:

''یہ کیا تماشا ہے؟ آپے میں آؤ!،،

''میں مارا گیا!،، نانا کھڑکی کے پاس بنچ پر گر پڑے اور فریاد کی۔ ''تم سب میرے خلاف ادھار کھائے بیٹھے ہو — تم سب!،،

''تمہیں یہ تماشا کرتے شرم نہیں آتی؟،، اماں نے ہلکی آواز میں کہا۔

نانا چنگھاڑے اور بنچ پر پیر پٹکنے لگے۔ ان کی آنکھیں بند تھیں اور داڑھی کچھ عجیب مضحکہ خیز ڈھنگ سے چھت کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ واقعی میری ماں کے سامنے یہ تماشا رچانے پر شرم سے پانی پانی ہوتے جا رہے ہیں۔ اسی وجہ سے تو انہوں نے آنکھیں کس کے بند کر رکھی تھیں۔

''میں ان ٹکڑوں کو کپڑے پر چپکا دوں۔ پھر آپ کی جنتری پہلے سے بھی زیادہ کراری ہو جائے گی،، ماں نے کاغذ کے تختوں کو برابر کرتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو کیسا تڑا مڑا کاغذ ہے، بالکل کوچا، ایں؟،،

ماں اسی لہجے میں بات کر رہی تھیں جس لہجے میں وہ مجھ سے سبق کے وقت بات کرتی تھیں جب ان کی باتیں سر کے اوپر سے گذر جاتی تھیں۔ یکایک نانا اٹھے اور انہوں نے بڑے جاہ و جلال سے اپنی قمیص درست کی، جیکٹ برابر کی، گلا صاف کیا اور بولے:

''اچھا۔ دیکھنا — سب آج کے آج چپک جائیں ہاں! میں دوسرے تختے بھی لائے دیتا ہوں!،،

وہ دروازے کی طرف بڑھے مگر دہلیز پر پہنچ کر مڑے۔

''اس کی مرمت ہونی چاہئے!،، انہوں نے ٹیڑھی میڑھی انگلی میری طرف ہلاتے ہوئے کہا۔

''ہاں ضرور!،، ماں نے ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ''کیوں، تو نے یہ شرارت کیوں کی؟،، انہوں نے مجھ پر جھکتے ہوئے پوچھا۔

''میں نے جان بوجھ کر کیا۔ اگر انہوں نے نانی اماں کو پھر مارا پیٹا تو میں ان کی داڑھی کاٹ دونگا۔،،

نانی اماں اپنا پھٹا ہوا کرتا اتار رہی تھیں۔ انہوں نے یہ سن کر سرہلایا۔

''چھوکرے تو نے کیا کہا تھا، ایں؟ زبان پر تالا ڈال!،، انہوں نے خفگی سے تھوکتے ہوئے کہا۔ ''خدا کرے تیری زبان کو آگ لگے اور تو چپڑ چپڑ کرنا بھول جائے!،،

ماں نے نانی کو دیکھا اور پھر میری طرف۔

''کب مارا ایں؟،، انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

''شرم کر وروارا! تو کیسی کیسی باتیں پوچھ رہی ہے بیٹے سے؟ تجھے دوسروں کے پھٹے میں پاؤں ڈالنے سے مطلب؟،،

''ماں، آہ ماں! تم کیسی فرشتہ ہو!،، ماں نے نانی کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔

''ہوں۔ بڑی اچھی ماں ہوں میں۔ چھوڑ مجھے جانے دے!،،

دونوں نے ایک منٹ کو ایک دوسرے کو خاموشی سے دیکھا پھر

الگ ہوگئیں — نانا کے قدموں کی آہٹ گلیارے میں سنائی دے رہی تھی۔

جس دن سے ماں آئیں اسی دن سے پڑوس کے فوجی کی من‌چلی بیوی سے ان کی گاڑھی چھننے لگی ماں ہر شام اس کے ہاں جاتیں۔ وہاں ان کی ملاقات بیٹلنگ کے گھر کے لوگوں سے ہوتی — طرحدار جوان بیگموں اور جیالے افسروں کا جھرمٹ۔ نانا کو یہ ادا پھوٹی آنکھ نہ بھاتی۔ اکثر جب وہ رات کا کھانا کھانے بیٹھتے تو چمچہ اٹھا کر ان کی طرف اشارہ کرتے اور بڑبڑاتے:

''لو پھر محفل گرم ہے! لعنت ہو ان پر! آج پھر رات آنکھوں میں کٹ جائےگی!،،

جلد ہی انھوں نے کرایہ داروں سے کہا بوریہ بستر سمیٹو اور نو دو گیارہ ہو جاؤ۔ جب کرایہ‌دار دفان ہوئے تو وہ نہ جانے کہاں سے اوٹ پٹانگ قسم کے فرنیچر اٹھا لائے اور ان کو خالی کمروں میں جما دیا۔ دروازے پر تالا ڈال دیا۔

''اب ان کم‌بخت کرایہ‌داروں کی ضرورت نہیں — میں خود ہی مہمان بلاؤں‌گا۔،،

اور ہر اتوار کو مہمان آنا شروع ہوئے۔ ان میں نانی کی بہن بھی ہوتیں ماتریونا ایوانوونا۔ وہ قیامت کا شور اور ہنگامہ مچاتی آتیں، شلغم برابر تو ناک تھی ان کی، دھوبن کا کام کرتی تھیں۔ اس وقت لکیر دار ریشمیں لباس پہنے ہوئے تھیں اور سر پر سنہرا رومال بندھا ہوا تھا۔ ان کے ساتھ ان کے دو بیٹے بھی آتے۔ واسیلی نقشہ‌نویس تھا۔ اس کے بال لمبے تھے اور بھورے لباس میں ملبوس تھا۔ بڑا ہی زندہ دل اور شریف آدمی تھا۔ وکٹر کا سر بالکل گھوڑے جیسا تھا اور اس کے پتلے سے چہرے پر جھائیوں سے داغ داغ اجالا ہو رہا تھا۔ وہ دروازے پر ربر کے جوتے اتار رہا تھا تو اس کی چچیاتی ہوئی آواز سنائی دی:

''اندرئی پاپا، اندرئی پاپا...،،

اس آواز پر میں حیران بھی ہوا اور سہما بھی۔

یاکوف ماموں چھتارا سے لیس آتے، اپنے ساتھ ایک مسکین صورت، گنجا اور کانا گھڑی ساز بھی لاتے۔ وہ لمبا سیاہ کوٹ پہنے

ہوئے تھا جس کی وجہ سے دھرا پادری نظر آ رہا تھا - وہ مستقل کونے میں چپ چاپ بیٹھا ہوا تھا - اس کا سر ایک طرف ذرا سا جھکا ہوا تھا اور چکنی منڈی ہوئی ٹھوڑی ایک انگلی پر ٹکی ہوئی تھی - اس کا رنگ سانولا تھا - اس کی ایک آنکھ ہر شخص پر چبھتی ہوئی دکھائی دیتی تھی - وہ بہت کم بول رہا تھا اور مستقل ایک ہی بات دوہرائے جا رہا تھا:

''زحمت نہ کیجئے، ارے ایک ہی بات ہے...،،

جب میں نے پہلی بار اسے دیکھا تو مجھے وہ زمانہ یاد آ گیا، بہت پہلے کا زمانہ - اس وقت ہم نووایا کوچے پر رہتے تھے - میں نے کوچے پر بے تحاشا ڈھول کی دھما دھم سنی - دیکھتا کیا ہوں کہ ایک بڑی سی سیاہ گاڑی کو سپاہی گھیرے ہوئے ہیں اور لوگ جیل سے بڑے چوک کی طرف جا رہے ہیں - گاڑی میں ایک بنچ پر ایک آدمی بیٹھا ہے - اس کے سر پر اونی گول ٹوپی تھی - اور ہاتھوں میں بیڑیاں - اس کے جسم کی حرکت کے ساتھہ زنجیریں بج رہی تھیں - گردن سے ایک سیاہ تختی لٹک رہی تھی اور اس پر بڑے بڑے سفید حروف میں کچھہ لکھا ہوا تھا - اس کا سر جھکا ہوا تھا جیسے وہ سیاہ تختی پڑھہ رہا ہو -

''یہ میرا بیٹا ہے،، میری ماں نے گھڑی ساز سے مجھے ملاتے ہوئے کہا - لیکن میں ڈر کر کتراتے ہوئے اور دونوں ہاتھہ کمر پر باندھے ہوئے ایک طرف کو نکل گیا -

''زحمت نہ کیجئے،، اس نے منہ کو داھنے کان کی طرف کھینچتے ہوئے خوفناک انداز سے کہا - اس نے میری پیٹی پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور بڑی تیزی اور چستی سے مجھے گھمایا -

''اچھا، لڑکا کرارا ہے!،، اس نے مجھے چھوڑتے ہوئے کہا -

میں نے اپنا مورچہ چمڑے کی کرسی پر جما لیا جہاں میں آسانی سے سو بھی سکتا تھا - نانا ہمیشہ ڈون کی لیتے تھے کہ یہ کرسی شہزادے گروزینسکی کی ہے - کونے سے میں نے دیکھا کہ بڑے لوگ کتنی کوشش کرکے خوش ہونے پر تلے ہوئے ہیں اور گھڑی ساز کتنے عجیب اور مشکوک طریقے سے چہرے کی کیفیت بدل رہا ہے - اس کا چہرہ پیلا تھا، چپچپا، پسیجتا اور پگھلتا ہوا سا -

جب وہ مسکراتا تو اس کے ہونٹ دائیں طرف کھنچ جاتے اور اس کی چھوٹی سی ناک بھی بھاگتی ہوئی معلوم ہوتی — جیسے شوربے میں تیرتی ہوئی پھلکی۔ اس کے بڑے بڑے جھانکتے ہوئے کان بھی ہلتے۔ کبھی ایک آنکھ کے اوپر بھوؤں کے ساتھ کان اٹھتے ہوئے معلوم ہوتے اور کبھی رخساروں کی ہڈیوں کی طرف جھکتے ہوئے۔ مجھے لگا اگر یہ آدمی چاہے تو بالکل ہاتھوں کی طرح اپنے کانوں سے اپنی ناک ڈھک سکتا ہے۔ کبھی کبھی ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے وہ زبان نکالتا جو بالکل لٹکن کی طرح گول معلوم ہوتی تھی۔ وہ زبان دھیرے سے ہلاتا اور اپنے موٹے اور چپچپاتے ہوئے ہونٹوں کو تر کرتا۔ مجھے اس تماشے میں لطف کم آیا اور اس پر حیرانی زیادہ ہوئی۔ میں کسی طرح بھی اس سے نظر نہ ہٹا سکا۔

مہمانوں نے چائے رم کے ساتھ پی جس سے جلی ہوئی پیاز جیسی بو آ رہی تھی۔ انہوں نے نانی کی کشید کی ہوئی شراب بھی پی — جو سنہری بھی تھی اور سبز بھی اور تار کول کی طرح سیاہ بھی۔ انہوں نے جیم بھی کھایا اور خشخاش اور شہد کے کیک بھی۔ کھاتے کھاتے ان کے پیٹ پھول گئے، وہ پسینے پسینے ہو گئے۔ انہوں نے نانی کے خوب گن گائے۔ جب ان کے پیٹ بھر گئے تو وہ اپنی اپنی کرسی پر اڑ گئے۔ ان کے چہرے سرخ تھے۔ اب انہوں نے بڑی سستی سے یاکوف ماموں کی طرف دیکھا اور کچھ بجانے کی فرمائش کی۔

یاکوف ماموں چھتارے پر جھک گئے۔ انہوں نے تاروں کی کھنچ تان کی اور بڑی بے سری آواز میں گانے لگے:

هم جیتے رہے، جیسے بن پڑا جیتے رہے
پر کچھ ہاتھ نہ آیا، کچھ ہاتھ نہ آیا
قازان سے آئیں بیگم
اور ہم نے ان کو ساری خبریں سنائیں۔

مجھے یہ گیت بڑا ہی دردناک لگا۔ نانی نے کہا:

''کچھ اور گا یاکوف — کوئی سچا گیت۔ یاد ہے تجھے موتریا، پہلے کیسے کیسے گیت گاتے تھے؟''

"میری جان، اب گانے کا اور ہی چلن ہے..."، دھوبن نے بڑی شان سے ریشمیں لباس کو سرسراتے ہوئے کہا۔

میرے ماموں نیم‌وا آنکھوں سے نانی اماں کو دیکھتے رہے جیسے وہ بہت دور ہوں۔ دل بجھانے والا سر پھوٹتا رہا اور وہ دردناک بول الاپتے رہے۔

نانا چپکے چپکے گھڑی‌ساز سے کچھ بات چیت کر رہے تھے اور انگلی سے اشارے کر کرکے کچھ بتا رہے تھے۔ گھڑی‌ساز نے بھوئیں اٹھائیں اور ماں کی طرف دیکھا، سر ہلایا اور اس کے رقیق چہرے پر ایک عجیب کیفیت پیدا ہو گئی۔

ماں حسب‌دستور سرگیئف خاندان کے لوگوں کے ساتھ بیٹھی تھیں اور واسیلی سے آہستہ آہستہ گمبھیرتا کے ساتھ باتیں کر رہی تھیں۔

"ہاں اس کے بارے میں سوچنا چاہئے..."، واسیلی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

وکٹر کے ہونٹوں پر شکم سیر مسکراہٹ ابھری۔ وہ پہلو بدل کر یکایک باریک آواز میں گانے لگا:

"اندرئی پاپا، اندرئی پاپا..."

ہر شخص نے بات چیت بند کر دی اور اس کی طرف دیکھا۔

"اس نے یہ تھیٹر میں سیکھا ہے"، دھوبن نے بڑے فخر سے روشنی ڈالی۔ "تھیٹر میں گاتے ہیں نا ایسے گانے!"

دو تین بار اور اس قسم کی شام کی محفلیں گرم ہوئیں۔ یہ شامیں اتنی بوجھل اور اکتا دینے والی ہوتیں کہ بھلائے نہیں بھلائی جا سکتیں۔ پھر ایک دن دوپہر کو گھڑی‌ساز نازل ہو گیا کہیں سے، گرجا گھر کی عبادت کے فوراً بعد۔ میں ماں کے کمرے میں بیٹھا پرانے زری کے کام کو کھولنے میں ہاتھ بٹا رہا تھا۔ دروازہ بھڑ سے کھلا اور نانی کا خوف زدہ چہرہ دکھائی دیا۔ وہ جلدی سے بولیں اور غائب ہوگئیں:

"واریا وہ آیا ہے!"

ماں بے حس و حرکت بیٹھی رہیں۔ ایک منٹ بعد پھر دروازہ کھلا۔ نانا نے بڑی شان سے کہا:

''کپڑے بدل اور میرے ساتھ آ وروارا!،،

''کہاں؟،، ماں نے ان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھے بنا کہا اور اٹھیں بھی نہیں۔

''آ، خدا کی رحمت ہو تجھ پر۔ اب جھک مت کر۔ بڑا اچھا آدمی ہے، اپنے دھندے میں یکتا۔ وہ الیکسئی کا بڑا اچھا باپ ثابت ہوگا...،،

نانا بڑی شان سے بول رہے تھے اور مستقل اپنی رانوں کو تھپتھپا رہے تھے۔ ان کی کہنیاں ہل رہی تھیں جیسے ان کے بازو، بڑھنے کو بیقرار ہوں اور وہ ان کو بڑی مشکل سے قابو میں کر رہے ہوں۔

''میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں یہ کبھی نہیں ہوگا،، میری ماں نے اطمینان سے کہا۔

نانا آگے آگے بازو پھیلائے ماں کی طرف بڑھے جیسے کوئی اندھا چل رہا ہو۔

''آ، آ— نہیں تو میں جھونٹے گھسیٹتا ہوا لے جاؤں گا!،، وہ پھنسی پھنسی آواز میں دھاڑے اور ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

''تم مجھے گھسیٹوگے؟،، میری ماں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ان کا چہرہ سفید تھا۔ ان کی آنکھیں غیض و غضب سے مچ گئیں۔ انہوں نے تیزی سے اسکرٹ اور بلاؤز اتارنا شروع کر دئے۔ جب وہ صرف پیٹی کوٹ میں رہ گئیں تو انہوں نے نانا سے کہا:

''اچھا اب لے چلو گھسیٹ کرمجھے!،،

نانا نے دانت کھسوڑے اور مکا دکھایا:

''کپڑے پہن وروارا!،،

ماں نے ان کو دھکیلا اور دروازے کی طرف بڑھیں:

''اچھا اب چل رہے ہو یا نہیں؟،،

''میں تجھے عاق کر دوں گا!،، نانا پھنکارے۔

''بلا سے۔ پھر؟،،

ماں نے دروازہ کھولا لیکن نانا نے ان کا پیٹی کوٹ پکڑ لیا اور گھٹنوں کے بل گر گئے۔

''وروارا تیرا حشر برا ہوگا، چڑیل، دیکھ لینا! میری ناک نہ کٹوا! وروارا کی ماں، وروارا کی ماں!،، وہ گڑگڑائے۔

نانی نے پہلے ہی ماں کا راستہ روک رکھا تھا اور ان کو کمرے میں واپس جانے کے لئے چوزے کی طرح ہنکا رہی تھیں۔

''وروارا تیرا دماغ چل گیا ہے!،، وہ بڑبڑائیں۔ ''لوٹ جا، بے شرم چھنال!،،

جب وہ ماں کو کمرے میں واپس لے آئیں تو دروازے کا قلابہ لگایا اور نانا کی طرف مڑیں۔ انہوں نے ایک ہاتھ سے بڑے میاں کو اٹھا لیا اور دوسرے ہاتھ سے مکا دکھایا۔

''او او او، بڑھے شیطان، پگلے!،،

نانی نے بڑے میاں کو چیتھڑوں کے گڈے کی طرح صوفے پر بٹھا دیا۔ ان کا سر جھک گیا اور منہ کھل گیا۔

''جا پہن ابھی کپڑے!،، وہ ماں پر گرجیں۔

''میں اس کے پاس نہیں جاؤں گی، سنا تم نے؟،، ماں نے کپڑے اٹھاتے ہوئے کہا۔

نانی نے مجھے صوفے سے دھکیل دیا اور بولیں:

''جا دوڑ کر ایک ڈونگا پانی تو لا!،،

وہ قریب قریب سرگوشی میں بات کر رہی تھیں مگر بڑے اطمینان اور زور سے۔ میں دوڑا ہوا گلیارے میں گیا۔ مجھے سامنے کے کمرے سے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ کوئی آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔

''کل میں چلی جاؤں گی!،، میں نے ماں کو کہتے سنا۔

میں باورچی خانے میں گیا اور کھڑکی پر بیٹھ گیا جیسے خواب دیکھ رہا ہوں۔

نانا پھنکار اور کراہ رہے تھے۔ نانی زیرلب بڑبڑا رہی تھیں۔ پھر ایک دروازہ کھلا۔ ہر طرف خاموشی اور دہشت پھیلی ہوئی تھی۔ یکایک مجھے یاد آیا مجھے کس لئے بھیجا گیا تھا۔ میں نے ڈونگا بھرا اور گلیارے میں گھسا۔ گھر کے سامنے والے حصے سے گھڑی‌ساز نکلا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ سمور کی ٹوپی کو تھپتھپا رہا تھا اور کھنکار رہا تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے نانی اماں نکلیں۔ ان کے

ھاتھ پیٹ پر بندھے ہوئے تھے۔ وہ جھکی ہوئی آہستہ آہستہ کہہ رہی تھیں:

''تم خود ہی سمجھ سکتے ہو — محبت زبردستی کا سودا تو ہے نہیں — یہ آگ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے۔''

گھڑی ساز لڑکھڑاتا ہوا دروازے سے نکلا اور احاطے میں چلا گیا۔ نانی نے اپنے اوپر صلیب کا نشان بنایا اور وہاں کھڑی سر سے پاؤں تک لرزتی رہیں۔ وہ ہنس رہی تھیں یا رو رہی تھیں — میں یہ سمجھ نہ پایا۔

''کیا بات ہے؟'' میں دوڑتا ہوا ان کے پاس گیا اور پوچھا۔

انہوں نے ڈونگا میرے ھاتھ سے چھینا۔ پانی چھلکا اور میرے پیر بھیگ گئے۔ بولیں:

''کہاں گیا تھا تو پانی لینے؟ دروازہ بند کر!''

وہ واپس ماں کے کمرے میں چلی گئیں اور میں باورچی خانے میں۔ وہاں میں ان سب کی کراھیں، ٹھنڈی سانس، بڑبڑاھٹ سنتا رہا جیسے وہ سب اپنے بس سے زیادہ بھاری چٹان کو دھکیل کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جا رہے ہوں۔

بڑا شاندار دن تھا۔ جاڑے کے سورج کی لمبی لمبی کرنیں برف پرش کھڑکی کے شیشوں کو چیرتی ہوئی اندر آ رہی تھیں۔ کھانے کی میز لگائی گئی۔ میز برتنوں اور سنہری کواس کی صراحیوں سے سجی ہوئی چمک رہی تھی۔ ساتھ ہی نانا کی وادکا سے بھی روشنی پھوٹ رہی تھی جس کا رنگ جڑی بوٹیوں کی وجہ سے سبز ہو گیا تھا جو خوشبو کی خاطر وادکا کی صراحی میں ڈال دی گئی تھیں۔ کھڑکی کے شیشے پر ایک جگہ جمی ہوئی برف پگھل گئی تھی۔ میں نے اس دائرے سے چھتوں پر شعلہ فشاں برف کی جھلک دیکھی۔ مجھے احاطے کے کھمبوں، ڈربوں اور چڑیا گھروں پر جمی ہوئی نقرئی ٹوپیوں سے چنگاریاں اڑتی ہوئی دکھائی دیں۔ کھڑکیوں کی چوکھٹوں سے لٹکتے ہوئے دھوپ میں نہائے ہوئے پنجروں میں چڑیاں پھدک اور پھڑپھڑا رہی تھیں۔ پالتو مینائیں اور گوریاں بڑی سریلی آواز میں چہک رہی تھیں۔ سنہری مینا گا رہی تھی۔ لیکن موسیقی اور دھوپ سے منور دن میرے لئے کوئی خوشی نہ لایا۔ دن منحوس تھا۔ ہر چیز منحوس

تھی - میرا جی چاھا کہ میں چڑیوں کو اڑا دوں اور لو پنجرہ اتار ھی رھا تھا کہ نانی بڑبڑاتی گڑبڑاتی باورچی خانے میں آ گئیں - وہ تندور کی طرف دوڑیں اور رانوں پر دوھتڑ مارتے ھوئے چلائیں :

''تم سب پر لعنت ھو، اللہ کا قہر نازل ھو تم سب پر! ھائے اکولینا تو بھی کیسی سڑی بڑھیا ھے، پگلی کہیں کی!،،

نانی نے تندور سے سموسے نکالے، انگلیوں سے جلی ھوئی تہیں کھرچ کر الگ کیں اور کڑھن سے تھوکتے ھوئے بولیں :

''لو جل کر راکھہ ھو گئے! واہ کیا سنکے ھیں سموسے! تھو! جن دیو جمع ھیں — سب کے سب! اللہ کا قہر نازل ھو سب پر - سب کھڑے کھڑے اٹھہ جائیں اس دنیا سے! ارے تو وھاں بیٹھا کیا دیکھہ رھا ھے ٹکر ٹکر، الو کی دم! سر پر ایسا ھتوڑا ماروں کہ بھر کس نکل جائے مونڈی کاٹے!،،

وہ سموسے الٹتی جاتیں اور روتی جاتیں - آنسو بہاتی جاتیں اور سموسوں کی جلی ھوئی تہیں کھرچتی اور جھاڑتی جاتیں، ساتھہ ھی سموسوں کو آنسوؤں کے یہ بڑے بڑے قطروں سے بھگوتی جاتیں -

ماں اور نانا باورچی خانے میں آئے - نانی نے جلے ھوئے سموسے میز پر پٹک دئے - پلیٹیں جھنجھنا اٹھیں -

''اللہ سمجھے تم سے! دیکھہ لو کیا گل کھلے ھیں! اور یہ سب تمہارے کارن!،،

ماں کا دل شانت تھا - وہ خوش تھیں - انہوں نے نانی کو گلے لگا لیا اوز چمکارا - بولیں ''بھول جاؤ ماں!،، نانا بہت ھی تھکے تھکے نظر آ رھے تھے - چہرے پر جھریاں لرز رھی تھیں - وہ میز پر بیٹھہ گئے - انہوں نے گردن کے گرد رومال باندھا، دھوپ کی وجہ سے سوجی سوجی آنکھیں میچ لیں اور بڑبڑائے :

''اچھا اچھا! چھوڑو بھی اسے! ھم پہلے بھی سموسے کھا چکے ھیں - ھمارا پروردگار — ذرا بخیل ھے — برسوں کی کثر منٹوں میں نکال دیتا ھے، تو چھپر پھاڑ کر دیتا ھے اور سود بھی نہیں لیتا - بیٹھہ جاؤ، واریا - چلو، چھوڑو بھی!،،

ایسا لگتا تھا جیسے ان کے دماغ میں کچھہ الجھن سی ھے - پورے کھانے کے دوران میں وہ خدا کے بارے میں بولتے رھے، ایوب

کی آزمائشوں کا قصہ سناتے رہے - بتاتے رہے باپ کے دل کو کیسے کچو کے برداشت کرنے پڑے، کیسے کیسے زخم کھانے پڑے - نانی نے جھلا کر ان کی بات کاٹ دی:

''بس بس، کھاؤ - بکو مت!،، انہوں نے کہا -

ماں ہنس پڑیں - ان کی روشن آنکھیں چمک اٹھیں -

''ڈر گیا ایں؟،، انہوں نے مجھے کہنی سے ٹھوکا دیتے ہوئے کہا -

میں بہت زیادہ تو نہیں ہولا تھا - لیکن اب مجھے کچھ عجیب سا لگ رہا تھا اور سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہوا کیا -

ان لوگوں نے خوب کھایا اور دیر تک کھایا - یہ ہر اتوار کا دستور تھا - یقین نہ آتا تھا کہ یہ وہی لوگ ہیں جو کوئی ڈیڑھ گھنٹہ پہلے ایک دوسرے پر چیخ چنگھاڑ رہے تھے، ایک دوسرے کو نوچ لینے کے لئے لپک رہے تھے، سسکیاں بھر رہے تھے اور غصے سے کھول رہے تھے - میرا دل یہ ماننے کو بھی تیار نہ تھا کہ یہ سب کچھ انہوں نے سنجید گی سے کیا تھا یا انہیں اس سلسلے میں کچھ کوشش کرنی پڑی تھی - میں ان کے رونے اور چلانے کا، چیخم دھاڑ اور جھگڑوں کا عادی ہو چکا تھا جو بار بار شعلوں کی طرح بھک سے بھڑک اٹھتے تھے اور بھک سے بجھ جاتے تھے - اب پہلے کی طرح ان ہنگاموں سے میرے دل میں کوئی ہیجان بپا نہ ہوتا تھا -

بہت بعد میں مجھ پر یہ راز کھلا کہ روسی اپنی زندگی کے افلاس اور بوجھل پن سے اکتا کر جھگڑوں اور دکھوں سے اپنا غم غلط کیا کرتے تھے، بچوں کی طرح اپنے دکھوں سے کھیلتے، اپنے درد کا تماشا بناتے اور انہیں اپنی بدنصیبوں پر شاید ہی کبھی شرم آتی -

جب زندگی بےرنگ اور بےچمک ہو تو اس وقت دکھ درد سے ہی زندگی میں کچھ خوشگوار رنگ پیدا ہوتا ہے، اس وقت کہیں آگ لگ جائے تو اسی سے جی کو ڈھارس بندھتی ہے، دل میں کچھ روشنی ہوتی ہے - سپاٹ چہرے پر مسا بھی موتی کا کام کرتا ہے -

اس واقعے کے بعد ماں میں نیا دم خم آ گیا ۔ وہ سر تان کر چلنے لگیں ۔ وہ گھر کی مالکن بن گئیں ۔ نانا بالکل مدھم پڑ گئے، بالکل چپ چپ رہنے لگے ۔ سرے سے پہلے والے نانا رہے ھی نہیں ۔

انہوں نے گھر سے نکلنا چھوڑ دیا ۔ وہ دوچھتی میں بیٹھے کوئی پراسرار سی کتاب پڑھتے رہتے جس کا نام تھا ''میرے ابا جان کی یادداشت،، ۔ وہ یہ کتاب صندوق میں مقفل رکھا کرتے تھے ۔ میں نے اکثر دیکھا تھا کہ اس کتاب کو نکالنے سے پہلے ھاتھہ ضرور دھو لیا کرتے تھے ۔ کتاب چھوٹی اور موٹی تھی ۔ گہرے بھورے رنگ کے چمڑے کی جلد تھی اس کی ۔ نیلگوں سرورق پر دھندلی دھندلی روشنائی سے یہ عبارت لکھی ھوئی تھی :

''دلی عقیدت اور جذبہ‌ممنونیت کے ساتھہ محترم واسیلی کاشیرین کی نذر ۔ ،، اس پر عجیب و غریب دستخط تھے جو آخر میں پہنچ کر چڑیا کی طرح پر تولتے ھوئے معلوم ھوتے تھے ۔ نانا بڑی احتیاط سے چمڑے کی بھاری جلد کھولتے، چاندی کی کمانیوں والی عینک چڑھاتے، ناک پر عینک جماتے اور دیر تک اس عبارت پر نگاھیں گاڑے رهتے ۔ میں نے کئی بار ان سے پوچھا کہ کون سی کتاب ھے ۔لیکن وہ بڑے طمطراق سے جواب دیتے :

''تمہیں اس سے کیا کام ۔ کچھہ اور دم لےلو ۔ میری آنکھہ بند ھو جائے تو اس کتاب اور ریچھہ کی کھال کے کوٹ کے وارث تم ھی ھوگے ! ،،

وہ اب میری ماں سے بہت کم باتیں کرتے اور جب بات کرتے تو نرمی سے کرتے ۔ جب ماں کچھہ کہتیں تو کان دھر کر سنتے، ماموں پیوتر کی طرح آنکھیں جھپکاتے رہتے اور کچھہ بڑبڑاتے، ھاتھوں سے اشارے کرتے :

''اچھا اچھا، جو جی چاھے کرو ... ،،

ان کے بکس طرح طرح کے لاجواب کپڑوں سے بھرے ھوئے تھے — اسکرٹ جن پر زری کا کام تھا، ساٹن کی جیکٹیں، زربفت کے

لباس، ریشمی سرفان، کیکا اور کوکوشنیک* جن پر موتی جڑے ہوئے تھے، زرق برق رومال اور گمچھے، موردوویا کی سکوں والی بھاری مالا، رنگ برنگ کے جگمگاتے ہوئے پتھروں کے ہار - وہ سب میری ماں کے کمروں میں اٹھا لائے اور میز اور کرسیوں پر بکھیر دئے - جب ماں نے ان نادر چیزوں کی تعریف کی تو بولے:

''ہمارے زمانے میں لوگ بڑی شان سے قیمتی کپڑے وغیرہ پہنتے تھے - اب وہ بات کہاں - پہلے کپڑے قیمتی ہوتے تھے لیکن لوگوں کی زندگی سادہ تھی، ان میں زیادہ بھائی چارہ تھا - مگر میرے خیال میں وہ دن گئے، اب وہ دن لوٹ کر نہیں آنے کے! لو یہ کپڑے پہن کر دیکھو — پہنو...''

ایک دن ماں دوسرے کمرے میں گئیں اور جو لوٹیں تو گہرا نیلا سرفان پہنے ہوئے تھیں جس پر زری کا سنہرا کام تھا - ان کے سر پر موتیوں جڑا رومال بندھا ہوا تھا -

''ابا حضور کو پسند آیا؟''، انہوں نے نانا کے آگے جھکتے ہوئے کہا -

نانا دم‌بخود رہ گئے - ان کا چہرہ دمک اٹھا - وہ ماں کے چاروں طرف گھومے اور ہاتھ ہلا ہلا کر کچھ بڑبڑاتے رہے جیسے خواب میں بول رہے ہیں:

''آہ! کاش وروارا تو دولت‌مند ہوتی اور آس پاس لوگ شریف اور اچھے ہوتے!..''

اب میری ماں گھر کے سامنے والے دونوں کمروں میں رہتی تھیں - اکثر مہمان آیا کرتے تھے ان کے ہاں - سب سے زیادہ دونوں ماکسیموف بھائی آیا کرتے - پیوتر لمبا تڑنگا خوش‌رو افسر تھا، اس کی لمبی داڑھی سنہری تھی اور آنکھیں نیلی — وہی آدمی جس کے سامنے نانا نے میری مرمت کی تھی جب میں نے بڈھے کے گنجے سر پر تھوک دیا تھا - ایوگینی بھی لمبا تھا مگر اس کا رنگ زرد تھا اور ٹانگیں لمبی تھیں - اس کی سیاہ داڑھی نکیلی تھی - اس کی بڑی بڑی آنکھیں آلوچے جیسی تھیں - وہ ہمیشہ ہری وردی پہنتا تھا جس پر سنہرے بٹن

---

* سنگار کا سامان - (مترجم -)

ٹنکے ہوئے تھے اور جس کے تنگ شانوں پر سنہرے بلے چپکے ہوئے تھے۔ وہ بار بار کشادہ پیشانی پر جھک آنے والے لمبے اور لہردار بالوں کو پیچھے جھٹکتا رہتا تھا اور مسکراتا تھا، کچھ یوں جیسے آزردہ کرم ہو کر مسکرا رہا ہو۔ وہ ہمیشہ پھنسی پھنسی آواز سے کچھ نہ کچھ بولتا رہتا تھا اورہمیشہ اپنی بات ان ہی جملوں سے شروع کرتا تھا:

''دیکھو — میں اس چیز کو یوں دیکھتا ہوں...،،

ماں آنکھیں آدھی بند کئے اس کی باتیں سنتیں اور اکثر بات کاٹ کر ہنستیں:

''معاف کرنا ایوگینی واسیلی‌وچ، تم ابھی بچے ہو...،،

''بالکل ٹھیک — بچہ!،، بڑے ڈیل ڈول کا افسر اتفاق کرتا اور اپنی بات پر زور ڈالنے کے لئے اپنی ران پر ایک تھاپ بھی جما دیتا۔

کرسمس کی چھٹیاں بڑی دھوم دھڑکے کے ساتھ گزر گئیں۔ قریب قریب روز ھی میری ماں اور ان کے مہمان اچھے اچھے کپڑے پہنتے اور کہیں باہر چلے جاتے۔ ماں کا لباس سب سے زیادہ نفیس ہوتا۔

جب کبھی یہ مگن گروہ گھر کے پھاٹک سے باہر نکلتا، لگتا جیسے گھر زمین میں دھنسا چلا جا رہا ہے۔ ہر چیز بوجھل ہو جاتی، اتنی خاموش کہ دل بیٹھنے لگتا۔ نانی کمروں میں بوڑھے ہنس کی طرح چلتی، صفائی ستھرائی کرتی نظر آتیں۔ نانا تندور کے پاس کھڑے کمر سینکتے اور بڑبڑاتے رہتے:

''خیر — اچھا ٹھیک ہے... چھوڑو اس کو اپنے راستے پر چلنے دو... دیکھیں اس کا کیا انجام ہوتا ہے...،،

کرسمس کے بعد ماں مجھے اور میخائل ماموں کے بیٹے ساشا کو اسکول لے گئیں۔ ساشا کے باپ نے دوسری شادی کرلی تھی اور وہ سوتیلی ماں کی نظروں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا رہتا تھا۔ سوتیلی ماں اس کو اتنا پیٹتی رہتی تھی کہ آخر نانی نے نانا سے اصرار کیا کہ ساشا کو لے آؤ، ہمارے ساتھ رہیگا۔ ہم مہینے بھر اسکول جاتے رہے۔ اس زمانے میں جو کچھ پڑھایا گیا اس میں سے بس ایک ھی بات یاد

ہے۔ اور وہ یہ کہ جب کبھی نام پوچھا جائے تو صرف ''پیشکوف،، کہنا کافی نہیں ہے۔

مجھے کہنا پڑتا تھا ''میرا نام پیشکوف ہے۔،،

میں استاد سے اتنی سی بات بھی نہیں کہہ سکتا تھا:

''بھئی، تم بیکار مجھ پر لال پیلے ہوتے ہو! میں تمہاری دھونس میں نہیں آؤں گا...،،

اسکول سے فوراً ہی جی اوب گیا۔ دوسری طرف میرے سمیرے بھائی کا دل پہلے ہی دن سے اسکول پر لٹو ہو گیا۔ اور اس نے جھٹ پٹ بہتوں سے یاری گانٹھ لی۔ لیکن ایک دن سبق چل رہا تھا کہ اس کی آنکھ لگ گئی اور وہ نیند میں چلا اٹھا:

''نہیں، نہیں..!،،

جب وہ جاگا تو اس نے کلاس سے باہر جانے کی اجازت مانگی۔ اس پر لڑکوں نے جی کھول کے بڑی بے دردی سے چھیڑا اور چڑایا۔ دوسرے دن اسکول جاتے ہوئے جب ہم سیننایا چوک کے پاس گلی کے نکڑ پر پہنچے تو وہ رکا اور بولا:

''تم اکیلے اسکول جاؤ۔ میں آج نہیں جاؤں گا۔ میں تو آج ذرا سیر کرنا چاہتا ہوں۔،،

وہ بیٹھ گیا۔ اس نے کتابیں برف کے نیچے دبائیں اور چل دیا۔ جنوری کی دھوپ میں نہایا ہوا دن تھا۔ پوری دنیا دھوپ میں جگمگا رہی تھی۔ مجھے ساشا پر بڑا رشک آیا مگر دانت پیس کر محض ماں کی خاطر اسکول چلا گیا۔ ساشا نے برف کے نیچے جو کتابیں دبائی تھیں ظاہر ہے کسی نے صاف کر دیں۔ اب اگلے دن اسکول نہ جانے کی واقعی معقول وجہ موجود تھی۔ تیسرے دن نانا کو اس کی آوارگی کا حال معلوم ہو گیا۔

ہم دونوں کٹہرے میں کھڑے کئے گئے۔ باورچی خانے کی میز کی دوسری طرف نانا، نانی اور ماں جرح کے لئے بیٹھے۔ مجھے خوب یاد ہے ساشا نے نانا کی جرح کے جواب میں کتنا مضحکہ خیز جواب دیا تھا۔

''آخر تو اسکول پہنچا کیوں نہیں؟،،

''میں اسکول کا راستہ ہی بھول گیا،، ساشا نے سراسیمہ آنکھوں سے نانا کی آنکھوں میں گھورتے ہوئے جواب دیا۔

''بھول گیا ایں؟،،

''ہاں۔ میں اسکول ڈھونڈتا رہا، اسکول ڈھونڈتا رہا...،،

''تجھے تو الیکسئی کے پیچھے چلنا چاہئے تھا۔ اس کو تو راستہ یاد تھا۔،،

''وہ میری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔،،

''الیکسئی؟،،

''ہاں۔،،

''وہ کیسے؟،،

ساشا نے ایک لمحے کو سوچا اور ٹھنڈی سانس لے کر کہا:

''برف کا طوفان جو آیا تو — کچھ دکھائی نہ دیا۔،،

ہر شخص ہنس پڑا کیوں کہ موسم صاف اور روشن تھا۔ ساشا کے ہونٹوں پر بھی بڑی مدھم سی مسکراہٹ ابھری۔ لیکن نانا نے کھیسیں نکالتے ہوئے طنزاً کہا:

''کیا تو اس کا ھاتھ یا پیٹی پکڑ کر نہیں چل سکتا تھا؟،،

''میں نے کوشش تو کی مگر ہوا اتنے زور کی تھی کہ پیٹی چھوٹ گئی...،،

وہ بہت آہستہ آہستہ انتہائی بےھنگم پن سے بول رہا تھا۔ مجھے اس کا بھونڈا اور بیکار جھوٹ بہت کھلا اور میری سمجھ میں نہ آیا کہ آخر وہ اڑیل گھوڑا کیوں بنا ہوا ہے۔

انہوں نے ہماری مرمت کی اور ایک بوڑھے فائرمین کو، جس کا ایک بازو مڑا ہوا تھا، ہمیں اسکول لے جانے پر مامور کیا۔ اس بڈھے کا فرض یہ تھا کہ ساشا کو علم کے راستے سے بھٹکنے نہ دے۔ مگر بیکار۔ اگلے دن جب ہم گلی کے نکڑ پر پہنچے تو ساشا نے جھٹ دائیں پیر کا جوتا اتار بائیں طرف اور بائیں پیر کا جوتا اتار دائیں طرف پھینکا اور صرف موزے پہنے بیچ چوک میں یہ جا وہ جا۔ بڈھے نے ھانپتے ہوئے جوتوں کا رخ کیا۔ اس نے جوتے اٹھائے اور مارے ھول کے مجھے ھنکا کر گھر لے آیا۔

پورے دن ماں اور نانی مفرور کو شہر کے کونے کونے میں ڈھونڈتی رھیں - آخر وہ شام کو خانقاہ کے پاس چرکوف کے بھٹیار خانے میں ملا جہاں ناچ کر وہ لوگوں کا دل بہلا رہا تھا - وہ اسے پکڑ کر گھر لائیں - سب اس لڑکے کی چٹان جیسی خاموشی سے ایسا جھک ہوئے کہ اسے پیٹا تک نہیں - وہ میرے پاس تندورکے اوپروالے تختے پر لیٹا ہوا ٹانگیں ھوا میں لہرا رہا تھا اور آھستہ آھستہ بول رہا تھا:

''میری سوتیلی ماں مجھے نہیں چاھتی - باپ مجھ سے محبت نہیں کرتا - دادا کے دل میں میری جگہ نہیں - آخر میں ان کے ھاں کیوں پڑا رھوں؟ میں دادی سے پوچھونگا کہ چور اور ڈاکو کہاں رہتے ھیں - میں ان کے پاس بھاگ جاؤں گا - پھر تم سب کا دل کٹیگا! آؤ، ہم دونوں ساتھ رفوچکر ھو جائیں - ایں؟،،

میں اس کے ساتھ نہیں بھاگ سکا - اس وقت میری زندگی کا مقصد کچھ اور تھا — میں افسر بننے کے خواب دیکھ رہا تھا، یہ بڑی پنکھے جیسی سنہری داڑھی‌والا افسر - اس کے لئے پڑھنا ضروری تھا - جب میں نے ساشا کو اپنا منصوبہ سنایا تو اس نے ایک آن کو سوچا اور بولا:

''ھاں یہ بھی ٹھیک ھے - جب تم افسر بن جاؤگے تو میں اس وقت ڈاکوؤں کا سردار ھوں‌گا - تم مجھے پکڑنے کو مارے پھروگے - ہم میں سے کوئی دوسرے کو قتل کر دےگا یا قید کر لیگا - میں تو خیر تمہاری جان ھرگز نہیں لوں‌گا - ،،

''میں بھی نہیں ماروں‌گا!،،

اس پر ھماری بات چیت کی تان ٹوٹ گئی -

نانی اندر آئیں - وہ تندور پر سمٹ کر بیٹھ گئیں اور ہم سے باتیں کرنے لگیں:

''ھائے چوھو؟ ھائے میرے ننھے منے یتیمو، میرے دل کی کوپلیو!،،

ان کا دل ھمارے لئے پگھل رہا تھا - انہوں نے ساشا کی سوتیلی ماں کو، بھٹیار خانے کے مالک کی بیٹی موٹی ممانی نادیژدا کو خوب برا بھلا کہنا شروع کیا - اس کے بعد وہ تمام سوتیلی ماؤں اور سوتیلے باپوں پر لعنت بھیجنے لگیں - پھر انہوں نے ھمیں سادھو ایونا کی

کہانی سنائی جو بچپن ہی میں اپنی سوتیلی ماں کو کھینچ کر خدا کے دربار میں لے گئے تھے۔ ان کا باپ بیلوئے جھیل پر مچھیرا تھا

جس کو ڈاین بیوی کھا گئی۔
اس نے میاں کو شراب پلائی
اور کچھ کھلاکر سلا دیا
پھر اس نے میاں کو سوتے میں اٹھاکر
شاہ بلوط کی ناؤ میں ڈالا
چھوٹی سی ناؤ میں جیسے تابوت۔
خود ہی دیودار کے چپو اٹھائے
ناؤ کھے کر لے گئی بیچ جھیل میں گہرائی میں،
جہاں پانی خواب میں دوڑ رہا تھا دھیرے دھیرے
اور اس رسوائے زمانہ کے گناہ کا انتظار کررہا تھا۔
وہاں وہ کشتی پر ایک طرف جھکی
ناؤ ڈولی، جھکی، الٹی،
اس کا شوہر پانی میں ڈوب گیا جیسے پتھر
اور اس کا کوئی نشان نہ رہا۔
بیوی تیزی سے تیرتی ہوئی جھیل کے کنارے پہنچی
ساحل پر سر پٹک کر روئی پیٹی، چیخی، چنگھاڑی
جھوٹ موٹ میاں کے مرنے پر بین کرنے لگی۔
اس نے اتنی بےدردی سے اس کو موت کے گھاٹ اتارا
اور خود ہی لوگوں کو پکارا،
مچائی واویلا لوگوں کو ترس آیا،
بیوہ کے سوگ پر لوگوں کا دل بھر آیا۔
”ہے ہے ایسی چڑھتی جوانی اور یہ بیوگی
ہائے تیری خوشی غم کی اندھیری رات میں کھو گئی
پر خدا کی مرضی میں چارہ کیا۔
وہی ہمیں مارتا ہے وہی ہمیں جلاتا ہے۔“
اکیلے ایونوشکا کو سوتیلی ماں کے آنسوؤں پر یقین نہ آیا۔
اس نے آہستہ سے ہاتھہ رکھا سوتیلی ماں کے سینے پر

اور لعنت کی
''اے عورت، نرسی کی مورت
تو ھے رات کا پنچھی، فریبی،
میں تیرے آنسوؤں پر یقین نہیں کر سکتا
چاھے تو آنسوؤں کا دریا بہائے
تیرے سینے میں دل خوشی سے دھڑک رہا ھے!
آھم خدا سے فریاد کریں، انصاف کی بھیک مانگیں
پروردگار سے، رحیم و کریم سے!
ھم میں سے ایک چھری اٹھائے اور آسمان پر پھینکے
اگر میں جھوٹا ھوں تو وہ چھری مجھے قتل کرے گی
اگر تو مجرم ھے تو جان سے جائے گی۔ ،،
دھیرے دھیرے ماں اس کی طرف بڑھی
اس کی آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں نکلنے لگیں
کھڑی ھوئی اور انتقام کے جذبے سے بھڑک کر بولی
''تو ھے زمانے کا احمق
وقت سے پہلے ھی تو نے
بھیڑیے کی کوکھہ سے جنم لیا ھے
لعنتی تو یہ کیا بک رہا ھے؟
تو کیسا زھر اگل رہا ھے!،،
جو لوگ کھڑے تھے یہ سن کر چونک گئے
کتنا بھاری تھا یہ الزام
چپ چاپ، دل پر بوجھہ لئے، انہوں نے دیکھا
سب نے آھستہ آھستہ صلاح مشورہ کیا۔
پھر ایک بڈھا مچھیرا آگے بڑھا
اور ایک ایک لفظ تول تول کر بولا:
''بھلے لوگو ذرا وہ خنجر لانا
میں خنجر اٹھاؤں گا اوپر
اسے آسمان پر پھینکونگا،
خنجر گناہ گار کے سینے میں پیوست ھوگا۔ ،،
لوگوں نے لا کر بڈھے کو خنجر دیا

بڈھے نے خنجر کو سر کے اوپر اچھال دیا۔
خنجر پرندے کی طرح دھندلی دھندلی روشنیوں میں غائب ہو گیا۔
وہ دیر تک خنجر کے گرنے کا انتظار کرتے رہے
اور شفاف بلندیوں میں گھورتے رہے۔

انہوں نے ٹوپیاں اتار لیں اور ایک دوسرے سے لپٹ گئے
وہ خاموش کھڑے رہے
رات خاموش تھی
اور خنجر کا کہیں پتہ نہ تھا!
پھر جھیل پر صبح کی لالی پھیلی
سوتیلی ماں کا چہرہ بھی سرخ تھا
اور اس کے گلے میں کانٹے پڑ رہے تھے۔
یکایک خنجر تیر کی طرح جھلملایا
خنجر آسمان سے ٹوٹا اور سوتیلی ماں کے دل میں اتر گیا
خدا کے نیک بندے سجدے میں گر پڑے
اور رب کا شکر ادا کرنے لگے
''اے خدا تو بڑا رحیم و کریم ہے!،،
بوڑھا مچھیرا ایونا کے پاس آیا
اس کو لے کر بن میں چلا گیا
دور، بہت دور، دریائے کیرژنیتس کے کنارے
شاندار شہر کیتژ میں...

اگلے دن جو میری آنکھ کھلی تو میرے پورے جسم پر لال لال دھبے پڑے ہوئے تھے۔ یہ چیچک کے حملے کی شروعات تھی۔ میں پچھلی دوچھتی میں لٹا دیا گیا۔ وہاں میں بہت دنوں تک بالکل اندھا پڑا رہا۔ میرے بازو اور ٹانگیں چوڑی پٹیوں سے بندھی ہوئی تھیں۔ میں رات دن انگاروں پر لوٹا کرتا۔ بڑے بھیانک خواب دیکھا کرتا۔ ایک بار تو میں مرتے مرتے بچا۔ نانی کے سوا اور کوئی میرے پاس نہ آتا۔ وہ مجھے دودھ پیتے بچے کی طرح چمچے سے کھلاتیں پلاتیں، بڑے اچھے اچھے قصے کہانیاں سنایا کرتیں۔ آخر میری صحت سنبھلنے لگی۔ میرے بازو اور ٹانگیں کھول دی گئیں۔

ہاں البتہ اب تک میں دستانے پہنے ہوئے تھا تاکہ میں اپنے چہرے کے دانے نہ نوچ لوں۔ ایک دن کچھ ایسا ہوا کہ نانی مقررہ وقت پر نہیں آئیں۔ نہ جانے کیوں میرے پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی۔ یکایک تصور ہی تصور میں میں نے دیکھا کہ نانی دوچھتی کی گردآلود لینڈنگ پر اوندھے منہ پڑی ہیں اور ان کے ہاتھ پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کی گردن دو ٹکڑے ہو گئی تھی، بالکل چچا پیوتر کی طرح۔ کونے کے گردآلود سائیوں سے ایک بڑی سی بلی اچھلی اور نانی پر کود پڑی۔ اف اس کی ہری آنکھیں کس طرح گول گول چمک رہی تھیں۔

میں بستر سے اچھل کر کودا اور لاتوں اور شانوں سے دھکے دے دے کر دوہری کھڑکی توڑ ڈالی۔ میں کھڑکی سے چھلانگ لگا کر برف کے گڑھے میں گر پڑا۔ اس شام میری ماں کے ہاں محفل گرم تھی اس لئے کسی نے کھڑکی کے ٹوٹنے کی آواز نہیں سنی۔ کچھ دیر میں یونہی برف میں پڑا رہا اور کسی کو پتہ نہ چلا۔ ہڈیاں نہیں ٹوٹیں۔ ہاں شانے کی ہڈی اکھڑ گئی تھی اور شیشے سے جہاں تہاں جسم کٹ گیا تھا۔ لیکن پالے نے ایسا ڈسا کہ میں اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہو سکا۔ کوئی تین مہینے میں اپنے کمرے میں پڑا گھر میں بڑھتی ہوئی ہماھمی کی دھمک سنتا رہا۔ دروازے کھلتے اور بند ہوتے رہتے اور آنے جانے والوں کا تانتا سا بندھا رہتا۔

برفانی طوفان چھتوں پر ناچتا اور شور مچاتا۔ دوچھتی کے دروازے کے باہر ہوا شائیں شائیں کرتی رہتی، چمنیوں میں گھس کر ماتم کرتی اور کھڑکیوں کو جھنجھناتی۔ دن کے وقت کوؤں کی کائیں کائیں سنائی دیتی۔ جب راتیں خاموش ہوتیں تو کہیں دور سے بھیڑیوں کے غرانے اور چیخنے کی بھیانک آوازیں آتیں۔ اس موسیقی کی دھن پر میری روح ناچتی رہی، پروان چڑھتی رہی۔ پھر بہار آئی، لجاتی، بل کھاتی دبے پاؤں آئی اور چمکتی ہوئی آنکھوں سے میرے کمرے میں جھانکنے لگی۔ جنگلوں پر بلیاں غرانے اور میاؤں میاؤں کرنے لگیں۔ بہار کی ہلکی ہلکی سرگوشیاں دیواروں کے اندر سرسراتی ہوئی اندر آتیں۔ برف کے تودوں کے پگھلنے کی سرسراہٹ اور چھتوں سے برف کے گرنے کی آواز سنائی دیتی، گرجے کی گھنٹیاں بجتیں۔ ان کی گونج میں زیادہ جان پیدا ہو گئی تھی۔ یہ بات جاڑے کی گونج میں کہاں تھی۔

نانی مجھے دیکھنے آئیں۔ ادھر کچھ دنوں سے ان کی باتوں سے وادکا کی خوشبو آنے لگی تھی۔ اور یہ بو بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ اب وہ اپنے ساتھ بڑا سا سفید چائے دان بھی لاتیں اور میرے بستر کے نیچے چھپا دیتیں اور آنکھ مار کر دھمکاتیں:

''میرے لعل — دیکھنا، اپنے نانا کی دم سے کہتے مت پھرنا!''

''تم پیتی کیوں ہو؟''

''ھش! جب تو بڑا ہوگا تجھے آپ ہی معلوم ہو جائے گا!''

پھر وہ چائے دان سے ایک گھونٹ پیتیں، آستین سے منہ پونچھتیں اور ہونٹوں پر روحانی سرشاری سے بھیگی ہوئی مسکراہٹ بکھیر کر میری طرف مڑتیں:

''اچھا تو جناب عالی، میں کل کیا کہہ رہی تھی آپ سے؟''

''ابا کے بارے میں۔''

''کہاں چھوٹی تھی ڈور؟''

میں بتاتا کہانی کہاں تک پہنچی تھی۔ وہ بڑی خوش‌آھنگ روانی سے گھنٹوں کہانی سناتی رہتیں۔

ایک دن جب وہ نشے میں نہ تھیں، جب وہ تھکی تھکی اور اداس تھیں، خود ہی ابا کا قصہ چھیڑ بیٹھیں:

''رات میں نے تیرے باپ کو خواب میں دیکھا — ہاتھ میں ڈنڈا لئے وہ کھیتوں میں چل رہا تھا اور سیٹی بجا رہا تھا اور ایک کتا، ہاں چتکبرا کتا، اس کے پیچھے پیچھے زبان نکالے بھاگ رہا تھا۔ نہ‌جانے کیوں تیرا باپ اب آئے دن خواب میں آتا ہے — لگتا ہے اس کی روح بیقرار بھٹک رہی ہے...''

کئی دن تک لگاتار وہ مجھے ابا کا قصہ سناتی رہیں۔ یہ قصہ بھی ان کی تمام کہانیوں کی طرح دل‌چسپ تھا۔ میرے باپ سپاہی کے بیٹے تھے۔ دادا کو ترقی دے کر افسر بنا دیا گیا اور پھر جلا وطنی کے دن کاٹنے کو سائبیریا بھیج دیا گیا کیوں کہ وہ اپنے ماتحتوں پر بڑا ظلم توڑا کرتے تھے۔ وھیں کہیں سائبیریا میں میرے ابا پیدا ہوئے۔ ان کی زندگی بڑی کٹھن تھی۔ ابھی وہ چھوٹے ہی تھے کہ گھر سے بھاگنے کی مہم شروع کر دی۔ ایک دن دادا نے کتا لیا اور بیٹے کی تلاش میں جنگل گئے گویا بیٹا نہ ہوا گلہری ہوئی۔ ایک بار اور

جو بیٹے صاحب پکڑے گئے تو پھر وہ دھواں دھار پٹائی ہوئی کہ اڑوس پڑوس کے لوگوں نے بیچ بچاؤ کیا ورنہ...

''کیا لوگ ہمیشہ بچوں کو پیٹا کرتے ہیں؟،، میں نے پوچھا۔ نانی نے بڑے اطمینان سے جواب دیا:

''ہمیشہ۔،،

ابا کے سر سے ماں کا سایہ بڑی کم سنی میں اٹھ گیا۔ اور ابھی وہ نو ہی برس کے تھے کہ باپ بھی چل بسے۔ دینی باپ نے ان کو گود لے لیا اور انہوں نے لے پالک بیٹے کو شہر پیرم میں ایک بڑھئی کی گلڈ میں شامل کر دیا۔ شروع میں تو ہنر سکھایا لیکن ابا بھاگ کھڑے ہوئے اور بازار اور میلے میں اندھوں کی لاٹھی کا کام کیا۔ جب وہ سولہ برس کے ہوئے تو نیژنی نووگورود آ گئے اور کولچین کے جہاز پر بڑھئی کا کام کرنے لگے۔ بیس برس کی عمر میں ہی وہ فرنیچر بنانے میں ماہر ہو گئے۔ جس کارخانے میں وہ کام کرتے تھے میرے نانا کے مکان کے پڑوس ہی میں تھا — کوّوالیخا سڑک پر...

''تم جانو چہاردیواری ٹھہری نیچی اور ٹانگیں لمبی...،، نانی ہنسیں۔ ''ایک دن میں اور واریا باغ میں بیٹھے رس‌بھریاں چن رہے تھے۔ یکایک جو میری نظر اٹھی تو بس مت پوچھ، تیرا باپ چہار دیواری سے چھلانگ لگاکر کود پڑا۔ مارے ڈر کے ہماری تو گھگھی بندھ گئی۔ وہ سیب کے درختوں کے درمیان چلتا ہوا ہماری طرف آیا۔ کیا سرد تھا وہ؟ دیو تھا دیو، سفید قمیص اور ساٹن کی پتلون چڑھائے، ننگے پاؤں ننگے سر۔ اس کے لمبے لمبے بالوں کو ایک فیتہ دبائے ہوئے تھا۔ جانتے ہو کیوں آیا تھا وہ؟ تیری ماں سے شادی کی التجا کرنے! میں نے چند بار پہلے بھی اسے کھڑکی کے پاس سے گزرتے دیکھا تھا۔ جب کبھی میں اسے دیکھتی تو دل ہی دل میں کہتی ''خوب لڑکا ہے!،، تو جب وہ میرے پاس آیا تو میں بولی ''اچھا میرے بیٹے، بتاؤ تم راستہ کیسے بھول گئے؟،، وہ گھٹنوں کے بل جھک گیا۔ ''میں ہوں تمہارا غلام، خادم۔ اپنی جان تمہارے قدموں پر ڈالنے آیا ہوں! اور یہ رہی واریا — یسوع مسیح کے لئے ہمیں بیاہ کرنے دیجئے۔ ہمیں دعا دیجئے!،، اب میں کیا بتاؤں، میں تو بالکل ہکابکا رہ گئی۔ کسی طرح کچھ کہا نہ جائے! منہ پر مہر لگ گئی۔

میں نگاہ جو اٹھاؤں تو کیا دیکھتی ہوں تیری ماں، چڑیل، مزے میں سیب کے درخت کے پیچھے چھپی کھڑی، رس بھری کی طرح لال، لونڈے کو اشارے کر رہی ہے اور آنکھیں ہیں کہ ڈبڈبائی ہوئی ہیں - میں بولی ''ارے زمانے بھر کی بھولی! کہیں کوئی ایسا کرتا ہے؟ اس سے تو بہتر زمین پھٹے اور تو اس میں سما جائے! کیا تیرا دماغ بالکل چل گیا ہے وروارا؟ اور تو، اے نوجوان سوچ ذرا تو کیا کر رہا ہے! چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانا چاہئے - ،، ان دنوں تیرے نانا مال دار آدمی تھے — ان کی جائداد کا حصہ بخرہ نہیں ہوا تھا - چار چار مکان تھے، روپے کی بھر مار تھی - لوگوں میں ساکھ تھی - کچھ ہی دنوں پہلے نو برس تک کارخانے کے مکھیا رہنے کے سلسلے میں ان کو ایک وردی اور ہیٹ ملی تھی... ان دنوں تیرا نانا بڑا مغرور تھا! جو میں کہہ سکتی تھی سو میں نے کہہ دیا - مگر میرا دل لرز رہا تھا ڈر سے، مارے ترس کے دل پھٹا جا رہا تھا — ہائے دونوں پر کیسی بجلی گر پڑی تھی - تیرا باپ اٹھا اور بولا ''جانتا ہوں واسیلی واسیلیوچ اپنی مرضی سے واریا کو میرے پاس نہ آنے دیں گے - اچھا تو اب میں واریا کو اڑالے جاؤں گا - اور اسی کے لئے تمہاری مدد مانگ رہے ہیں ہم!،، ذرا سوچو، میری مدد! میں نے لاکھ بھگایا اسے مگر کیا مجال جو وہ ٹس سے مس ہوا ہو - بولا ''جی چاہے مجھ پر پتھر برساؤ، مگر میری مدد ضرور کرو! میں ہمت نہیں ہاروں گا!،، اب وروارا اس کے پاس آئی اور لڑکے کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولی ''ہم بہت دنوں سے میاں بیوی ہیں — مئی سے ہی! اب ہمیں بس شادی کی ضرورت ہے!،، میں چکرا گئی - لگا جیسے انہوں نے مجھے دھکا دے دیا ہو! ہائے میں مری!،،

نانی زور سے ہنسیں اور ان کا پورا جسم کانپ گیا - انہوں نے چٹکی بھر نسوار لی، آنکھوں سے آنسو پونچھے اور ٹھنڈی سانس لے کر بولتی رہیں:

''ابھی تو بچہ ہے — تو کیا جانے میاں بیوی بن جانے میں اور شادی میں کیا فرق ہے - مگر شادی کے بغیر جب بچہ ہو جائے تو یہ بڑی بھیانک بات ہوتی ہے - دیکھ یاد رکھیو — بڑا ہو کر خبردار جو کسی کنواری لڑکی کو ایسی مصیبت میں پھنسایا تو

نے — بڑا گناہ ہوگا، کنواری یوں کرسوں جلے اور پھر بچے کا کوئی پرسان حال نہیں - دیکھو بھولنا مت! عورت پر ترس کھانا چاهئے اور جان و دل سے اس سے محبت کرنی چاهئے - یونہی مزے اڑا کر الگ ہو جانا بڑا گناہ ھے! گرہ سے باندھ رکھه - میں تجھے عقل کی بات بتا رہی ہوں!،،

وہ تھوڑی دیر کو رکیں اور اپنے خیال میں کھو گئیں - پھر سنبھلتے ہوئے کہانی کے تانے بانے بننے لگیں -

''ھاں تو اب کیا ہو؟ میں نے میکسم کے سر پر ایک مکا جمایا اور وروارا کی چٹیا پکڑ کر کھینچی - تب لونڈے نے دل کو لگتی ایک بات کہی ''مار پیٹ سے تو ہونی انہونی ہونے سے رہی -،، جھٹ لڑکی بولی ''نجات کا راستہ سوچو، پیٹنے سے کیا ہوگا؟،، میں نے کہا ''روپیہ پیسہ ھے تیرے پاس؟،، لڑکا بولا ''کچھه روپیہ تو تھا مگر میں نے اس سے واریا کے لئے انگوٹھی خرید لی!،، ''تو کیا تین ھی روبل تھے؟،، اس نے کہا ''نہیں کوئی سو روبل!،، ان دنوں چیزیں سستی تھیں اور پیسے کا بڑا مان تھا - میں نے تیرے ماں باپ کو دیکھا — بالکل بھولے بچے! ننھے منے احمق! ''میں نے انگوٹھی فرش کے تختے کے نیچے چھپا دی ھے تاکہ تم لوگوں کی نظر نہ پڑے اس پر!،، تیری ماں نے کہا - ''ہم اسے بیچ سکتے ھیں!،، تھے نا بالکل بچے؟ خیر، ہم نے ایک ھفتے میں شادی رچانے کا فیصلہ کر لیا - مجھے خود ھی پادری سے مل کر سب کچھه طے کرنا تھا - لیکن ھائے میں کتنا روئی تھی پھوٹ پھوٹ کر - ھائے میرا کلیجہ تیرے نانا کے ڈر سے منہ کو آ رہا تھا، تھر تھر کانپ رہی تھی میں! اور واریا کا بھی وھی حال تھا - سر سے پیر تک لرزتی رہتی تھی! خیر، ہم نے سب کچھه ٹھیک ٹھاک کر لیا -

''تیرے باپ کا ایک دشمن تھا — ایک کاریگر — بڑا دل جلا تھا موںڈی کاٹا! ایک زمانے سے وہ دونوں پر چپکے چپکے نظر رکھتا تھا - سب کچھه تاڑ گیا - خیر، میں نے اپنی بیٹی کو جو کچھه میرے پاس تھا اس میں سے بہترین کپڑے پہنائے اور اسے لے کے پھاٹک سے نکلی - نکڑ پر ایک ترویکا گاڑی انتظار کر رہی تھی - لڑکی گاڑی میں سوار ہوئی - میکسم نے سیٹی بجائی اور گاڑی یہ جا وہ جا - میں

گھر لوٹی تو آنکھوں سے آنسو رواں تھے - ذرا سوچو، کس سے مڈبھیڑ ہوئی — اسی کمینے بدمعاش سے! بولا ''میں دل کا اچھا ہوں - میں ان کی خوشی کا آشیانہ اجاڑنا نہیں چاھتا - بس میں اتنا چاھتا ہوں، اکولینا ایوانوونا کہ میرے ھاتھہ پر پچاس روبل رکھہ دو اور بس!'' میرا ھاتھہ خالی تھا - حساب کتاب سے مجھے جنم کی چڑ تھی - میں نے ایک پھوٹی کوڑی بچائی بھی نہیں تھی - میں تھی نری احمق - بولی ''میرے پاس پیسہ نہیں - دوں کہاں سے!'' وہ بولا ''اچھا تو وعدہ کرو!'' ''وعدہ؟ لیکن میں وعدہ پورا کرنے کو پیسہ کہاں سے لاؤں گی؟'' ''کیا مال دار میاں کے پیسے چرانا اتنا مشکل کام ہے؟'' وہ بولا - میں ایسی کم‌بخت کہ اس سے کھڑی باتیں کرتی رھی - چاھئے تو تھا کہ میں اسے باتوں میں پھنسائے رھوں - مگر میں نے اس کے منہ پر تھوک دیا اور آگے بڑھہ گئی - وہ دوڑ کر مجھہ سے پہلے صحن میں پہنچ گیا — مت پوچھو کیسا ھنگامہ کھڑا کیا ہے اس نے!''

نانی نے آنکھیں بند کر لیں اور ایک مدھم سی مسکراھٹ ان کے چہرے پر تیر گئی -

''اف نہ پوچھو پھر کیسا ھنگامہ ھوا ھے! آج بھی وہ سب کچھہ یاد آجاتا ھے تو رونگٹے کھڑے ھو جاتے ھیں - تیرا نانا درندوں کی طرح چنگھاڑ رھا تھا - اس کے دل کو بڑا زبردست دھکا لگا تھا! اس کی شان کچھہ اور تھی - وہ وروارا کی طرف دیکھتا اور شیخی بگھارتا — ''میں تو اپنی بٹیا کی شادی کسی رئیس زادے، نواب‌زادے سے کروں گا'' - اور لو اب یہ رھا اپنا رئیس — نواب! لیکن ھم کمزور بندے بھلا کیا جانیں جوڑا کیسے بنایا جاتا ھے — پاک مریم کی جیسی مرضی! تیرا نانا احاطے میں بگولے کی طرح ناچ رھا تھا — بالکل بھڑکتا ھوا شعلہ! یاکوف اور میخائل کو بلایا، کوچوان کلیم کو پکارا اور اس چتکبری صورت والے کاریگر کو - میں نے دیکھا... تو وہ باٹ اٹھا کر نچا رھا ھے - میخائل نے بندوق اٹھائی - ھمارے گھوڑے بجلی تھے، ھوا سے باتیں کرتے تھے، اور بگھی بڑی ھلکی پھلکی تھی - ''دیکھہ لینا وہ ان کو جا لینگے!'' میں نے سوچا - لیکن وروارا کے فرشتے نے مجھے ایک تدبیر سجھائی - میں نے ایک چھری لی

اور بم کا فیتہ کاٹ دیا، سوچا ''راستے میں گھوڑے کا ساز ٹوٹ جائے گا!،، اور یہی ہوا۔ بم کھسک گیا اور نانا، میخائل اور کلیم مرتے مرتے بچے۔ لیکن اس طرح دیر تو ہوگئی۔ اب جو وہ گرجا گھر پہنچے تو واریا اور میکسم منبر کے سامنے کھڑے تھے، ان کی شادی ہو چکی تھی ــ شکر اللہ کا!

''خیر، یہ لوگ ٹوٹ ہی تو پڑے میکسم پر۔ لیکن میکسم تھا آدمی تگڑا جوان ــ دوچار ہی ایسے بلوان ہوتے ہیں۔ اس نے میخائل کو منبر سے اٹھاکر پھینکا تو غریب بازو سے گیا۔ کلیم کو دوسرا گھونسہ جڑا تو وہ ڈھیر۔ اب تیرے نانا، یاکوف ــ سبھی میکسم کے پاس پھٹکنے کی ہمت ہار بیٹھے۔

''مگر غصے میں تیرا باپ آپے سے باہر نہ ہوا۔ بولا ''پھینکو ہاتھ سے وہ باٹ... میں صلح صفائی کا آدمی ہوں۔ میں نے تمہارا کیا لیا ہے؟ مجھے جو کچھ دیا ہے خدا نے دیا ہے۔ کسی کو کوئی حق نہیں خدا کا دیا مجھ سے چھین لے۔ بس اس سے زیادہ میں کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ ،، تینوں آدمی پیچھے ہٹ گئے۔ نانا بگھی میں بیٹھا اور بولا ''اچھا خدا حافظ وروارا! تو اب میری بیٹی نہیں رہی۔ میں اب تیری صورت دیکھنا نہیں چاہتا! میرے لئے تو زندہ ہو یا مردہ ایک ہی بات ہے!،، تیرا نانا گھر آیا۔ اس نے مجھے خوب پیٹا۔ میں پٹتی رہی اور کچھ نہ بولی، کراہتی رہی۔ میں جانتی تھی یہ سب گزر جائے گا اور ہونی ہو کر رہیگی۔ ''سنو اکولینا، یہ مت بھولو تمہاری بیٹی جنم جنم کو گئی۔ اب تمہاری کوئی بیٹی نہیں ــ نہ اس گھر میں نہ اور کہیں۔ سمجھیں؟،، میں سوچتی رہی دل ہی دل میں ''سڑی تو بکا کر جھوٹ! تیرا کیا ہے گھڑی میں تولہ، گھڑی میں ماشہ۔ یہ غصہ زیادہ دن تھوڑے ہی باقی رہیگا!،،

میں دم بخود یہ کہانی سنتا رہا۔ میں ان کی کہانی کی بعض باتوں پر حیران رہ گیا ــ نانا نے تو ماں کی شادی کا نقشہ کچھ اور ہی کھینچا تھا۔ اصل میں وہ شادی کے خلاف تھے اور شادی کے بعد ماں کو گھر میں قدم رکھنے کی اجازت نہ دی تھی۔ اور نانا کا کہنا تھا کہ شادی خفیہ نہیں ہوئی تھی اور وہ خود شادی میں موجود تھے۔ میں نے نانی سے نہیں پوچھا کہ ان دونوں میں سے کون سی

کہانی سچ ہے - میں جھجک رہا تھا کیونکہ میرے دل کو نانی والی کہانی زیادہ بھائی — اتنی رومانی جو تھی! وہ باتیں کرتی جاتیں اور ھلتی رھتیں - جب وہ غم انگیز یا خوفناک موڑ پر پہنچتیں تو اور زیادہ ھلنے لگتیں - اکثر ان کی آنکھیں بند ہو جاتیں، ان کی گھنی بھوئیں تھرتھرانے لگتیں اور ایک گرم مسکراھٹ ان کے رخساروں کی جھریوں میں کھیلنے اور تھر کنے لگتی - وہ جس طرح ھر بات کو آئی گئی بنا لیتیں، ٹال جاتیں اس کا میرے دل پر بڑا اثر ھوتا تھا - لیکن بعض وقت ان کے احتجاج کی کڑوی اور جلتی ہوئی باتیں سننے کو بھی میرا دل تڑپ اٹھتا -

''خیر شروع کے دو ھفتے تو پته ھی نه چلا که واریا اور میکسم، دونوں ھیں کہاں - لیکن انھوں نے ایک چھوٹے سے لڑکے کو پیغام لے کر بھیجا - اگلے ھی سنیچر کو میں نے عبادت کے لئے گرجا جانے کا بہانه کیا اور ان سے ملنے چل دی - سویتینسکی سڑک پر ایک مکان تھا جس کے بازو میں دونوں کا بسیرا تھا - اس مکان کے صحن میں بھانت بھانت کے کاریگر رھتے تھے — اف کتنا گنده تھا صحن - لیکن دونوں کو اس گندگی کی ذرا پروا نه تھی - دونوں مزے میں خوشی سے پھولی ہوئی بلیوں کی طرح کھیلتے اور قلابازیاں کھاتے رھتے - میں دونوں کے لئے کچھه تحفه لے گئی تھی — یہی چائے، شکر، دال، جیم، آٹا، سوکھی ہوئی جنگلی چھتریاں اور کچھه پیسے — اب یاد نہیں رھا پیسے کتنے تھے — بس سمجھو جتنا کچھه میں تیرے نانا کی آنکھه بچا کر اپنی گره میں سمیٹ سکی، سب لے گئی - ایسی چوری تھوڑی ھے جو آدمی اپنے لئے نه کرے! پر تیرے باپ نے یه سب لینے سے انکار کر دیا - اس کے دل کو دھکا لگا - بولا ''ھم بھکاری ھیں کیا؟،، لو واریا بھی سر میں سر ملانے لگی ''ھوں، ماں یه سب لانے کی کیا پڑی تھی تمھیں، ایں؟،، لیکن جو کچھه لائی تھی میں نے ان کے آگے ڈال دیا - ''بھولا کہیں کا، پروردگار نے مجھے تیری ماں بنایا!،، میں نے لڑکے سے کہا اور لڑکی سے بولی ''اور بیوقوف تیری رگوں میں تو میرا خون دوڑ رھا ھے! کون سی کتاب میں آیا ھے تو ماں سے نک‌چڑھاپن برتے - بتا؟ یہاں زمین پر اپنی ماں کی ھتک، آسمان پر خدا کی ماں کی ھتک ھے!،، لو اب میکسم نے مجھے بازوؤں میں سمیٹ کر اٹھا لیا

اور پورے کمرے میں ناچتا رہا، مجھے بالکل یوں اٹھا لیا — تھا بھی پورا ریچھ! واریا مزے میں پورے کمرے میں مٹکتی رہی۔ جانو بالکل اپنے میاں کا مور! پھر جو اس نے ٹھاٹ سے اپنے ''گھربار،، کا قصہ چھیڑا ہے تو مت پوچھو — گویا بڑی منجھی ہوئی گرہستن بول رہی ہو۔ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے! اور وہ سموسے جو وہ چائے کے ساتھ لائی؟ نگوڑا بھیڑیا کھائے تو دانتوں سے جائے! اور پنیر؟ ہی ہی — بالکل مالغوبہ!

''ہاں تو اسی طرح زندگی کی ناؤ چلتی رہی۔ بہت دنوں تک یہی قصہ رہا۔ اب تیرے دنیا میں آنے کا وقت آیا اور تیرا نانا ہے کہ منہ پر گوند چپکائے بیٹھا ہے — اپنی سی کرنے والا، ضدی۔ میں چھپ چھپ کر نئے جوڑے کے پاس جاتی۔ وہ سب جانتا تھا۔ پر ایسا بنتا تھا جیسے کچھ جانتا نہ ہو۔ گھر پر کسی کی مجال نہ تھی کہ ورواراا کا نام زبان پر لاتا۔ میں بھی چپ رہتی۔ لیکن میں جانتی تھی، باپ کا دل آخر باپ کا دل ہے۔ کب تک پتھر رہےگا! اور لو وہ وقت آ ہی گیا — اف کیسی رات تھی۔ برف کا طوفان چنگھاڑ رہا ہے، ہوا ہے کہ بھیڑیوں کی طرح کھڑکی کو نوچ رہی ہے۔ چمنی چیخ رہی ہے۔ لگتا تھا دوزخ کے سارے شیطان بے لگام اودھم مچا رہے ہیں۔ تیرا نانا اور میں پاس پاس لیٹے تھے۔ آنکھوں کی نیند اڑ گئی تھی۔ میں اٹھ بیٹھی اور بولی ''ہائے کیسی رات ہے قیامت! فکر اور تردد سے پسنے والوں کے لئے تو یہ رات اور بھی کالی بلا ہے!،، یکایک تیرا نانا بولا ''کیا حال ہے ان کا؟،، میں نے کہا ''ٹھیک ہی ہے! برا نہیں ہے۔،، ''کن کا حال پوچھ رہا ہوں میں ایں؟،، اس نے پوچھا۔ ''اپنی بیٹی ورواراا اور داماد میکسم کا اور کس کا؟،، ''تمہیں یہ کیسے معلوم ہو گیا میں ان کے بارے میں پوچھ رہا ہوں؟،، ''ورواراا کے ابا، بہت ہو لیا تماشا!،، میں بولی۔ ''بس یہ کھیل ختم کرو — اس کھیل سے کس کے دل کی کلی کھل رہی ہے بھلا؟،، تیرے نانا نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''ارے شیطانو، شیطانو! آفت کے پر کالے!،، وہ بولا۔ ''مگر اس گدھے کا کیا ہوگا؟،، یعنی تیرے باپ کا۔ ''کیا وہ واقعی اتنا بڑا احمق ہے؟،، میں بولی ''بیوقوف تو وہ ہے جو نہ کام کرے، نہ کاج کرے اور دوسروں کی روٹی توڑا کرے۔ ذرا ایک نظر اپنے

یاکوف اور میخائل پر ڈالو— کیوں کیا وہ احمق بہتر ہیں؟ ہمارے گھر میں کون کام کرتا ہے اور کمائی گھر لاتا ہے؟ تم۔ اور وہ تو ہاتھ بٹاتے ہیں نا تمہارا؟،، بس اب کیا تھا۔ لے دے شروع ہو گئی۔ اب جو مجھ پر نزلہ گرا تو مت پوچھو۔ کیا کیا کہہ ڈالا — بیوقوف، کتیا، ٹری، پگلی اور خدا جانے کیا کیا! پر میں کچھ نہ بولی! ''میری سمجھ میں نہیں آیا تم کیسے آ گئیں ایسے آدمی کے بھرے میں جس کے اور کا پتہ نہ چھور کا!،، تیرا نانا بولا۔ میں اب بھی چپ۔ بھڑاس نکال لینے دو۔ جب دل کا غبار نکل گیا تو میں بولی ''جاؤ خود ہی جا کر دیکھ لو کیسی زندگی کٹ رہی ہے ان کی۔ واہ، بالکل دودھ شہد بنے ہوئے ہیں دونوں۔ ،، تیرے نانا نے کہا ''لیکن مجھے کیا پڑی ہے انہیں عزت بخشنے کی؟ آنا ہو تو وہی آئیں یہاں۔ ،، بس مت پوچھو۔ تیرے نانا کے منہ سے اس بات کا نکلنا تھا کہ خوشی سے میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ میں خوشی سے رونے لگی۔ تیرے نانا نے میری چوٹیاں کھولنی شروع کیں — تیرا نانا میرے بالوں پر جان دیتا تھا۔ میرے بالوں سے کھیلنے کو اس کا دل مچل اٹھتا تھا۔ ''ارے پگلی عورت، رونا مچلنا بند کرو! سمجھتی ہو میرے سینے میں دل نہیں؟،، تیرا نانا تھا آدمی زوردار، بڑا بھلا مانس۔ پھر کچھ ایسا بھوت سوار ہوا اس پر کہ سمجھنے لگا مجھ سے بڑا گرو گھنٹال اور کوئی ہے ہی نہیں — تب سے تیرا نانا گھٹیا ہو گیا، سٹھیا گیا۔

''ہاں ایک دن — اتوار کو — دونوں ہم سے ملنے آئے۔ دونوں دمک رہے تھے، صاف ستھرے اور خوبصورت! میکسم تیرے نانا کے پہلو میں کھڑا ہو گیا — ذرا سوچو، تیرا نانا مشکل سے اس کے کندھوں تک آتا تھا۔ ''واسیلی واسیلیوچ، یہ نہ سوچئے گا کہ میں جہیز لینے آیا ہوں۔ نہیں، ہر گز نہیں۔ میں تو صرف اپنی بیوی کے باپ کی خدمت میں سلام عرض کرنے آیا ہوں۔ ،، بس اس بات سے تیرے نانا کا دل خوش ہو گیا۔ تیرا نانا ہنس پڑا اور بولا ''اخاہ! تو اس ڈھب کے شیطان ہیں آپ! اچھا اچھا، بہت حماقت ہو چکی! اب سیدھے سیدھے یہاں آ جاؤ گھر میں رہنے سہنے لگو!،، میکسم کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ ''اس کا فیصلہ واریا کے ہاتھ میں ہے — اس کا جو جی

چاھے کرے - میں اس کے ساتھ ھوں!،، پھر بحثا بحثی شروع ھو گئی — اور کسی طرح ان کی ٹیں ٹیں ختم ھی نہ ھو - میں ھوں کہ بار بار تیرے باپ کو آنکھ مار رھی ھوں اور میز کے نیچے نیچے اس کے پیر کو ٹھوکے لگا رھی ھوں - لیکن تیرا باپ بھی خوب تھا — اپنی سی کر کے رھیگا - اف کیسی آنکھیں تھیں تیرے باپ کی — صاف شفاف، روشن روشن اور ان پر کالی کالی بھوؤں کا سایہ - کبھی کبھی اس کی بھوئیں آنکھوں پر جھک جاتیں، چہرہ پتھر ھو جاتا، پھر وہ کسی کا چھو منتر نہیں سن سکتا تھا - میں اس کو اپنے بیٹوں سے زیادہ چاھتی تھی اور وہ یہ جانتا تھا - وہ بھی مجھ سے بڑی محبت کرتا تھا - وہ مجھے اپنے بازوؤں میں اٹھا لیتا اور کمرے کے چکر کاٹتا اور کہتا ''تم ھی ھو میری سچی ماں، اپنی ماں، جیسے دھرتی ماں! میں وروارا سے زیادہ تم پر جان دیتا ھوں!،، تیری ماں ان دنوں بالکل چڑیل تھی چڑیل — سیدھے میاں پر پل پڑتی ''مونڈی کاٹے، کتے کے پلے، ایسی بات زبان پر لاتے تیری زبان جلتی کیوں نہیں؟،، پھر ھم تینوں ایک دوسرے کو رگیدتے - واہ کتنا مزا آتا تھا اس زمانے میں! میرے کبوتر خوب دن تھے وہ! تیرا باپ کیا ناچتا تھا، یکتا تھا یکتا، اور کیسے کیسے خوبصورت گیت یاد تھے اسے — اس نے یہ گیت اندھے بھکاریوں سے سیکھے تھے - اور تو جانے، اندھے جیسا کوئی نہیں گا سکتا!

''اچھا، تو دونوں باغ کے سامنےوالے بازو میں آن بسے - تو وھیں پیدا ھوا تھا - بھری دوپہریا تھی - تیرا باپ کھانا کھانے گھر آیا اور لو سامنے تو پڑا کہہ رھا ھے — آئے آئے تشریف لائے - تیرا باپ خوشی سے پھولا نہ سمایا اور اب جو اس نے تیری ماں کو کلیجے سے لگاکر بھینچا ھے تو مت پوچھ — گویا بچہ پانا دنیا کا سب سے کٹھن کام ھو - اس نے مجھے اٹھا کر کندھے پر رکھ لیا اور اسی طرح باھر صحن میں نکل گیا اور تیرے نانا کو خوش خبری سنائی — جناب نواسے صاحب تشریف لے آئے - نانا تک کو ھنسی آ گئی ''میکسم تو بڑا شیطان ھے!،،

''لیکن تیرے ماموؤں کو تیرا باپ ایک آنکھ نہ بھاتا تھا — وہ پیتا پلاتا نہ تھا، زبان کا تیز تھا، دماغ میں غضب کی اپچ تھی،

نت نئی الا بلا باتیں سوچتا رہتا تھا۔ ہاں وہ ان ہی باتوں کے ہاتھوں مارا گیا۔

''ایک بار بڑے روزے کا زمانہ تھا۔ زوروں کی ہوا چل رہی تھی۔ یکایک گھر میں سیٹیوں، چیخوں اور بھونکوں کا ایسا طوفان اٹھا کہ سب کے چھکے چھوٹ گئے۔ تیرے نانا نے دوڑ کر ولیوں کے چراغ جلائے اور اللہ پیر کرنے لگا۔ پھر یکایک ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ اس سناٹے سے اور بھی کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ تیرا ماموں یاکوف تاڑ گیا ''یہ سب میکسم کی کارستانی ہوگی!،، بعد میں میکسم نے خود ہی بتایا کہ اس نے کس طرح دوچھتی کی کھڑکی پر بوتلیں رکھیں تاکہ ہوا چیختی اور غراتی ہوئی اندر داخل ہو۔ ''میکسم ذرا سنبھل کے!،، تیرے نانا نے دھمکایا۔ ''دیکھہ لینا کہیں یہ ہتھکنڈے تجھے سائبیریا کی ہوا نہ کھلا دیں!،،

''ایک بار ایسا جاڑا پالا پڑا کہ میدانوں سے بھیڑیے تک نکل آئے۔ ایک دن ایک کتا غائب، تو دوسرے دن کوئی گھوڑا ہنہنا رہا ہے، تیسرے دن سنتری کا قیمہ بنا رکھا ہے۔ ان کلموئے بھیڑیوں نے بڑا ستایا! تیرا باپ بندوق اٹھاتا، اسکی لیتا اور رات کے وقت باہر نکل جاتا۔ جب لوٹتا تو ایک دو بھیڑیے ضرور مار لاتا۔ وہ ان کی کھالیں اتارتا اور ان میں بھس بھرتا۔ ان کی آنکھوں میں کچھہ اس طرح شیشے جڑتا کہ دیکھنے والے کی سمجھہ میں نہیں آتا کہ یہ نقلی ہیں یا اصلی۔ ایک دن تیرا ماموں میخائل موری کی طرف گیا۔ یکایک کیا دیکھتی ہوں کہ وہ الٹے پاؤں دوڑا چلا آرہا ہے، آنکھیں ہیں کہ نکلی پڑ رہی ہیں، رونگٹے کھڑے ہیں، زبان اس طرح لٹکی ہوئی ہے کہ بولنا دوبھر۔ وہ بالکل دوہرا ہوا جا رہا ہے، ہانپ رہا ہے۔ ''بھیڑیا!،، ہر شخص جس کے جو ہاتھہ لگتا ہے اٹھا لیتا ہے اور موری کی طرف بگ ٹٹ بھاگتا ہے۔ اور سچ سچ بھیڑیے کا سر ہے کہ دیوار کے سوراخ سے جھانک رہا ہے۔ لوگ ہیں کہ گولیاں برسا رہے ہیں، ڈنڈے سے پیٹ رہے ہیں، مگر ڈھیٹ بھیڑیا ہے کہ اپنی جگہ ڈٹا ہوا ہے۔ سب دبے پاؤں بڑھے — دیکھتے کیا ہیں کہ ایک خالی کھال پڑی ہے اور اس کے سر میں بھس بھرا ہوا ہے اور اگلی دونوں ٹانگیں کموڈ پر ٹھکی ہوئی ہیں کیل سے! ارے ابکے تیرا نانا غصے سے بھوت ہو گیا،

بالکل بھوت! اب یاکوف نے بھی تیرے باپ سے گٹھ جوڑ کر لیا اور نئے نئے تماشے ہونے لگے۔ میکسم گتے سے ایک سر بناتا، پھر اس پر آنکھیں اور ناک ابھارتا، منہ بناتا اور بالوں کی جگہ سن چپکا دیتا۔ پھر وہ اور یاکوف، دونوں گلی میں جاتے اور اس ہوے کو کسی کی کھڑکی میں اٹکا دیتے۔ ظاہر ھے پڑوسی ڈر جاتے اور شور مچانے لگتے۔ وہ چادریں اوڑھ لیتے اور نکل جاتے۔ ایک بار ایک پادری ڈر گیا۔ وہ ڈر کر سنتری کے پاس بھاگا، سارے ہول کے سنتری کی بھی گھگھی بندھ گئی اور اس نے سیٹی بجانا شروع کر دی۔ وہ ہمیشہ یہی کھیل کرتے اور کہنے سننے سے ان کے کان پر جوں تک نہ رینگتی۔ میں نے کہا بھئی یہ کھیل بند کرو۔ واریا نے بھی بہت سمجھایا بجھایا، مگر وہ اپنی سی کرتے رہے۔ میکسم کہتا ”اف چھوٹی سی چیز دیکھ کر جب لوگوں کے اوسان خطا ہو جاتے ھیں اور وہ ادھر ادھر بھاگنا شروع کر دیتے ھیں تو واہ کیا مزا آتا ھے!“ کیا مجال جو باتوں میں آ جائے...

”خیر اس شرارت کے ھاتھوں تو اس کی جان کے لالے ھی پڑ گئے تھے۔ تیرا ماموں میخائل تو اپنے نانا پر گیا ھے — بات بات میں چرکا لگ جاتا ھے اس کے دل پر، اس کے دل میں کوئی نہ کوئی کینہ پلتا رہتا ھے۔ اس نے تیرے باپ سے چھٹکارا حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایک بار چاروں پاسکایا سڑک سے دعوت اڑاکر آ رہے تھے — یہی میکسم، تیرے دونوں ماموں اور ایک پادری —(بعد میں وہ اپنی جگہ سے ھٹا دیا گیا کیونکہ اس نے سائس کو پیٹ پیٹ کر دوسری دنیا چلتا کر دیا)۔ انہوں نے تیرے باپ کو اپنے ساتھ دیوکوف تالاب چلنے کے لئے کہا — جیسے وھاں برف پر پھسلنے کا ارادہ ھو۔ مگر وہ تالاب پہنچے تو انہوں نے تیرے باپ کو گڈ ھے میں دھکیل دیا — مگر، یاد آتا ھے، میں تجھے یہ قصہ سنا چکی ھوں...“

”میرے ماموں اتنے کمینے کیوں ھیں؟“

”نہیں وہ کمینے نہیں ھیں...“ نانی نے اطمینان سے جواب دیا اور چٹکی بھر نسوار ناک میں سڑک لی۔ ”احمق ھیں اور بس۔ میخائل کائیاں ھے مگر احمق بھی ھے... یاکوف تو ھے ھی... ھاں تو میں کہہ رہی تھی — ان لوگوں نے تیرے باپ کو گڈھے

میں دھکیل دیا۔ جب وہ نکلنے کی کوشش کرتا اور انگلیوں سے کنارا تھامتا تو تینوں جوتوں سے اس کی انگلیاں کچلتے۔ وہ تو خیر ہوئی کہ دونوں نشے میں دھت تھے اور تیرا باپ ٹھیک ٹھاک تھا۔ اللہ کا چاھا کچھ ایسا ھوا کہ میکسم کسی طرح گڈھے کے بیچوں بیچ تیرتا رہا۔ یہ لوگ اس کے سر پر برف پھینکتے رہے۔ لیکن ان کے نشانے خالی گئے۔ آخر وہ وھاں سے یہ سوچ کر چل دئے کہ وہ ان کی مہربانیوں کے بغیر ھی ڈوب جائے گا۔ لیکن میکسم رینگ کر نکل گیا اور سیدھا پولیس والوں کے ھاں بھاگا — تو جانتا ھی ھے بالکل چوک ھی پر تو ھے تھانہ۔ سرجنٹ میکسم کو اور ھمارے پورے خاندان کو جانتا تھا۔ اس نے پوچھا یہ سب ھوا کیسے؟،،

نانی نے اپنے اوپر صلیب کا نشان بنایا اوز شکرانہ ادا کیا:

''اللہ اس کی روح کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ بڑا کھرا آدمی تھا۔ جنت اس کا حق ھے! اس نے پولیس سے ایک لفظ بھی نہیں کہا کہ قصہ کیا ھوا۔ اس نے کہا ''غلطی میری ھے — میں نشے میں دھت تالاب پر چلا گیا اور گڈھے میں گر گیا۔،، لیکن سرجنٹ نے کہا ''تم جھوٹ بولتے ھو، تم تو کبھی پیتے پلاتے نہیں۔،، سرجنٹ اور دو اور آدمیوں نے مل کر میکسم کو وادکا کی مالش کی، خشک کپڑے پہنا کر سمور کے کوٹ میں لپیٹا اور گھر پہنچا گئے۔ ادھر یاکوف اور میخائل کا کہیں پتہ نہیں۔ گھر لوٹے ھی نہیں۔ وہ مزے میں بھٹیار خانوں میں گلچھرے اڑاتے تھے۔ میں اور تیری ماں میکسم کو پہچان ھی نہ سکے۔ ھائے وہ کیا سے کیا ھو گیا تھا — سر سے پاؤں تک نیلا پڑ گیا تھا، اس کی انگلیاں کچلی ھوئی تھیں، خون ٹپک رہا تھا، اس کی کنپٹیوں پر کچھ برف جیسا سفید نظر آ رہا تھا۔ پر یہ سفیدی پگھل نہیں رہی تھی — لو ایک آن میں اس کے بال کس طرح سفید ھو گئے تھے!

''وروارا ھے کہ چیخ رہی ھے ''میکسم، دشمنوں نے کیا کر دیا تم کو۔ میکسم، یہ کیا ھو گیا؟،، سرجنٹ ھر طرف سونگھتا پھر رہا ھے، جرح کر رہا ھے اور میرا دل ھے کہ ڈوبا جا رہا ھے، دل کہہ رہا ھے رنگ بے ڈھب ھے! میں نے وروارا کو تو سرجنٹ

سے چپکایا اور لگی میکسم کو کریدنے — سچ بتا بھئی، سچ بتا! اس نے کان میں کہا ''جاؤ میخائل اور یاکوف کو ڈھونڈو! ان سے کہو کہ ان کا میرا ساتھ یامسکایا سڑک پر چھوٹ گیا — وہ گئے پوکروفکا کی طرف اور میں پریادیلنی گلی کی طرف مڑ گیا۔ ان سے کہو اوٹ پٹانگ نہ بکیں ورنہ پولیس ناک میں دم کر دیگی۔،، میں دوڑی ہوئی تیرے نانا کے پاس گئی۔ بولی تم سرجنٹ کو باتوں میں لگائے رکھو اور میں پھاٹک پر بیٹوں کی راہ دیکھتی ہوں۔ میں نے بری خبر سنا دی۔ تیرے نانا نے لرزتے اور بڑبڑاتے ہوئے کپڑے پہنے۔ ''میں جانتا تھا کوئی ایسی ویسی بات ہوکر رھیگی!،، مگر یہ سب جھوٹ تھا — وہ جانتا خاک نہ تھا۔ خیر، بیٹے آئے، میں نے دونوں کے کان کھینچے۔ خوب خاطر تواضع کی۔ میخائل کا نشہ تو اسی آن ھرن ہو گیا۔ مگر یاکوف نشے میں دھت تھا۔ بڑبڑایا ''جانے میری بلا! یہ سب میخائل کی کارستانی ہے۔ وہ مجھ سے بڑا ہے!،، ہم نے بڑی مشکل سے سرجنٹ کو ٹھنڈا کیا — دل کا اچھا تھا وہ! اس نے کہا ''اب اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو یاد رکھو، میں مجرم کو پہچان لوں گا!،، وہ چلا گیا۔ تیرا نانا میکسم کے پاس گیا ''شکریہ بیٹے۔ میں خوب جانتا ہوں کوئی اور ہوتا تو بالکل دوسرا کھیل کھیلتا۔ بیٹی تیرا بڑا احسان ہے۔ تو ہمارے گھر اتنا اچھا انسان لائی۔،، ھاں جب تیرے نانا کے جی میں آتی تو اس طرح بڑی اچھی اچھی باتیں کرتا، اس کی عقل تو بعد میں ماری گئی، پھر اس نے اپنے دل پر تالا ڈال لیا۔ اچھا تو ہم تینوں اکیلے رہ گئے۔ میکسم نے اب کچھ رونا شروع کیا اور اس کا دماغ چکرانے لگا۔ وہ چیخا ''آخر انہوں نے میرے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا؟ میں نے آخر ان کا کیا بگاڑا ہے؟ اماں، بتاؤ، آخر انہوں نے میرے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا؟،، وہ مجھے ہمیشہ اماں کہتا تھا — بالکل ننھے بچے کی طرح۔ ھاں اس کا مزاج ہی کچھ ایسا تھا، بالکل بچوں جیسا۔ ''کیوں ماں؟،، وہ پوچھتا۔ میں کرموں جلی ہوں کہ بیٹھی اس کے ساتھ آنسو بہا رہی ہوں۔ آخر ماں کا دل ہے، آخر بیٹوں پر ترس کیسے نہ آئے؟ تیری ماں نے بلاؤز کے سارے بٹن مروڑ مروڑ کر توڑ دئے۔ وہ یوں بیٹھی تھی جیسے کسی سے لڑکر آئی ہو۔ ''میکسم،

چلو یہاں سے، چل دیں!،، وہ چیخ پڑی۔ ’’میرے بھائی ہماری جان کے گاھک ھیں۔ میں ان سے ڈرتی ہوں۔ چلو چل دیں!،، میں نے اس کو روکا ’’اب آگ پر تیل نہ چھڑکو! ویسے ھی گھر دھواں دھواں ہو رہا ہے!،، ٹھیک اس وقت تیرے نانا نے دونوں گدھوں کو بھیجا کہ جا، جاکر معافی مانگ۔ تیری ماں نے دھڑسے میخائل کے پورا تھپڑ ھی تو جڑ دیا — ’’لے، یہ ہے معافی!،، اور تیرا باپ ہے کہ پوچھه رہا ہے ’’بھائی تم لوگوں نے یہ سب کیوں کیا؟ ایں؟ تم نے تو مجھے زندگی بھر کو اپاھج بنا دیا تھا بھائی۔ انگلیاں صاف ہو جاتیں تو میں کس کام کا کاریگر رہ جاتا، ایں؟،، خیر کسی طرح صلح صفائی ہو گئی۔ تیرا باپ کوئی سات ہفتے بیمار رہا ’’اماں، آؤ کسی دوسرے شہر چلیں۔ میں اس جگہ سے اکتا گیا ہوں!،، اس کے کچھه ھی دن بعد اس کو استراخان بھیج دیا گیا۔ زار آنے والا تھا اور تیرے باپ کو شاندار محراب بنانا تھی۔ اس کو موسم بہار کے پہلے ھی جہاز سے رخصت کر دیا گیا — اور مجھے لگا جیسے کسی نے میرا آدھا دل کاٹ کر الگ کر دیا۔ وہ بھی اداس تھا۔ وہ بار بار کہتا تم بھی چلو اماں ہمارے ساتھه۔ مگر وروارا، مت پوچھو، کوئی خوش سی خوش تھی — اس نے اپنی خوشی چھپانے کی کوشش بھی نہ کی، بے حیا کہیں کی!.. ھاں تو اس طرح وہ ہمارے ھاں سے سدھار گئے۔ اور بس...،،

انہوں نے ایک گھونٹ وادکا پی، ایک چٹکی نسوار کی لی اور کچھه سوچتے ہوئے کھڑکی سے باھر دیکھا اور بولیں:

’’تیرے باپ سے میرا خون کا رشتہ نہ تھا — مگر ہمارا رشتہ دل کا تھا۔،،

کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ وہ کہانی کے تانے بانے بن رھی ھیں اور لو نانا آن دھمکے۔ وہ سوکھا مارا چہرہ اٹھاتے، ہوا میں کچھه سونگھتے، نانی اماں کو شبہے بھری نظر سے دیکھتے ہوئے تھوڑی دیر قصہ سنتے اور بڑبڑاتے:

’’جھوٹ جھوٹ، جھوٹ کے سوا اور کچھه نہیں...،،

ایک بار انہوں نے یکایک پوچھه لیا:

’’الیکسئی کیا تیری نانی شراب پیتی ہے یہاں؟،،

''نہیں - ''

''تو جھوٹ بول رہا ہے، تیری آنکھیں بتا رہی ہیں!''

وہ چلے گئے، پر ان کو یقین نہ آیا - نانی نے ان کے غائب ہوتے ہوئے ہیولے کی طرف آنکھ ماری اور یہ کہاوت دوہرائی:

اودئی جاؤ جاؤ
گھوڑے کو نہ ڈراؤ

ایک دن وہ کمرے کے بیچوں بیچ کھڑے ہوئے اور فرش پر آنکھیں گاڑ کر بولے:

''وروارا کی ماں؟''

''ایں؟''

''دیکھتی ہو کیا گل کھل رہے ہیں؟''

''دیکھتی ہوں - ''

''کیا خیال ہے تمہارا؟''

''قسمت وروارا کے ابا، قسمت - یاد رکھو، تم کہا کرتے تھے اس نواب زادے کے بارے میں؟''

''ہوں - ''

''تو پھر یہ رہا نواب زادہ تمہارا - ''

''بھکاری - ''

''خیر وہ جانے، اس کا معاملہ ہے - ''

نانا باہر چلے گئے - میں سمجھ گیا کہ کوئی آفت آنے والی ہے - میں نے نانی سے پوچھا:

''کیا باتیں ہو رہی تھیں نانی؟''

''کیا تجھے سب جاننا ضروری ہے، ایں؟'' انہوں نے میری ٹانگوں پر مالش کرتے ہوئے کہا - ''اگر تو نے بچپن ہی میں سب جان لیا تو پھر بڑے ہوکر جاننے کو کیا رہ جائے گا'' وہ ہنسیں اور سر دھننے لگیں -

''آہ، تیرا نانا! نانا تیرا! تو پروردگار کی نگاہوں میں بڑا پاپی ہے - الیکسئی، دیکھیو کہیو مت! بات یہ ہے کہ تیرے نانا کا سب کچھ لٹ گیا ہے! ایک ایک دمڑی لٹ گئی! اس نے ایک

بھلے مانس کو قرض دیا تھا، بڑا بھاری قرض، ہزاروں کا۔ اور لو وہ بھلامانس دیوالیہ ہو گیا، دیوالیہ...،،

وہ اپنے خیال میں کھوئی ہوئی دیر تک خاموش بیٹھی رہیں۔ ان کے چہرے پر مسکراہٹ کی روشنی بجھ گئی اور اندھیرا چھا گیا۔

،،کیا سوچ رہی ہو نانی؟،،

،،سوچ رہی ہوں، کون سا قصہ سناؤں؟،، انہوں نے چونکتے ہوئے جواب دیا۔ ،،اچھا ایوستیگنئی کی کہانی کیسی رہیگی؟ سن :

ایک تھا راھب
سمجھا تھا میں تو روشنی کا مینار ہوں۔
پادری اور زار سے زیادہ ہے روشنی میری۔
اور سوداگر — ؟ ارے چھوڑو وہ تو
خیر گرد کو بھی نہیں پہنچتے۔
مٹکتا پھرتا، جیسے مور، چوزہ
اس کی آنکھیں بڈھے الو کی طرح نکلی رھتیں
پڑوسیوں کو صبح سے شام تک سبق پڑھاتا رھتا۔
اس کی نظر میں کوئی چیز بھی ٹھیک نہیں!
بگھی میں سفر کرے تو کہے لو چرخ چوں چرخ چوں چلتی ہے
سیب کھایا تو — لو یہ تو میٹھا نہیں
دھوپ میں بیٹھے — تو باپ رے باپ بڑی گرمی ہے۔
ھر چیز کو دیکھتا ہے اور ایسے ھی اپنی سی ھانکتا چلا جاتا ہے

نانی نے آنکھیں گول گول نچائیں اور گال پھلائے۔ ان کے بھولے چہرے سے فوراً عجیب سی حماقت اور مسخراپن ٹپکنے لگا۔ انہوں نے آواز کو کھینچ کھینچ کر کہا:

،،ارے یہ چیز میں بھی بنا سکتا ہوں،
کہیں اچھا، بہت شاندار
مگر جانتے ھی ہو میں اپنا وقت برباد نہیں کر سکتا۔ ،،

نانی ایک منٹ کو رکیں، پھر بولیں :

ایک دن کچھ شیطان آن دھمکے اس کے ہاں:
''یہاں تو تمہیں بڑی تکلیف ہے نا؟
کیا خیال ہے – آؤ ہمارے ہاں دوزخ میں مہمان،
وہاں کی آگ تو لبالب کنوؤں کو بھی یوں چاٹ جائے!،،
ابھی راہب نے سر پر ٹوپی بھی نہیں جمائی تھی
کہ دو شیطان اس کے کندھوں پر جم گئے،
دوسرے شیطانوں نے اس کو پنجوں میں دبوچا
اور اس کی چٹکیاں بھریں اور بوٹیاں نوچیں،
پھر اٹھایا اور بھڑکتے ہوئے شعلوں میں پھینک دیا۔
''اچھا ایوستیگنئی، کہو کیسے ہو، خوش ہو نا اب؟،،
راہب بھننے لگا اور اس نے آنکھیں نکالیں،
لیکن اب بھی وہی انداز تھا دانا و عاقل والا
اس کے ہونٹ بڑی نفرت سے مڑے اور وہ بولا:
''دوزخ کی آگ سے دھواں بہت اٹھتا ہے!،،

نانی نے آواز کو بہت ھی کھینچ کر کہانی ختم کی، پھر زور سے قہقہہ لگایا اور جو میری طرف مڑیں تو چہرے کی کیفیت کچھ اور تھی:

''ایوستیگنئی ہار نہ مانا، وہ بھی تیرے نانا کی طرح تھا، اپنی سی کرگزرنے والا۔ اچھا۔ اب سوچو! سونے کا وقت ہوگیا!..،،

میری ماں کبھی کبھار ھی مجھے دیکھنے کو دوچھتی میں آتیں۔ وہ آتیں، دو چار باتیں جلدی جلدی کہتیں اور چلی جاتیں۔ ان کا حسن اب اور بھی چمک اٹھا تھا اور ان کے کپڑے پہلے سے زیادہ اچھے ہو گئے تھے۔ لیکن ان میں بھی مجھے کوئی راز سا نظر آتا تھا، نانی کی طرح، کوئی ان بوجھی بات! میرا دل کہتا تھا کہ ضرور کوئی بات ہے جو ماں اور نانی دونوں مجھ سے چھپانا چاھتی ھیں اور میں یہ پہیلی بوجھنے کی کوشش کرتا رہتا۔

نانی اماں جو کہانیاں کہتیں، اتنی اسنگ سے نہ سنتا۔ ابا کی کہانی بھی میرے دل میں سر اٹھاتے ہوئے اندیشوں کو دور نہ کر سکی جو زور بروز زیادہ مضبوط ہوتے جا رہے تھے۔

''وہ کون سی چیز ہے جو ابا کی روح کو اتنا ستا رہی ہے؟،، ایک دن میں نے نانی سے پوچھا۔

''میں کیا جانوں؟،، انہوں نے آنکھوں پر ایک ھاتھہ رکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''خدا کے کارخانے میں بندے کو کیا دخل — یہ ھما شما کی عقل میں آنےوالی باتیں نہیں، بھلا؟..،،

راتیں آنکھوں میں کٹ جاتیں۔ میں پڑا پڑا اندھیرے نیلے آسمان پر ستاروں کے کارواں کو آھستہ آھستہ گزرتے ہوئے دیکھتا رھتا اور بڑی المناک کہانیاں سوچتا رھتا جن کے ھیرو میرے ابا ھوتے۔ وہ ھمیشہ اکیلے ھوتے، ان کے ھاتھہ میں ایک ڈنڈا ھوتا اور ایک جھبرا کتا ان کے پیچھے پیچھے بھاگتا رھتا...

۱۲

ایک شام میں ھلکی سی جھپکی مارنے کے بعد جو اٹھا تو محسوس ھوا کہ میری ٹانگیں بھی جاگ گئی ھیں۔ میں نے ٹانگیں چارپائی کے کنارے لٹکا دیں۔ پھر ایک بار ٹانگیں سن اور بےجان ھو گئیں۔ لیکن اب دل میں اعتماد پیدا ھو چکا تھا کہ میری ٹانگیں صحیح سالم ھیں اور میں چل سکتا ھوں۔ دل میں خوشی کا ایسا طوفان اٹھا کہ میں نے بے اختیار پیر فرش پر رکھہ دئے اور کھڑا ھو گیا۔ میں گر پڑا، مگر رینگتا ھوا زینے سے اترا۔ میں نے سوچا مجھے دیکھہ کر تو یکایک لوگوں پر بجلی گر پڑےگی۔

مجھے یاد نہیں آتا کہ میں نانی اماں کی گود میں کیسے پہنچا۔ لیکن جو آنکھہ کھلی تو دیکھتا کیا ھوں کہ میں ماں کے کمرے میں نانی کی گود میں ھوں۔ عجیب عجیب لوگ مجھے دیکھہ رھے تھے۔ ان ھی میں ایک سوکھی ماری سبز بڑھیا بھی تھی جس کی آنکھیں سبز تھیں۔

''اس کو رس‌بھریوں کا جیم اور گرم گرم چائے پلا کر کمبل میں لپیٹ دو ...،، سبز آنکھوں والی بڑھیا نے بڑے طمطراق سے کہا۔ اس کی آواز نے دوسروں کی آوازیں دبا دیں۔

اس کا پورا وجود سبز تھا — اس کا لباس، اس کی ٹوپی، اس کا چہرہ اور بائیں آنکھہ کے نیچے مسا! مسے سے جھانکتے ہوئے روئیں تک گھاس معلوم ہوتے تھے۔ اس کا بالائی ہونٹ اٹھا ہوا تھا اور نچلا لٹکا ہوا۔ اس کے سبز دانت چمک رہے تھے۔ وہ ایک ہاتھہ سے آنکھوں پر سایہ کئے مجھے گھور رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں سیاہ لیس کے دستانے تھے۔

''کون ہے یہ؟،، میں نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

''یہ اب تیری دادی ہوں‌گی،، میرے نانا نے بڑی ناخوشگوار آواز میں کہا۔

ماں نے قہقہہ لگایا اور ایوگینی ماکسیموف کو میری طرف دھکیلتے ہوئے کہا:

''اور لے یہ ہوں‌گے تیرے نئے ابا۔،،

ماں نے کچھہ اور بھی کہا، بہت بہت جلدی جلدی۔ بالکل سمجھہ میں نہ آیا کیا۔ ماکسیموف آنکھیں میچے ہوئے میرے اوپر جھک گیا:

''میں تمہیں کچھہ رنگ خرید دونگا۔،،

کمرہ جگمگا رہا تھا۔ کونے میں میز پر شمع‌دان رکھے تھے۔ ہر شمع‌دان میں پانچ موم‌بتیاں جل رہی تھیں۔ ان کے درمیان نانا کی پسندیدہ شبیہہ رکھی تھی — ''مت رو، اے ماں!،، فریم پر جڑے ہوئے موتی چمک رہے تھے اور موم بتی کی روشنی میں پگھلتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ سنہرے ہاروں میں جو ہیرے چمک رہے تھے ان سے روشنی کے شعلے سے لپک رہے تھے۔ کھڑکیوں کے شیشے سے چپکے ہوئے چہرے جھانک رہے تھے۔ چپٹی چپٹی ناکیں شیشے پر دبی ہوئی تھیں۔ مجھے اپنے چاروں طرح ہر چیز تیرتی ہوئی محسوس ہوئی، سبز عورت مجھہ پر جھکی اور اس نے ٹھنڈی انگلیوں سے کنپٹیوں کو چھوکر دیکھا اور بڑبڑائی:

''ضرور، ضرور ...،،

''ارے بیہوش ہو گیا،، نانی نے کہا اور مجھے دروازے کی طرف لے چلیں۔

لیکن میں بیہوش نہیں ہوا۔ میں نے تو محض آنکھیں بند کر لی

تھیں - اور جب وہ مجھے اٹھا کر زینے پر چڑھ رہی تھیں تو میں نے کہا :

''تم مجھے بتاتیں کیوں نہیں نانی؟،،

''اچھا، اچھا — اس وقت بولو مت، سنا؟،،

''تم سب مجھے دھوکا دیتے ہو - تم سب...،،

نانی نے مجھے چارپائی پر لٹایا اور تکئے میں منہ ڈال کر رونے لگیں - ان کے شانے ہل رہے تھے اور وہ سسکیاں بھرتے ہوئے بڑبڑا رہی تھیں :

''رو رو رو...،،

اور میرا جی رونے کو نہ چاہ رہا تھا - دوچھتی میں دھندلکا اور ٹھنڈک تھی - میرے لرزنے سے چارپائی ہل رہی تھی اور چیخ رہی تھی - کسی طرح سبز عورت میری آنکھوں سے اوجھل نہ ہوتی تھی - میں سوتا بن گیا اور نانی مجھے چھوڑ کر چلی گئیں -

چند دن بڑے پھیکے اور بے رنگ سے بیت گئے - ماں منگنی کا اعلان کرنے کے بعد کہیں چلی گئیں اور گھر پر سناٹا چھا گیا -

ایک دن صبح ہی صبح نانا ہاتھ میں چھینی لئے آئے اور کھڑکیوں کے کنارے کھودنے لگے - نانی کٹھوت میں پانی اور کچھ چیتھڑے لئے آئیں -

''تو پھر ، بڑی بی؟،، نانا نے آہستہ سے پوچھا -

''تو پھر کیا؟،،

''تم خوش ہو نا؟،،

نانی نے وہی جواب دیا جو انہوں نے زینے پر کہا تھا -

''اچھا اچھا — اس وقت بولو مت، سنا؟،،

ان سیدھے سادے لفظوں میں خاص معنی چھپا ہوا تھا، ان لفظوں میں تو بڑی بات، نا خوشگوار بات پوشیدہ تھی - سب یہ جانتے تھے مگر کوئی اس کا نام زبان پر لانا نہ چاہتا تھا -

نانا نے بڑی احتیاط سے جاڑے کی چوکھٹ ہٹائی اور اسے لے کر چل دئے - نانی نے کھڑکی کھول دی — ایک مینا اور گوریاں باغ میں چہچہائیں - پگھلتی ہوئی مٹی کی خمارآگیں خوشبو کمرے میں بس گئی - تندور کی نیلی دیواریں اداس اور زرد پڑ گئی تھیں - ان

کو دیکھ کر میں لرز اٹھا - میں چپکے سے رینگتا ہر بستر سے نکلا -
''ننگے پاؤں نہ پھرنا،، نانی نے ڈانٹ بتائی -
''میں ذرا باغ میں جا رہا ہوں - ،،
''ذرا دم تو لے — سیلن تو دور ہونے دے• بھائی!،،
میں ان کی حکم کی تعمیل پر بالکل آمادہ نہ تھا - میں اب بڑوں کو دیکھنا نہ چاہتا تھا - ان کو دیکھ کر میرے دل پر اوس پڑ جاتی تھی -
زردی مائل ہری ہری دوب کی پلکیں زمین سے جھانک رہی تھیں - سیب کے درختوں پر کونپلیں پھوٹ رہی تھیں، پیتروونا کے مکان کی چھت پر خوبصورت ہری کائی کا مخمل بچھا ہوا تھا - ہر طرف چڑیاں چہچہا رہی تھیں - معطر اور گنگناتی ہوئی ہوا میں میرا سر تیرنے لگا - بھورے بھورے جھاڑ جھنکاڑ جو برف سے دب گئے تھے، اس گڈھے کے کنارے کنارے نظر آ رہے تھے جہاں چچا پیوتر نے اپنا گلا کاٹ لیا تھا - میرا جی بھر آیا - ہاں اس میں بہار کا کوئی نشان نہ تھا - ہر چیز جلی ہوئی، اداس اور سیاہ معلوم ہو رہی تھی - گڈھا یہاں بن بلایا مہمان معلوم ہوتا تھا - میرا خون کھول گیا اور بے اختیار جی چاہا کہ یہ جنگلی گھاس نوچ لوں، اینٹ اٹھا کر پھینک دوں، ہر وہ چیز ہٹا دوں جو وہاں کباڑ کا ڈھیر بنی پڑی تھی - میرا جی چاہتا تھا کہ میں اپنے لئے الگ تھلگ ایک چھوٹا سا کنج بناؤں، اکیلا رہوں اور کوئی بڑا بوڑھا پاس نہ ہو - میں نے فوراً اس پر عمل شروع کر دیا - اس طرح گھر کے حال کے واقعات میں بھول گیا - حق تو یہ ہے کہ گھاؤ اپنی جگہ رہا لیکن پہلی سی ٹیس نہ اٹھتی تھی -
''تو منہ لٹکائے کیوں بھٹکتا پھرتا ہے بابا؟،، میری نانی اور اماں پوچھتیں - ایسے سوال سے میں بالکل گھبرا جاتا — میں ان لوگوں سے خفا نہ تھا، بس اتنی سی بات تھی کہ اس گھر سے وابستہ ہر چیز میرے لئے نا خوشگوار ہو گئی تھی - اکثر وہ سبز عورت کھانے یا شام کی چائے پر ہمارے ساتھ آ بیٹھتی - وہ احاطے کے پرانے کٹہرے کا سڑا ہوا کھمبا نظر آتی - ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ان دیکھے تاگے سے اس کی آنکھیں چہرے میں ٹانک دی گئی ہیں - اس کے دیدے

ھڈیالے گڈھوں میں گھومتے رھتے، اس کے دیدے ھر چیز کو دیکھتے ھوئے، پر کھتے ھوئے معلوم ھوتے۔ جب وہ خدا کا نام لیتی تو آنکھیں چھت پر ٹک جاتیں۔ جب گھریلو چیزوں کا ذکر چھڑتا تو آنکھیں فرش پو جھک جاتیں۔ اس کی بھوئیں نقلی معلوم ھوتی تھیں۔ اس کے چوڑے جبڑے منہ میں آئی ھوئی ھر چیز کو بڑی خاموشی سے چبا ڈالتے۔ وہ کانٹے کو کچھہ عجیب مضحکہ‌خیز ڈھنگ سے پکڑتی تھی۔ اس کی انگلیاں مڑی تڑی نظر آتیں اور چھنگلی اٹھی رھتی۔ اس کے کانوں کے آگے رخساروں کی گول ھڈیاں لرز رھی تھیں، اس کے کان تھرکتے رھتے اور اس کے مسے کے سبز بال لرزتے اور اس کے زرد اور بیزارکن صاف ستھری جھریوں بھری جلد پر مسا بھی تھرکتا۔ اس کا بیٹا اور وہ خود دونوں اتنے صاف ستھرے براق نظر آتے کہ ان کے پاس پھٹکنے کی بھی ھمت نہ ھوتی۔ شروع میں پھلی ملاقات کے بعد اس نے کئی بار کوشش کی کہ میں اس کا بوڑھا ھاتھہ چوسوں جس سے قازان کے زرد صابن اور لوبان کی بو آتی تھی۔ میں ھمیشہ نو دو گیارہ ھو جاتا۔

''ایوگینی، سنتے ھو، اس چھوکرے کی خوب اچھی طرح تربیت ھونی چاھئے،، وہ بار بار اپنے بیٹے سے کھتی۔

وہ بڑی سعادت مندی سے سر جھکا دیتا، پیشانی پر بل ڈالتا اور منہ سے ایک لفظ نہ پھوٹتا۔ اس سبز ھستی کی موجودگی میں تو ھر شخص کی تیوریاں چڑھہ جاتی تھیں۔

میں اس بڈھی سے نفرت کرتا تھا اور اس کے بیٹے سے بھی جس کے صلے میں کئی بار میری خاصی مرمت بھی ھوئی۔ ایک دن جب ھم کھانا کھا رھے تھے تو بڈھی نے گول گول دیدے نچائے اور بولی:

''پیارے الیکسئی، آخر تو اتا مارا مار، اتے بڑے بڑے نوالے کیوں ٹھونستا ھے؟ دیکھنا کھیں گلے میں نوالے اٹک گئے تو دم گھٹ جائے گا!،،

میں نے منہ سے نوالہ اگل دیا اور اسے کانٹے سے اٹھاکر اس کی ناک کے آگے لے جاتے ھوئے کھا:

''ایسا ھی کلیجہ پھٹ رھا ھے تو لو، کھالو!،،

ماں نے مجھے میز سے بھگا دیا اور دوچھتی میں بند کر دیا۔

بعد میں نانی میرے پاس آئیں اور منہ پر ھاتھہ رکھہ کر بے تحاشا قہقہے لگانے لگیں :

''اف، خدایا! اف خدایا! خدا سمجھے تجھہ سے۔ کیسا چھوٹا سا شیطان ھے تو!،،

ان کا منہ پر ھاتھہ رکھنا کچھہ مجھے جچا نہیں۔ اس لئے میں ان کے پاس سے بھاگا، چھت پر گیا اور دیر تک وھیں چمنی کے پیچھے بیٹھا رھا۔ میرا جی چاھتا تھا کہ کوئی نہ کوئی شرارت کروں اور ان سب سے گستاخی کرکے ان کے دل کباب کروں۔ یہ خواھش اتنی منہ زور تھی کہ دبائے نہ دبتی تھی۔ اپنی اس خواھش سے لڑنا میرے لئے دوبھر تھا، مگر لڑنا ھی پڑتا تھا، مجبوری جو تھی۔ ایک دن میں نے اپنے ھونے والے سوتیلے باپ اور ھونےوالی دادی کی کرسیوں پر چیری کی رال لیس دی۔ دونوں کرسیوں سے چپک گئے۔ کیا کیا مسخراپن کیا ھے پھر دونوں نے، مت پوچھئے۔ نانا ابا نے جی بھر کے میری دھلائی کی۔ اس کے بعد دو چھتی میں ماں آئیں اور مجھے دونوں زانوؤں کے درمیان زور سے دباتے ھوئے بولیں :

''اخر تو اتنی شرارت کیوں کرتا ھے، ایں؟ کاش تو جان سکتا کہ اس سے میرے دل پر کیا بیتتی ھے!،،

ان کی آنکھوں میں روشن آنسو تیرنے لگے اور انہوں نے میرا سر اپنے گال پر دبایا۔ اگر وہ مجھے طمانچہ جڑ دیتیں تو بات کہیں آسان ھوتی۔ میں نے عہد کیا ماں اگر تم رونا بند کردو تو میں پھر کبھی ان کا دل نہیں دکھاؤں‌گا۔

''یہ ٹھیک ھے،، ماں نے آھستہ سے کہا۔ ''ھاں شرارت نہ کرو ۔ جلد ھی ھماری شادی ھو جائے گی اور ھم ماسکو جائیں گے ۔ اس کے بعد جب ھم واپس آئیں گے تو تو ھمارے ساتھہ رھیگا۔ ایوگینی واسیلیوچ بڑے نیک دل اور عقل مند ھیں ۔ تو بھی کالج میں پڑھےگا، ان ھی کی طرح ۔ پھر تو ڈاکٹر بنیگا یا اور کچھہ جو بھی تیرا جی چاھے ۔ پڑھا لکھا آدمی سب کچھہ کر سکتا ھے ۔ اچھا جا، جا کر کھیل...،،

یہ سارے ''پھر،، اور ''اس کے بعد،، ایک زینے کی طرح نیچے اترتے چلے گئے اور ایسا معلوم ھوا کہ یہ زینہ مجھے ماں سے

چھین کر کہیں اندھیرے میں لے جا رہا ہے، میں تنہائیوں میں گم ہو رہا ہوں۔ انہوں نے مجھے جس مستقبل کی جھلک دکھائی تھی اس میں میرے دل کی مسرت نہ تھی۔ میں اپنی ماں سے کہنا چاہتا تھا:

"شادی نہ کرو ماں۔ میں کروں گا کام کاج اور خوشی تمہارا بوجھ اٹھاؤں گا!"

لیکن میں نے یہ بات کہی نہیں۔ ماں کو دیکھ کر میرے دل میں بڑے نازک اور لطیف جذبات جاگتے۔ لیکن میں ان کا اظہار کبھی نہ کر پاتا۔

باغ میں میرا کام دن بہ دن آگے بڑھتا رہا۔ میں نے جھاڑ جھنکاڑ نوچ پھینکے۔ گڈھے کے کناروں کو اینٹوں سے مضبوط کر دیا۔ دوسری اینٹوں سے میں نے اپنے لیٹنے بھر کا چبوترا تیار کیا۔ میں نے رنگین شیشے اور ٹوٹی ہوئی پلیٹوں کے ٹکڑے اکٹھے کئے، ان کو اینٹوں کے درمیان چکنی مٹی سے بٹھایا۔ جب ان پر دھوپ چمکتی تو وہ گرجے کی شبیہوں کی طرح شعلہ گوں جگمگا اٹھتیں۔

"ابے تو تو بڑا کائیاں نکلا۔ کیا چیز بنائی ہے!"، ایک دن نانا نے میرے آشیاں کا معائنہ کرکے کہا۔ "لیکن مشکل یہ ہے کہ جھاڑ جھنکاڑ پھر اگ آئیں گے — تو نے جڑیں جو رہنے دیں۔ اچھا جا بیلچہ لے آ، میں نکال دیتا ہوں جڑیں!"

جب میں بیلچہ لے آیا تو انہوں نے ہاتھوں پر تھوکتے ہوئے بیلچہ اٹھا لیا اور بڑے زور سے بیلچہ کی تیز دھار زمین میں گہری گاڑ دی۔

"جڑیں پھینک دیں! میں یہاں تیرے لئے سورج مکھی اور مالوا کے پھول لگا دوں گا۔ بڑا شاندار رہیگا۔ ایں؟"

یکایک وہ بےحس و حرکت بیلچے کے سہارے کھڑے ہو گئے، بالکل چپ۔ میں نے نگاہ اٹھائی تو دیکھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ ان کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور روشن تھیں، کتے کی آنکھوں کی طرح۔

"قصہ کیا ہے؟"

انہوں نے خود کو جھنجوڑا، ایک ہاتھ سے منہ پونچھا اور میری طرف دیکھا۔

''ہوں، دیکھا ہے، مجھے ابھی سے پسینہ آ گیا۔ دیکھ تو ذرا کتنے کیڑے ہیں!''

وہ پھر زمین کھودنے لگے۔ یکایک بولے:

''لیکن ان باتوں میں رکھا کیا ہے۔ بیکار، فضول! جلد ہی میں مکان بیچ دوں گا۔ خزاں تک ضرور بیچ دونگا۔ تیری ماں کے لئے جہیز چاہئے۔ ہونہہ کم سے کم وہ تو ٹھکانے سے رہے...''

انہوں نے ہاتھ جھٹک کر بیلچہ پھینک دیا اور باغ کے کونے میں حمام کے پیچھے چلے گئے جہاں ان کے پود گھر تھے۔ میں نے کھدائی شروع کردی اور فوراً بیلچے سے اپنا پنجہ کاٹ کر رکھ دیا۔

اس زخم نے کچھ ایسا گل کھلایا کہ میں ماں کی شادی میں بھی شریک نہ ہو سکا۔ میں صرف پھاٹک تک گیا اور وہاں سے میں نے ماں کو ماکسیموف کے ساتھ آتے ہوئے دیکھا جو ماں کا بازو تھامے ہوئے تھا۔ ماں کا سر جھکا ہوا تھا، ماں کے قدم اینٹ کے فٹ پاتھ پر ڈراڑوں سے جھانکتی ہوئی ہری دوب پر بڑی احتیاط سے اٹھ رہے تھے جیسے کانٹوں پر چل رہی ہوں۔

شادی بڑی خاموشی سے ہوئی۔ شادی کی رسم کے بعد جو چائے ناشتے کا دور چلا اس سے بھی کوئی گرمی پیدا نہیں ہوئی۔ میری ماں فوراً اپنے سونے کے کمرے میں چلی گئیں اور اپنے بکس ٹھیک کرنے لگیں۔ میرا سوتیلا باپ میرے پہلو میں بیٹھا تھا۔ بولا:

''میں نے تمہیں رنگوں کا تحفہ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر ایسے رنگ یہاں نہیں ملتے اور اپنے رنگ تمہیں دے نہیں سکتا۔ میں تجھے رنگ ماسکو سے بھیج دوں گا۔''

''میں رنگوں کا کیا کروں گا؟''

''کیا تم تصویریں بنانا نہیں چاہتے؟''

''مجھے آتا ہی نہیں۔''

''اچھا تو پھر کچھ اور بھیج دوں گا۔''

میری ماں اندر آئیں۔

''ہم جلدی لوٹ آئیں گے''، ماں نے کہا۔ ''جیسے ہی تمہارے ابا امتحان پاس کریں گے اور تعلیم ختم ہوگی ہم واپس آ جائیں گے۔''

وہ لوگ مجھ سے بڑوں کی طرح بات کر رہے تھے۔ یہ بات

میرے دل کو بہت بھائی۔ لیکن ساتھ ھی یہ بات بڑی حیرانی کی تھی کہ اتنی بڑی داڑھی والا آدمی پڑھ رہا ہے۔

''کیا پڑھ رہے ہو تم؟،، میں نے پوچھا۔

''پیمائش۔ ،،

اب یہ پوچھنے کی زحمت کون اٹھاتا بھلا کہ یہ پیمائش کس چڑیا کا نام ہے۔ گھر پر بڑا تکلیف‌دہ سناٹا چھایا ہوا تھا جیسے اونی دھاگا سرسرا رہا ہو۔ میں بڑی بیقراری سے رات کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ نانا تندور کی طرف پشت کئے ادھ کھلی آنکھوں سے کھڑکی کے باھر گھور رہے تھے۔ سبز عورت سامان سفر باندھنے میں ماں کا ھاتھ بٹا رہی تھی اور ھائے وائے کرتی جا رہی تھی۔ نانی دوپہر سے پی‌پلا کر نشے میں دھت تھیں۔ وہ دو چھتی میں بند کر دی گئی تھیں تاکہ ان پر کسی کی نظر نہ پڑے اور خاندان کی ناک نہ کٹے۔

اگلی صبح تڑکے ھی ماں روانہ ھو گئیں۔ جدا ھونے سے پہلے انہوں نے مجھے کلیجے سے لگایا، مجھے یوں اٹھا لیا گویا میں روئی کا گالا ھوں۔ انہوں نے اس وقت میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہ جانے کن نظروں سے دیکھا۔ ایسی نظروں سے تو انہوں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ انہوں نے مجھے پیار کیا اور بولیں:

''اچھا خدا حافظ!..،،

''اس سے کہتی جاؤ میرے کہنے میں رہے،، نانا نے بگڑے تیور کے ساتھ آسمان کی طرف گھورتے ھوئے کہا جو اب تک گلنار تھا۔

''تجھے اپنے نانا ابا کی باتوں پر کان دھرنا چاھئے،، ماں نے میرے اوپر صلیب کا نشان بناتے ھوئے تنبیہہ کی۔ میں سوچ رہا تھا کہ ماں کچھ اور کہینگی۔ نانا کے اس طرح بیچ میں ٹپک پڑنے پر مجھے بہت غصہ آیا۔

ماں اور میرا سوتیلا باپ دونوں گھوڑا گاڑی میں بیٹھے۔ ماں کا اسکرٹ کسی چیز میں پھنس گیا اور وہ دیر تک پھر پھر کر اس کو چھڑانے کی کوشش کرتی رھیں۔

''ماں کا ھاتھ کیوں نہیں بٹاتا، سوجھتا نہیں تجھے، ایں؟،، نانا نے مجھ سے کہا۔ لیکن اس وقت میرے دل کے پرزے اڑ رہے تھے۔ میں ھاتھ بٹانے کی ھمت کہاں سے لاتا۔

ماکسیموف نے بڑی احتیاط سے چست نیلی پتلون میں چھپی ہوئی لمبی لمبی ٹانگیں گاڑی میں رکھیں۔ نانی نے اس کو چند گٹھریاں اور پوٹلیاں دیں جن کا ڈھیر سا لگ گیا اس کے زانوؤں پر۔ یہ ڈھیر اس کی ٹھوڑی کو چھونے لگا۔

''بس!،، اس نے گھبرا کر کہا اور اس کی زرد بھوئیں سکڑ گئیں۔

سبز عورت اور اس کا بڑا بیٹا، جو افسر تھا، دوسری گاڑی میں بیٹھے۔ سبز عورت موم کے پتلے کی طرح تنی بیٹھی تھی۔ اس کا بیٹا تلوار کے دستے سے داڑھی کھجا رہا تھا اور برابر جمائیاں لئے جا رہا تھا۔

''اچھا تو اب تم جنگ پر جا رہے ہو؟،، نانا نے پوچھا۔

''بے شک!،،

''بہت خوب، ذرا ترکوں کی پٹائی کی ضرورت بھی ہے۔،،

جانےوالے چل دئے۔ ماں نے کئی بار مڑکر دیکھا اور ہوا میں رومال ہلایا۔ نانی روتے ہوئے مکان کی دیوار کے سہارے کھڑی ہو گئیں۔ انہوں نے بھی ہاتھ ہلایا۔ نانا چپ چاپ کھڑے آنکھیں میچ کر آنسو ٹپکاتے رہے۔

''خیر... اس کا انجام... اچھا نہ ہوگا...،، وہ بڑبڑائے۔

میں اسٹول پر بیٹھا گاڑی کو ھچکولے کھاتے، موڑ پر آنکھوں سے اوجھل ہوتے دیکھتا رہا۔ میرے دل میں کوئی دروازہ دھڑ سے بند ہو گیا — کس کر...

ابھی سویرا تھا۔ سڑکیں اب تک سنسان تھیں اور کھڑکیاں بند۔ پہلے کبھی اس کھوکھلے پن کا، اس خلا کا احساس نہیں ہوا تھا۔ کہیں دور سے گڈریے کی بانسری کی ھٹ دھرم تان سنائی دی۔

''چل ناشتہ کر،، نانا نے کہا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''لگتا ہے تیری قسمت میں میرے ساتھ ہی گزر بسر کرنا لکھا ہے — تو گویا ماچس کی تیلی ہے اور میں پتھر۔ اچھا ہے تیلی پتھر پر رگڑی جا رہی ہے!،،

صبح سے شام تک ہم نے باغ میں خاموشی سے کام کیا۔ انہوں نے زمین کھودی، رس‌بھریوں کی جھاڑیوں کو باندھا، سیب کے درختوں سے کائی جھاڑی کیڑوں کا بھرتہ بنایا۔ میں اپنے گوشے کو ٹھیک

ٹھاک کرتا رہا، سجاتا رہا۔ نانا نے حمام کی جلی ہوئی شہتیر کے زمین سے نکلے ہوئے سرے کو تراشا اور زمین میں کھمبے گاڑ دئے جن پر میں نے چڑیوں کے پنجرے لٹکا دئے۔ میں نے جھاڑیوں اور ٹہنیوں سے ایک شامیانہ سا بنایا اور دھوپ اور شبنم سے بچنے کے لئے چبوترے کے اوپر ڈال دیا۔

''ہاں یہ بڑی اچھی بات ہے کہ آدمی اپنے ہاتھہ سے اپنے لئے چیزیں بنانے اور سجانے کا گر سیکھہ لے!،، نانا نے کہا۔

زندگی کے بارے میں جب وہ کوئی بات کہتے تو میں اس کو گرہ سے باندھہ لیتا۔ کبھی کبھی وہ اینٹوں کی نشست پر لیٹ جاتے جس کو میں نے گھاس سے ڈھک دیا تھا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ بولتے۔ ایسا لگتا کہ بڑی کوششوں سے الفاظ منہ سے کھینچ رہے ہیں۔

''اب تو اپنی ماں کے جسم کا کٹا ہوا ٹکڑا ہے۔ اب اس کے اور بچے ہوں گے جو تجھہ سے زیادہ اس کے کلیجے کے ٹکڑے ہوں گے۔ تو خود ہی جانتا ہے تیری نانی اماں پینے لگی ہے۔،،

وہ خاموش ہو جاتے، دیر تک خاموشی کی مہر نہ ٹوٹتی جیسے چپ چاپ کچھہ سن رہے ہوں۔ پھر ان کے بھاری بھاری لفظ ہونٹوں سے گرنے لگے:

''یہ دوسری بار اسے شراب کی لت پڑی ہے — پہلی بار اس وقت جب میخائل کے فوج میں جانے کا قصہ تھا۔ تیری نانی بالکل میرے گلے پڑ گئی کہ میں رشوت دے کر اس کی نجات کا پروانہ حاصل کر لوں۔ سو وہی ہوا۔ بیوقوف کہیں کی۔ اگر وہ فوج میں ہوتا تو شاید سنبھل جاتا۔ تھو... و... و، کیا لوگ ہیں! اور میں جلد مر جاؤنگا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تو بالکل اکیلا رہ جائے گا— سمجھا؟ بالکل اکیلا، تو اپنی زندگی کا مالک ہوگا، ہونہہ۔ خود ہی اپنی خدمت کر اور کبھی دوسروں کو موقع نہ دے کہ تجھہ سے خدمت لیں! چپ چاپ رہ، دھیرج رکھہ مگر چل اسی راستے پر جو تیرا راستہ ہے۔ سب کی باتیں سن مگر کر وہی جو تیرا دل کہتا ہے...،،

بارش والے دنوں کو چھوڑ کر ساری گرمی میں نے باغ میں کاٹ دی، جب راتیں گرم ہوتیں تو وہیں باہر ہی سو بھی جاتا — نانی نے بستر کے لئے نمدے کا ایک ٹکڑا دے دیا تھا۔ وہ خود بھی اکثر

راتیں میرے ساتھه هی گزارتیں - وہ آتیں تو بغل میں پیال دبائے آتیں اور میرے صوفے کے پہلو میں پیال بچھا کر لیٹ جاتیں - پھر کہانیاں کہتیں - بیچ بیچ میں وہ پکار اٹھتیں:

''دیکھه، وہ ستارا ٹوٹا! یہ کسی کی روح ہے، تڑپ ہوگی اپنی دھرتی ماں کے لئے! جانو کسی اچھے اور نیک انسان نے جنم لیا۔،،

یا:

''دیکھه، ایک نیا ستارا نکل آیا! کیسا ہیرا ہے ہیرا! آسمان، آسمان! اف کہاں کہاں پھیلا ہوا ہے، خدا کا لباس ہے نا، موتیوں اور ہیروں جڑا..!،،

''عقل کے دشمنو، کیا مرنے کی سوجھی ہے،، نانا بڑبڑاتے - ''ٹھنڈک سے اکڑ جاؤگے اور چور ڈاکو آئے تو گلا کاٹ دیں گے..!،،

سورج ڈوبنے لگتا تو آسمان پر آگ کے سیلابی دریا موجیں مارنے لگتے - دریاؤں کا دم ٹوٹتا اور سرخی مائل سنہری راکھه باغوں کے سبز مخمل پر بچھه جاتی - تب سرمئی اندھیرا دنیا پر ہاتھه رکھتا دکھائی دیتا - دنیا پھولتی اور پھیلتی ہوئی اور دھندلکے کو اپنی رگ رگ میں جذب کرتی ہوئی معلوم ہوتی - دھوپ کے جلائے ہوئے پتے شاخوں پر جھک جاتے اور گھاس زمین پر سر جھکا دیتی - ہر چیز میں زیادہ جان پڑ جاتی، ہر چیز زیادہ نرم ہو جاتی - ہر چیز سے خوشبو چھنتی، موسیقی سے بھی زیادہ لطیف خوشبو - دور دور میدانوں کے فوجی پڑاؤں سے صبح کی موسیقی کی دھنیں تیرتی ہوئی آتیں - رات اپنے ساتھه ایک ایسا جذبہ، ایک ایسا احساس لاتی جو ماں کی محبت کی طرح زوردار اور تازگی بخش ہوتا - خاموشی کیا تھی ماں کا پیار تھا، نرم نرم ہتھیلیوں سے دل کو تھپکنے والی خاموشی! خاموشی دل کے تمام زخموں پر مرہم رکھتی، دن بھر جو باریک اور دم گھوٹنے والا غبار جمع ہوتا اسے یہ خاموشی اپنی ہتھیلیوں سے صاف کر دیتی - لیٹے لیٹے آسمان کو گھورتے رہنے میں بڑا لطف آتا - ستارے آنکھیں کھول رہے ہیں اور آسمان کی گہرائیوں کو اور گہرا بنا رہے ہیں - ایسا لگتا جیسے یہ گریزاں گہرائیاں مجھے چپکے سے زمین سے اٹھا لیتی ہیں اور یہ کہنا مشکل ہو جاتا کہ زمین سکڑ کر میرے برابر کی ہو گئی ہے یا میں خود اتنا پھیل گیا ہوں کہ وہ کائنات جس کی

آغوش میں خود میں تھا اب میرے بازوؤں میں سما گئی ہے - خاموشی بڑھتی چلی جاتی، اندھیرا اور دبیز ہوتا چلا جاتا لیکن ان دیکھے تار تھرتھراتے رہتے — ہلکی ہلکی آوازیں پھوٹتی رہتیں - ہر آواز، چاہے یہ آواز سوئی ہوئی چڑیا کی ہو یا گزرتے ہوئے ساہی کی سرسراہٹ یا کسی انسان کی صدا — ان تمام آوازوں میں ایک بات ایسی ہوتی جو ان کو دن کی آوازوں سے الگ کرتی اور جن کی شدت حساس خاموشی کے دباؤ سے دوبالا ہو جاتی -

اکارڈین کی گونج، عورت کا قہقہہ، سڑک کے پتھروں پر تڑختی ہوئی ٹاپ، کتے کی غراہٹ — یہ ساری آوازیں دن کی شاخوں سے آخری پتوں کی طرح جھڑ جاتیں -

کبھی کبھی رات کو سڑک پر یا کھلے میدان میں نشے میں ڈوبی ہوئی آوازوں کا شور بلند ہوتا، بھاگتے ہوئے قدموں کی چاپ سنائی دیتی - یہ آوازیں بہت معمولی تھیں، اتنی معمولی کہ ان کی طرف دھیان بھی نہ جاتا -

نانی اماں گھنٹوں لیٹی رہتیں، ان کے بازو سر کے نیچے پڑے رہتے - وہ پڑی پڑی بڑے خاموش جذبے کے ساتھ کوئی داستان سناتی رہتیں اور ایسا معلوم ہوتا کہ انہیں اس کی ذرا پروا نہیں کہ میں سن رہا ہوں یا نہیں - وہ کبھی بھی کسی ایسے قصے کے تانے بانے بننے سے نہ چوکتیں جو رات کی خوبصورتی اور جوانی میں اور جان نہ ڈال دے -

میں ان کی باتوں کی لوری سنتے سنتے سو جاتا - اٹھتا تو دھوپ میرے چہرے پر مچلتی ہوتی اور کانوں میں چڑیوں کی چہچہاہٹ کا شہد ٹپکتا ہوتا - صبا کی رگوں میں دھوپ کی گرمی دوڑتی اور وہ دبے پاؤں اٹھتی، سیب کے درختوں کے پتوں سے شبنم کے موتی جھڑ جاتے، لم گھاس سے روشنی سی پھوٹتی - منڈلاتی ہوئی دھند کے پردے میں چھپی ہوئی گھاس میں شفاف بلوریں خیرگی پیدا ہو جاتی - کہیں ان دیکھی بلندیوں سے ابابیل کا نغمہ سنائی دیتا اور نئے دن کی تمام آہٹیں اور رنگ میرے دل میں شبنم کی طرح جذب ہو جاتے - دل میں ایک خواہش انگڑائی لیتی، اٹھوں اور چاروں طرف کی سیر کروں اور تمام جاندار چیزوں کے ساتھ زندہ رہوں، ان کے سر میں سر ملا کر گاؤں -

یہ میری زندگی کا سب سے پرسکون دور تھا۔ میں اس زمانے میں سوچتا رہا، خواب دیکھتا رہا۔ گرمیوں کا یہ موسم ہی وہ موسم تھا جس نے میرے دل میں اپنی قوت کا احساس بیدار کیا۔ میں لوگوں سے کترانے لگا۔ اوفسیانیکوف خاندان کے بچوں کی آوازیں اور چیخ پکار سن کر اب ان کے پاس جانے کو جی نہ چاہتا۔ اور جب میرے بھائی میرے پاس آتے تو مجھے کوئی خوشی نہ ہوتی۔ الٹا مجھے دھڑکا لگا رہتا کہ کہیں باغ میں میرے گھر کا ناس نہ کردیں — وہ چیز جو میں نے پہلی بار اپنے ہاتھ سے بنائی تھی۔

اب نانا کی نصیحتوں اور وعظوں میں بھی مجھے مزا نہ آتا۔ درشتی اور شکوہ وشکایت کا راگ زیادہ تیز ہوتا گیا۔ اب آئے دن نانی اماں سے ان کا جھگڑا ہونے لگا۔ نانی کو وہ نکال دیتے۔ وہ ایسے میں یاکوف ماموں یا میخائل ماموں کے ہاں چلی جاتیں۔ کبھی کبھی وہ کئی کئی دن گھر نہ آتیں۔ پھر نانا خود ہی اپنے لئے اور میرے لئے کھانا پکاتے۔ کھانا پکاتے اور بکتے جھکتے رہتے، کبھی انگلیاں جلا لیتے، کبھی پلیٹیں توڑ دیتے۔ دن بدن ان کا لالچ بڑھتا ہی رہا۔

جب باغ کے کونے میں وہ میرے پاس آتے تو بڑے مزے میں آرام سے گھاس پر بیٹھ جاتے اور دیر تک چپ چاپ مجھے دیکھتے رہتے۔ اس کے بعد یکایک پوچھتے:

''ارے کچھ پھوٹتا کیوں نہیں؟''

''نہ جانے کیوں۔''

''ہم اونچے لوگ تو ہیں نہیں، تو جانتا ہے''، وہ نصیحت کے انداز میں کہنا شروع کرتے۔ ''کوئی بھی ہمیں کچھ سکھانے سے رہا۔ ہمیں یہ سب خود ہی سیکھنا ہوگا۔ دوسروں کے لئے کتابیں لکھی گئی ہیں، اسکول بنائے گئے ہیں — ہمارے لئے کچھ بھی نہیں! ہمیں سب کچھ خود ہی پانا ہوگا، حاصل کرنا ہوگا...''

وہ بالکل کھو جاتے — بے حس و حرکت اور خاموش اپنے خیال میں گم۔ ایسے میں ان کی طرف دیکھتے ڈر لگتا۔

خزاں کے موسم میں انہوں نے مکان بیچ دیا۔ مکان بیچنے سے ایک دن پہلے ناشتے کی میز پر انہوں نے نانی سے یاس انگیز آواز سے فیصلہ کن انداز میں کہا:

''وروارا کی ماں، میں ایک زمانے سے تمہیں کھلا پلا رہا ہوں۔ مگر اب تماشا ختم ہوا — اب تمہیں اپنی روٹی آپ ہی کمانی پڑیگی!،،

نانی بالکل خاموش بیٹھی رہیں جیسے انہیں بہت دنوں سے یہ سننے کی امید تھی۔ انہوں نے بڑے اطمینان سے نسوار کی ڈبیہ نکالی، اسفنج جیسی ناک میں نسوار چڑھائی اور جواب دیا:

''ٹھیک ہے، کیا کیا جائے! ہر حال میں مگن رہنا ہے...،،

نانا نے ایک گلی میں ایک پرانے مکان کے تہہ خانے میں دو کمرے کرائے پر لے لئے۔ مکان بدلنے کے دوران میں نانی نے لمبے فیتے والا جوتا اٹھایا اور اسے تندور کے نیچے گھسیڑ دیا۔ وہ فرش پر دوزانو بیٹھ گئیں اور تندور کے آسیب سے کہنا شروع کیا:

''اے آسیب آ، اے آسیب آ۔ اندر کی سیر کر اور ہمارے نئے گھر میں قسمت کا ستارہ اوج پر لا...،،

نانا احاطے میں تھے۔ انہوں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔

''اسے بھی لے جا رہی ہو کیا؟ کافر کہیں کی، میں تجھے ایسا سبق پڑھاؤں‌گا کہ تو بھی یاد کریگی! تو مجھے یوں ذلیل کرےگی ایں؟،،

''اف، وروارا کے ابا سنبھل کے، خبردار! دیکھ لینا ہم پر کوئی بڑی آفت آئے گی!،، نانی اماں نے چنوتی دی مگر نانا ابا غصے میں بھوت ہو گئے اور انہوں نے آسیب کو ساتھ لے جانے سے انکار کر دیا۔

تین دن تک نانا پرانا مال خریدنے‌والے تاتاری کے ہاتھ فرنیچر وغیرہ بیچتے رہے۔ تاتاری بے تحاشا گالیاں بکتے جاتے اور مول تول کرتے جاتے۔ نانی ان کو کھڑکی سے دیکھتی رہتیں، کبھی ہنس دیتیں، کبھی رونے لگتیں اور ان کے ہونٹ دھیرے دھیرے ہلتے اور کچھ کہتے:

''لے چلو... توڑ دو...،،

میں بھی باغ میں اپنی کٹیا کو چھوڑتے ہوئے رو پڑا۔

دو گاڑیاں آئیں۔ ان میں سامان رکھا گیا۔ میں جس گاڑی میں بیٹھا وہ ایسی چرخ چوں چرخ چوں چل رہی تھی کہ مجھے محسوس ہوا جیسے وہ مجھے پھینک دینا چاہتی ہے۔ جھٹکے دے دے کر کوئی

مجھے اٹھا کر پھینکے دے رہا ہے... یہ احساس اگلے دو برس تک میرے پورے وجود پر چھایا رہا — میری ماں کی موت کے دن تک!

نانا کے تہہ‌خانے میں اٹھ آنے کے بعد جلد ہی میری ماں ملنے آئیں ۔ وہ بالکل زرد اور دبلی ہو گئی تھیں ۔ ان کی یہ بڑی بڑی آنکھیں جل رہی تھیں جن سے ایک قسم کی حیرانی جھانک رہی تھی ۔ انہوں نے ہر چیز کو غور سے دیکھا جیسے وہ اپنے ماں باپ کو اور مجھے زندگی میں پہلی بار دیکھ رہی ہوں ۔ انہوں نے ہم لوگوں کی طرف دیکھا اور کچھ بولیں نہیں ۔ سوتیلے باپ پورے کمرے میں ٹہلتے رہے، سانس روک کر سیٹی بجاتے رہے، گلا صاف کرتے رہے اور کمر کے پیچھے ہاتھ باندھے انگوٹھوں کو نچاتے رہے ۔

''خدا کی پناہ، تو کتنا بڑا ہو گیا!،، ماں نے میرے گالوں کو گرم ہتھیلیوں سے چھوتے ہوئے کہا ۔ وہ ڈھیلا ڈھالا اور بےڈھنگا سا بھورا لباس پہنے ہوئے تھیں جو پیٹ پر پھولا ہوا معلوم ہوتا تھا ۔

''ہلو!،، سوتیلے باپ نے میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا ۔ ''کیا حال چال ہیں؟،،

اس نے ناک سکیڑ کر ہوا میں کچھ سونگھا اور بولا:

''یہاں تو سیلن ہے!،،

دونوں بہت ہی تھکے ہارے اور میلے کچیلے سے نظر آ رہے تھے جیسے وہ پورے وقت دوڑتے رہے ہیں اور اب ان کے دل میں لیٹ کر آرام کرنے کے سوا اور کوئی خواہش نہ ہو ۔

ہماری چائے کا دور کچھ سنسان سا رہا ۔ پورے وقت نانا ابا برستے پانی کو کھڑکیوں کے شیشوں پر دوڑتے ہوئے دیکھتے رہے ۔ انہوں نے پوچھا:

''پھر — تو سب کچھ آگ میں جل کر رہ گیا، ایں؟،،

''سب کچھ،، سوتیلے باپ نے بڑے فیصلہ کن لہجے میں کہا ۔ ''ہم بڑی مشکل سے بال بال بچ گئے ۔،،

''ہوں، ہاں آگ کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے ۔،،

ماں نے نانی کے کان میں کچھ کہا ۔ نانی کی آنکھیں مچ گئیں جیسے تیز روشنی نے یکایک آنکھوں میں چکا چوند مچا دی ہو ۔ فضا اور بھی اداس اور سنسان سی ہو گئی ۔

یکایک نانا نے کچھ جلانے کے سے انداز میں بلند اور پرسکون آواز میں کہا:

''ایوگینی واسیلیوچ، میں نے افواہیں سنی ہیں کہ آگ واگ کچھ نہیں لگی اور تم سب کچھ تاش کی بازی پر ہار بیٹھے۔''

قبرستان کا سا سناٹا چھا گیا۔ صرف کھڑکیوں کے شیشوں پر بارش کی پٹر پٹر اور سماوار کی سنسناہٹ سنائی دے رہی تھی۔

''ابا...'' آخر میری ماں نے کہا۔

''ابا!'' نانا گرجے۔ ''اچھا آ گے؟ کہا نہیں تھا میں نے کہ تیس برس کی عورت کا بیس برس کے چھوکرے سے بیاہ کرنا پاگل پن ہے؟ لو اب دیکھ لو تماشا — ہے نا بڑھیا نمونہ؟ ایں؟ کہو بیٹی — کیسا لگا یہ تماشا، ایں؟''

پھر تو چاروں نے چیخنا چنگھاڑنا شروع کر دیا۔ سوتیلے باپ کی چنگھاڑ سب سے تیز تھی۔ میں گلیارے میں چلا گیا اور لکڑی کے کندوں کے ڈھیر پر سکتے کے عالم میں بیٹھا رہا۔ نہیں یہ میری ماں نہیں — میری ماں تو بالکل دوسری تھی، بالکل کوئی اور۔ میں نے کمرے ھی میں یہ محسوس کر لیا تھا لیکن اب یہاں باہر گلیارے میں بیٹھے بیٹھے آنکھوں میں ماں کی پچھلی تصویر پھر گئی۔

پھر اس کے بعد — ہاں کچھ یاد نہیں آتا کیا ہوا، کیسے ہوا۔ بس اتنا یاد ہے کہ میں سورمووہ کے ایک نئے مکان میں رہنے لگا جس کی دیواریں لکڑی کے کندوں کی تھیں۔ دیواروں پر کاغذ منڈھا ہوا نہیں تھا۔ کندوں کے درمیان دڑاڑیں سن سے بھر دی گئی تھیں اور اب یہاں ان گنت تل چٹوں کا بسیرا تھا۔ ماں اور سوتیلا باپ دونوں ان دو کمروں میں رہتے تھے جن کا رخ سڑک کی طرف تھا۔ میں اور نانی اماں باورچی‌خانے میں رہتے تھے جس میں ایک کھڑکی تھی اور یہ کھڑکی پڑوس کی چھت پر کھلتی تھی۔ آسمان کے پس منظر میں سیاہ کارخانے کے چمنی کے نقوش نظر آتے تھے۔ کارخانہ پیچ و خم کھاتا ہوا گاڑھا گاڑھا دھواں اگلتا رہتا جس کو جاڑے کی ہوا پورے ضلع پر بکھیر دیتی۔ دھویں کی چپچپاہٹ بھری بو ہمارے کمروں میں بسی ہوئی تھی۔ صبح تڑکے کارخانے کی سیٹی بھیڑیوں کی چیخ کی طرح سنائی دیتی:

''اوں اوں! اوں اوں!،،

جب بنچ پر کھڑے ہو کر کھڑکیوں کے اوپروالے شیشوں سے باہر دیکھتا تو کارخانے کے روشن پھاٹک دکھائی دیتے جو بڈھے پوپلے فقیر کی طرح منہ کھولے چھوٹے چھوٹے لوگوں کو نگلتا ہوا معلوم ہوتا۔ دوپہر کو ایک اور بھونپو بجتا۔ پھاٹک کے کالے ہونٹ کھل جاتے اور بہت بڑا سا گہرا گڈھا سا نظر آتا جو ان ہی چھوٹے چھوٹے لوگوں کو اگل دیتا۔ اب وہ لوگ کالے چشموں کی طرح سڑکوں پر بہتے ہوئے معلوم ہوتے اور سفید ہوا کے کھردرے ہاتھ ان کو دھکیلتے ہوئے گھروں کی طرف لے جاتے۔ آسمان شاید ہی کبھی دکھائی دیتا۔ ضلع کی چھتوں کے اوپر ایک اور چھت لٹکتی نظر آتی — تھپکی ہوئی، بھوری — اوپر کے بے جان اور مٹیالے منظر سے تصور کی دھار کند ہو جاتی اور آنکھوں میں اندھیرا سا چھا جاتا۔

شام کے وقت کارخانے کے اوپر بجھی بجھی سرخ روشنی کا شامیانہ سا تن جاتا۔ اس روشنی سے چمنیوں کے کنارے چمک اٹھتے اور ایسا معلوم ہوتا جیسے یہ چمنیاں زمین سے نہیں اٹھی ہیں بلکہ اوپر بادلوں سے نیچے گر رہی ہیں — سانس سے شعلے لپک رہے ہیں، کراہ رہے ہیں... ہر دن اس منظر کا تماشا دیکھنا ناقابل برداشت تھا۔ میرے دل میں ٹیس سی اٹھتی رہتی۔ نانی گھر کے جنجال میں پھنسی رہتیں۔ صبح سے شام تک کھانا پکاتی رہتیں، فرش صاف کرتی رہتیں، لکڑی کاٹتی رہتیں، پانی بھرتی رہتیں۔ جب شام آتی تو وہ تھکن سے نڈھال ہو کر کراہتیں اور ٹھنڈی سانس لیتیں۔ کبھی کبھی جب وہ کھانا پکا چکتیں تو چھوٹی سی روئی دار بنڈی پہن لیتیں، اسکرٹ چڑھاتیں اور شہر کی طرف نکل جاتیں۔

''چلیں جاکر دیکھیں بڑے میاں کے حال چال کیا ہیں...،،

''مجھے بھی لے چلو!،،

''پالے میں اکڑ کے رہ جائےگا! ذرا دیکھ تو سہی کیسی ہوا چل رہی ہے!،،

وہ برف پوش میدانوں اور کھیتوں میں کھوئے ہوئے راستوں پر سات ورسٹ کا فاصلہ طے کرکے شہر جاتیں۔ میری ماں کے پیر بھاری تھے اس لئے جسم زرد ہو گیا تھا، سوج گیا تھا۔ وہ لمبی بنی ہوئی

جھالروالی چیتھڑے چیتھڑے بھوری شال اوڑھے سمٹی سمٹائی بیٹھی رھتیں - مجھے اس شال سے نفرت تھی جو ان کے لحیم شحیم خوبصورت جسم کو چھپا لیتی تھی - اس کے پھٹے پرانے کناروں سے مجھے چڑ تھی - اس لئے جھالر کو نوچ نوچ کر پھینکتا رھتا تھا - مجھے اس گھر سے، کارخانے سے، پورے ضلع سے نفرت تھی - ماں فلیٹ کے پھٹے پرانے جوتوں میں پھرا کرتیں، اس طرح کھانستیں کہ ان کا بڑا پیٹ لرز اٹھتا - ان کی سرمئی نیلی آنکھیں سخت اور کھولتے ھوئے غصے کی آگ سے چمکتی رھتیں یا پھر ان کی آنکھیں ننگی دیواروں پر جم کے رہ جاتیں جیسے کسی چیز نے ان کی نگاھوں کو دیواروں پر جکڑ رکھا ھو - کبھی کبھی گھنٹہ گھنٹہ بھر کھڑکی سے سڑک کو گھورتی رھتیں - سڑک جبڑا سا معلوم ھوتی تھی - بڑھاپے نے دانت چھین لئے تھے یا ان کو مسخ کرکے رکھہ دیا تھا - بعض دانت جڑ سے اکھڑ گئے تھے اور ان کی جگہ بے ھنگم اور ضرورت سے زیادہ بڑے دانت جڑ دئے گئے تھے -

''ھم یہاں کیوں رھتے ھیں؟،، میں نے پوچھا -

''اف یہ مت پوچھو !،، ماں نے جواب دیا -

ان دنوں ماں مجھہ سے بہت کم بات کرتیں - ان کی تمام تر باتیں احکام اور گذارشوں تک محدود تھیں -

''ذرا وہ چیز لے آنا - یہ لے لینا، ذرا بھاگ کر دوکان جائیو ...،،

وہ مجھے کبھی کبھار ھی باھر جاکر کھیلنے دیتیں کیونکہ میں خوب پٹ پٹا کر گھر لوٹا کرتا - لڑائی میری اکلوتی خوشی تھی - لڑائی کے گرداب میں تو میں اپنی فطرت کے پورے جوش اور تلاطم کے ساتھہ کود پڑتا - ماں اس کی سزا دیتیں - لیکن یہ سزا آگ پر تیل کے چھڑکاؤ کا کام کرتی اور میں اگلی لڑائی میں اور بھی وحشت کے ساتھہ کود پڑتا - ماں اور بھی زیادہ سزا دیتیں - ایک بار میں نے دھمکی دی کہ اگر تم ماروگی تو میں تمہارے ھاتھہ میں دانت گاڑ دوں گا اور باھر کھیتوں میں جاکر پالے سے ٹھٹھر جاؤں گا - انھوں نے مجھے حیرانی سے دھکیل دیا اور ٹہلنے لگیں -

''جانور کہیں کا!،، انھوں نے نڈھال ھو کر ھانپتے ھوئے کہا - جذبات اور احساسات کی وہ زندہ اور لرزاں دھنک جس کا نام محبت

ہے آہستہ آہستہ میرے دل میں دھندلی پڑنے لگی اور اس کی جگہ غصے کے نیلے شعلوں نے لے لی جو ہر شخص کی طرف، ہر چیز کی طرف لپکتے تھے - اس دھنک کی جگہ دھواں اگلتی ہوئی بے چینی نے، اس احساس نے لے لی کہ میں اس بوجھل اور حماقتوں سے پر دنیا میں اکیلا ہوں -

میرا سوتیلا باپ بڑا ترش رو تھا - میری ماں سے کبھی کبھار ہی بات کرتا اور مجھ سے بڑی سختی برتتا تھا - وہ ہمیشہ سیٹی بجاتا اور کھانستا رہتا تھا یا آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر ٹیڑھے میڑھے دانتوں میں خلال کرتا رہتا تھا - وہ میری ماں سے زیادہ جھگڑے کرنے لگا، وہ میری ماں کو بڑی سردمہری سے غیروں کی طرح پکارتا - اس سے میرے دل میں آگ لگ جاتی - جب ان کا جھگڑا ہوتا تو وہ باورچی خانے کا دروازہ بند کر دیتا، ظاہر ہے وہ نہیں چاہتا تھا کہ میں اس کی باتیں سنوں - لیکن میں ضد میں اس کی کھردری کھرجدار آواز سن کر ہی دم لیتا -

ایک بار وہ پیر پٹکتے ہوئے چلایا:

''بڑھیا گائے، اسی تیرے مٹکے کی وجہ سے میں کسی کو گھر پر نہیں بلا سکتا - ''

مارے حیرت اور غصے کے میں تندور کے اوپر والے تختے سے اچھل پڑا اور میرا سر چھت سے اتنے زور سے ٹکرایا کہ دانت سے زبان کٹ گئی -

سنیچر کو مزدور میرے سوتیلے باپ کے پاس کھانے کے کوپن بیچنے آتے - ان کوپنوں سے کارخانے کے اسٹور میں سامان خریدا جا سکتا تھا - مزدوروں کو یہ کوپن اجرت کی جگہ ملتے تھے - میرا سوتیلا باپ آدھی قیمت میں یہ کوپن خرید لیتا - وہ مزدوروں سے باورچی خانے میں ملتا - وہ میز کے پیچھے بڑی شان سے بیٹھتا اور ہر کوپن پر منہ بناتا اور بڑبڑاتا:

''ڈیڑھ روبل - ''

''ایوگینی واسیلیوچ، یسوع مسیح کی خاطر ...''

''ڈیڑھ روبل...''

یہ گڈمڈ اور تاریک زندگی زیادہ دنوں قائم نہیں رہی - ماں کے بچہ ہونے سے پہلے مجھے نانا کے یہاں رہنے کے لئے پہنچا دیا گیا -

اب نانا کوناوینو بستی کے پیسچانایا کوچے میں، نپولنایا گرجا گھر کے قبرستان کے اوپر ایک دو منزلہ مکان میں رہتے تھے۔ نانا کے چھوٹے سے کمرے میں ایک بڑا سا روسی تندور تھا اور دو کھڑکیاں جو صحن میں کھلتی تھیں۔

''خوب!،، مجھے دیکھتے ھی وہ کچھ چچیاتی ہوئی آواز میں ہنسے۔ ''کہتے ھیں سب سے اچھی دوست ماں ہوتی ھے۔ لیکن تیرے معاملے میں قصہ ھی کچھ اور ھے — تیرا دوست ھے وھی بڈھا خناس نانا! تھو... و... و، کیا لوگ ھیں!،،

ابھی میں گھر سے واجبی واجبی جان پہچان پیدا کر سکا تھا کہ ایک دن ماں اور نانی دونوں نئے بچے کے ساتھ آئیں۔ میرے سوتیلے باپ کی نوکری مزدوروں کو دھوکا دینے کے جرم میں جاتی رہی۔ لیکن اس نے فوراً دوستوں سے داد فریاد کی اور اسے ریلوے اسٹیشن میں ٹکٹ بابو کا کام مل گیا۔

وقت گزرتا رہا۔ کافی عرصے بعد مجھے ماں کے ساتھ ایک پتھر کے مکان کے تہہ‌خانے میں زندگی بسر کرنے کے لئے بھیج دیا گیا۔ ماں نے فوراً مجھے اسکول میں داخل کرادیا اور پہلے ھی دن مجھے اسکول سے نفرت ھو گئی۔

میں اسکول آیا تو کچھ یہ شان تھی — ماں کے جوتے پیروں میں، جسم پر نانی کے بلاؤز سے تراشا ھوا کوٹ، اور لمبی زرد قمیص اور لمبی پتلون۔ فوراً یاروں کو مذاق اور طبع آزمائی کا موقع ھاتھہ آ گیا۔ میرا نام پڑ گیا ''اینٹ کا اکا،،۔ میں نے جلد ھی لڑکوں کو سیدھا اور رام کر لیا۔ لیکن پادری اور استاد کو مجھہ سے چڑ ھو گئی۔

استاد گنجا تھا اور اس کا چہرہ پیلا تھا۔ اسے نکسیر پھوٹنے کی بیماری تھی۔ وہ کلاس میں آتا تو ناک میں روئی کے پھائے ٹھسے ھوتے۔ وہ میز پر بیٹھتا، ناک سے بھنبھنائی ہوئی آواز میں ھم سے سوال کرتا اور بعض لفظ پوری طرح ادا کئے بغیر ناک سے پھائے نکالتا اور سر ھلا ھلا کر ان کا جائزہ لیتا۔ اس کا چہرہ بالکل تھپکا ھوا، تانبے کا بنا ھوا، کڑوا کسیلا معلوم ھوتا تھا۔ لگتا تھا اس کی جھریوں سے کچھ عجیب قسم کی ھریالی جھلکتی تھی۔ اس کے

خط و خال میں سب سے گھناؤنی چیز اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں تھیں ۔ اس کے ناک نقشے کے اس معجون میں آنکھیں فالتو چیز معلوم ہوتی تھیں ۔ اور لگتا تھا کہ اس کی آنکھیں میرے چہرے پر چپکی جا رہی ہیں ۔ میرا جی چاہتا کہ میں ہاتھہ سے نوچ کر ان آنکھوں کو اپنے چہرے سے الگ کردوں ۔

شروع کے چند دن تو میں سامنے کی بنچ پر بیٹھا بالکل استاد کی ناک تلے ۔ لیکن یہ ناقابل برداشت تھا ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی آنکھوں کو میرے سوا اور کوئی دکھائی نہیں دیتا ۔ وہ مستقل ناک سے بولتا رہتا :

''پیسکوف... دوسری قمیص پہنو ! پیسکوف ہلنا ڈولنا بند کرو ! پیسکوف دیکھنا تمہارے جوتوں نے پھر فرش پر پورا تالاب بنا دیا !،،

میں اس کا بدلہ لیتا اور ایک سے ایک بڑھ کے شرارتیں کرتا ۔ ایک دن میں پالے کا مارا آدھا تربوز اٹھا لایا ۔ میں نے اسے نکالا اور اندھیرے گلیارے میں دروازے پر ایک ڈور سے لٹکا دیا ۔ جب دروازہ کھلتا تو تربوز ہوا میں بلند ہو جاتا ۔ جب استاد نے دروازہ بند کیا تو تربوز بالکل ٹوپی کی طرح گرا اور اس کی کھوپڑی پر فٹ ہو گیا ۔ رات کا چوکیدار ایک شکایت نامے کے ساتھہ مجھے لے کر گھر گیا ۔ مجھے اس شرارت کا مزا چکھایا گیا ۔

ایک بار میں نے استاد کی ڈسک کی دراز میں نسوار چھڑک دی ۔ استاد پر چھینکوں کا کچھہ ایسا دورہ پڑا کہ اسے کلاس سے باہر جانا پڑا ۔ اس نے اپنے داماد کو (جو افسر تھا) اپنی جگہ پڑھانے کو بھیجا ۔ افسرنے ہمیں ''زار زندہ باد !،، اور ''آزادی، ہائے آزادی،، گانے پر باربار مجبور کیا ۔ اگر کوئی بے سرا ہو جاتا تو وہ ایک رولر سے لڑکے کے سر کو کھٹکھٹاتا ۔ اس طرح کھٹا کھٹ کی آواز پیدا ہوتی اور بڑا مزا آتا ۔ لیکن اس سے تکلیف نہ ہوتی ۔

دینیات کا استاد نوجوان اور خوش رو پادری تھا اور اس کے بال پھولے پھولے سے تھے ۔ اس کو میں ایک آنکھہ نہ بھاتا تھا کیونکہ میرے پاس ''تاریخ مقدس،، نہیں تھی ۔ وہ مجھہ سے اس لئے بھی خفا تھا کہ میں اس کے لب ولہجے کی نقل کیا کرتا تھا ۔

کلاس میں آتے ہی کہتا :

''پیشکوف کتاب لائے یا نہیں؟ ھاں - کتاب؟،،
''نہیں لایا - ھاں - ،،
''ھاں — کیا مطلب؟،،
''نہیں - ،،
''جاؤ گھر جاؤ - ھاں - گھر - میں تمہیں نہیں پڑھاؤں گا - ھاں - ھرگز نہیں پڑھاؤں گا - ،،

بھلا گھر جانے میں مجھے کیا اعتراض ھو سکتا تھا - میں اسکول کے ختم ھونے تک ضلع کی میلی کچیلی گلیوں میں مارا پھرتا، چاروں طرف شوروھنگامے میں کھوئی ھوئی زندگی کا لطف اٹھاتا چلتا -

پادری کا چہرہ بڑا ھی تیکھا، بالکل یسوع مسیح جیسا تھا - اس کی آنکھوں سے نسوانیت اور محبت چھلکتی تھی - اس کے ھاتھ چھوٹے تھے - لگتا تھا کہ اس کے ھاتھ ھر چیز کو چھوتے نہیں بلکہ چوستے ھیں — چاھے یہ چیز کتاب ھو یا رولر یا قلم - ایسا معلوم ھوتا تھا جیسے وہ ھر چیز سے محبت کرتا ھے اور ھر چیز کو جاندار سمجھتا ھے جس کو بےاحتیاطی سے چھونے سے صدمہ پہنچ سکتا ھو - وہ بچوں پر جان نہیں دیتا تھا مگر پھر بھی بچے اس کے دیوانے تھے -

مجھے امتحان میں اچھے نمبر ملے - مگر اس کے باوجود مجھے اطلاع ملی کہ برے چال چلن کی وجہ سے اسکول سے چلتا کر دیا جائے گا - اب میری سٹی گم ھوئی - ظاھر ھے جان کی خیر نہ تھی - ماں کی جھلاھٹ روز بروز بڑھتی جا رھی تھی - اور اب اکثر مجھ پر ھاتھ صاف کیا کرتی تھیں -

لیکن میں اس سانحے سے بچ گیا - ناگہاں بشپ کریسانف* ھمارے اسکول پر نازل ھوا - جہاں تک یاد آتا ھے وہ کبڑا تھا - جب یہ ٹھگنے سے قد کا آدمی سیاہ قبا لہراتا ھوا کلاس میں داخل

---

* تین جلدوں پر مشتمل مشہور تصنیف ''دنیائے قدیم کے مذھب،، اور اخباری مضمون ''شادی اور عورتیں،، کا مصنف - یہ مضمون میں نے جوانی میں پڑھا تو مجھ پر اس کا بہت اثر ھوا - غالباً میں نے عنوان ٹھیک نہیں لکھا - یہ مضمون ایک مذھبی رسالے میں پچھلی صدی کی آٹھویں دھائی میں شائع ھوا تھا -

ہوا اور ڈسک کے پاس بیٹھا تو پورے کمرے کی فضا میں بڑی گرمی اور جوش و خروش پیدا ہو گیا۔ یہ فضا بالکل انجانی اور ان دیکھی تھی۔

''اچھا، آؤ بچو بات‌چیت کریں ایک ذرا،، اس نے بڑی بڑی آستینوں سے ہاتھہ نکالتے ہوئے کہا۔

فہرست کے آخر میں میرا نام تھا۔ اس لئے ڈسک کی طرف جانے والوں میں آخر میں میری باری آئی۔

''کیا عمر ہے تمہاری؟،، اس نے مجھه سے پوچھا۔ ''سچ؟ اف اس عمر میں اتنے لمبے تڑنگے! لگتا ہے باہر بارش میں خوب بھیگے ہو!،،

اس نے لمبے لمبے ناخنوں والا پتلا دبلا ہاتھہ میز پر رکھا اور دوسرا ہاتھہ چھدری چھدری داڑھی پر پھیرا اور مجھے بڑی محبت سے دیکھا۔

''اچھا۔ تاریخ‌مقدس سے کوئی پرانی کہانی سناؤ۔،،

جب میں نے کہا کہ میرے پاس کتاب نہیں ہے اس لئے تاریخ مقدس کی کہانی نہیں پڑھه سکتا تو انہوں نے اپنی اونچی ٹوپی ٹھیک کی اور بولے:

''یہ کیوں کر ہوسکتا ہے؟ جانتے ہو تمہیں یہ سب جاننا چاہئے۔ اچھا ہو سکتا ہے تمہیں بغیر کتاب کے ہی کچھه یاد ہو — کہانیاں سنی ہیں کہیں؟ کیا تم مناجات کو جانتے ہو؟ خوب! اور دعائیں؟ اچھا دیکھا تم نے! شاید تمہیں کسی ولی کی سوانح حیات بھی یاد ہو؟ شعر میں؟ لو تم تو میاں بڑے علامہ نکلے!،،

ہمارا پادری اندر آیا، سرخ اور بھاپ اگلتا ہوا۔ بشپ اسکول کے پادری پر صلیب کا نشان بنا چکا تو اس نے میرے بارے میں کہنا شروع کیا۔

''ایک منٹ!،، بشپ نے اشارے سے اس کو روکتے ہوئے کہا۔ پھر وہ میری طرف مڑا۔ ''اچھا ولی اللہ الیکسئی کے بارے میں کچھه بتاؤ۔،،

''کیوں بیٹے، ہے نا شاندار نظم؟،، میں رکا تو بشپ بولا کیونکہ میں ایک مصرعہ بھول گیا تھا۔

''شاید تمہیں کچھ اور بھی معلوم ہو — حضرت داؤد کے بارے میں؟ بہت خوب۔ سن کے بڑی خوشی ہوئی!''

میں نے دیکھا کہ وہ واقعی لطف اٹھا رہا ہے، سچ مچ اسے شاعری کا چاؤ تھا۔ وہ دیر تک سنتا رہا۔ پھر بولا:

''کیا تم نے مناجات سے پڑھنا سیکھا؟ کس نے پڑھایا ہے تم کو؟ تمہارے اچھے نانا نے؟ تمہارے برے نانا نے! خیر یہ تم یونہی کہہ رہے ہو! کہتے ہیں تم کو ہمیشہ کوئی نہ کوئی شرارت سوجھتی رہتی ہے۔''

میں سرخ ہوگیا۔ لیکن میں نے اپنے گناہ کا اقرار کر لیا۔ استاد اور پادری نے خاصی تفصیل سے اس حقیقت کی تصدیق کی۔ بشپ نے آنکھیں جھکائے جھکائے ساری باتیں سنیں۔

''سنتے ہو تم کیا کہتے ہیں یہ لوگ تمہارے بارے میں؟'' آخرکار اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''ادھر آؤ!''

اس نے ایک ہاتھ میرے سر پر رکھا جس سے سرو کی بو آ رہی تھی:

''تم اتنی شرارت کیوں کرتے ہو؟''

''اسکول میں جی اکتاتا ہے۔''

''اسکول میں جی اکتاتا ہے؟ بیٹے اس میں ضرور کوئی نہ کوئی غلطی ہے۔ اگر اسکول میں تمہارا جی نہ لگتا تو تم برے طالبعلم ہوتے۔ مگر تمہارے نمبروں سے معلوم ہوتا ہے ایسا نہیں ہے۔ ضرور کوئی اور بات ہوگی۔''

اس نے قبا سے ایک چھوٹی سی کتاب نکالی اور اس میں کچھ لکھا:

''پیشکوف، الیکسئی۔ ہوں۔ بیٹے بھلا اسی میں ہے کہ تم شرارت چھوڑ دو۔ تھوڑی بہت شرارت تو خیر ٹھیک ہے۔ لیکن لوگ حد سے زیادہ تو نہیں جھیل سکتے نا! کیوں بچو کیا کہتے ہو؟''

''ٹھیک کہتے ہیں آپ!'' چہکتی ہوئی آوازوں کا کورس سنائی دیا۔

''اور تمہارا کیا خیال ہے اپنے بارے میں تم تو بہت کم شرارت کرتے ہو نا؟ ایں؟''

''اوہ، نہیں! ہم بھی خوب کرتے ہیں!،، لڑکوں نے ہنس کر کہا۔

بشپ نے مجھے اپنی طرف کھینچا اور کرسی پر اڑ گیا اور اتنے حیرت کے لہجے میں بولا کہ استاد اور پادری کو بھی ہنسی آ گئی:

''ذرا سوچو، تمہاری عمر میں تو میں بھی ڈٹ کے شرارت کرتا تھا۔ آخر ہم شرارت کیوں کرتے ہیں، ایں؟،،

لڑکے ہنسنے لگے اور بشپ نے ان سے سوال کرنا شروع کئے۔ وہ بڑی چالاکی سے لڑکوں کو ان کی باتوں کے جال میں پھنسا دیتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فضا زیادہ گرم ہوتی چلی گئی۔ آخر وہ اٹھا اور بولا:

''تم سے جدا ہونے کو جی نہیں چاہتا شریرو، مگر کیا کروں، جانا ہی پڑے گا۔،،

اس نے بازو اٹھایا اور آستین جھٹک کر اوپر چڑھاتے ہوئے کلاس کے اوپر صلیب کا نشان بنانے لگا۔

''خدا کرے تمہیں مقدس باپ، اس کا بیٹا، اس کی پاک روشنی سیدھے راستے پر لگائے۔ خدا حافظ!،،

''خدا حافظ، حضور پاک! جلدی آنا!،، لڑکے چلائے۔

''میں آؤں گا، ضرور آؤں گا،، اس نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہارے لئے کتابیں لاؤں گا۔،،

پھر وہ استاد کی طرف مڑا:

''اب ان لوگوں کو گھر جانے دو!،،

باہر گلیارے میں اس نے مجھے روکا اور ہلکی آواز میں بولا:

''وعدہ کرو اب تم اتنی زیادہ شرارت نہیں کروگے، کرتے ہو وعدہ، ایں؟ ظاہر ہے، میں خوب جانتا ہوں تم شرارت کیوں کرتے ہو۔ اچھا خدا حافظ!،،

میرے دل پر اس کا بڑا اثر ہوا۔ ایک عجیب جذبہ دل میں طوفان کی طرح اٹھ رہا تھا۔ اس لئے جب استاد نے مجھے کلاس کے بعد روکا اور کہنا شروع کیا کہ ''اب میمنے کی طرح رہنا کلاس میں سمجھے؟،، تو میں نے اس کی بات شوق سے سنی۔

پادری کوٹ پہن رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا:

''اب سے تم میری کلاس میں پڑھنا - ہاں ضرور - لیکن نچلے بیٹھنا چپ چاپ!،،

اسکول میں تو حالت کچھه سدھر گئی مگر گھر میں ایک بری بات ہو گئی - میں نے اپنی ماں کا ایک روبل پار کر لیا - اس جرم کا فیصلہ میں نے پہلے سے نہیں کر رکھا تھا -

ایک بار شام کو ماں مجھے بچے کے ساتھه اکیلا گھر چھوڑ گئی - کچھه کرنے دھرنے کو تھا نہیں اس لئے میں نے اپنے سوتیلے باپ کی ایک کتاب اٹھالی — ''ایک طبیب کی یادداشت،، جس کا مصنف دوماس ایلڈر تھا - اس کے ورقوں میں مجھے ایک روبل اور دس روبل کا ایک ایک نوٹ نظر آیا - کتاب میرے لئے بہت مشکل تھی - میں نے کتاب جو بند کی تو دماغ میں ایک خیال کوند گیا کہ میں ایک روبل میں ''تاریخ مقدس،، بھی خرید سکتا ہوں اور ''رابن‌سن کروسو،، بھی - کچھه ہی دنوں پہلے مجھے اس قسم کی کتاب کی اطلاع ملی تھی - ایک دن وقفے میں میں لڑکوں کو جادو اور دیوپریوں کی کہانیاں سنا رہا تھا - یکایک ایک لڑکے نے منہ بنا کر کہا:

''دیو پریوں کی کہانیوں میں کیا رکھا ہے - ہاں البتہ ''رابن‌سن کروسو،، چیز ہے - سچی کہانی!،،

کچھه اور لڑکوں نے بھی ''رابن‌سن کروسو،، پڑھی تھی - ان سب نے کتاب کی تعریف کی - میرے دل کو صدمہ پہنچا کہ لو انہوں نے تو میری نانی کے قصوں پر چوٹ کر دی - میں نے فیصلہ کر لیا کہ کہیں نہ کہیں سے ''رابن‌سن کروسو،، حاصل کرکے پڑھوں‌گا - پھر کہونگا ان سے ''ہونہہ! یونہی سی کتاب ہے!،،

اگلے دن میں ''تاریخ مقدس،،، آندرسن کی ''جادو کی کہانیاں،، کی دو جلدیں، ایک سیر سفید روٹی اور آدھہ سیر ساسیج لئے اسکول پہنچا - ولادیمیر گرجا کے پاس ہی نکڑ پر ایک چھوٹی سی اندھیری دوکان میں مجھے ''رابن‌سن کروسو،، کی ایک جلد مل گئی — چھوٹی سی کتاب تھی، ادھڑی ہوئی زرد جلدوالی کتاب - سرورق پر ایک دڑھیل کی تصویر تھی جس کے سر پر سمور کی ٹوپی تھی اور شانوں پر شیر کی کھال - اس میں کوئی کشش نہ محسوس ہوئی - لیکن ''جادو کی کہانیوں،، کی پھٹی پرانی جلد تک دل میں کھب کے رہ جاتی تھی -

لمبے وقفے میں میں نے لڑکوں میں بانٹ کر روٹی ساسیج کھائے۔ پھر ''بلبل،، پڑھنا شروع کیا۔ کیا لاجواب قصہ تھا۔ پہلے ھی لفظ سے لڑکوں کے دلوں پر جادو چل گیا۔

''چین میں سبھی چینی ھیں۔ یہاں تک کہ شہنشاہ بھی چینی ھے۔،، مجھے خوب اچھی طرح یاد ھے کہ اس ایک جملے کے سادہ مزاح اور مسکراتی ھوئی موسیقی نے میرے دل میں کیسی گد گدی سی کردی تھی۔ یہی نہیں، اس میں کوئی اور بات بھی تھی۔

اسکول میں ''بلبل،، ختم کرنے کا وقت نہیں مل سکا۔ جب میں گھر لوٹا توماں نے انڈے تلتے ھوئے بڑی درشت آواز میں پوچھا:

''کیا تو نے ایک روبل لیا ھے؟،،

''ھاں۔ یہ رھیں کتابیں...،،

ماں نے مجھے پوری کڑاھی رسید کردی اور ھمیشہ ھمیشہ کو ''جادو کی کہانیاں،، چھپا دیں۔ یہ سزا پٹائی سے بھی زیادہ تکلیف‌دہ سزا تھی۔

میں کئی دن تک اسکول نہ جاسکا۔ معلوم ھوتا تھا کہ میرے سوتیلے باپ نے اپنے ساتھہ کام کرنےوالوں کو میری کارستانی کا حال بتا دیا تھا اور لوگوں نے اپنے بچوں کو بتا دیا۔ بچوں نے یہ کہانی اسکول پہنچا دی۔ اس لئے جب میں اسکول گیا تو میرا خیرمقدم نئے خطاب سے کیا گیا — چور! یہ خطاب بہت چھوٹا اور صاف تھا — مگر غلط! میں نے یہ چھپانے کی کوشش نہیں کی کہ میں نے روپیہ لیا تھا۔ لیکن جب میں نے اس کی صفائی دینے کی کوشش کی تو کسی نے مجھہ پر یقین نہیں کیا۔ اس لئے میں نے گھر آ کر ماں کے سامنے صاف صاف اعلان کر دیا کہ اب میں اسکول نہیں جاؤں‌گا۔

ماں کے پھر بچہ ھونے والا تھا۔ وہ کھڑکی پر بیٹھی میرے بھائی ساشا کو دودھ پلا رھی تھیں۔ انہوں نے بجھا ھوا زرد چہرہ میری طرف پھیرا اور مجھے وحشی اور زخمی آنکھوں سے دیکھنے لگیں۔ ان کا منہ مچھلی کے منہ کی طرح کھلا ھوا تھا۔

''تو جھوٹ بک رھا ھے،، انہوں نے آھستہ سے کہا۔ ''نہیں، کوئی بھی تیرے روبل لینے کا قصہ نہیں سن سکتا۔،،

''جاؤ ، پوچھہ دیکھو۔،،

''تو نے خود ھی کہا ہوگا ان سے۔ سچ سچ بتا — کیا تو نے نہیں بتایا؟ مگر دیکھ خدا کے لئے جھوٹ نہ بول۔ اچھا کل میں خود جاؤں گی اسکول۔ معلوم ہو جائے گا کس نے کہا ہے!''

میں نے طالبعلم کا نام بتا دیا۔ ماں کا منہ اتر گیا اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

میں باورچی خانے میں گیا اور اپنے بستر پر لیٹ گیا جو لکڑی کے پرانے بکسوں سے تندور کے پیچھے بنایا گیا تھا۔ میں دوسرے کمرے سے ماں کی سسکیوں کی آواز سنتا رہا۔

''یاالہی، یاالہی...''

گرم اور چکٹ چیتھڑوں کی بو سے میرا دم گھٹنے لگا اور میں باہر صحن میں نکل گیا۔

''کہاں جا رہا ہے؟'' ماں نے پکارا۔ ''یہاں آ میرے پاس۔''

ہم فرش پر بیٹھ گئے۔ ساشا ماں کے زانو پر بیٹھا ماں کے بلاؤز کے بٹن کو نوچتا اور بٹنوں کی طرف جھک جھک کر کہتا رہا:

''بن...'' جس کا مطلب تھا بٹن۔

میں ماں سے لپٹ گیا اور ماں نے مجھے بازوؤں میں لے لیا۔

''ہم بہت غریب ہیں'' ماں نے کہا۔ ''ایک ایک کوپک... ایک ایک کوپک...''

انہوں نے اپنے گرم ہاتھوں سے مجھے بھینچا اور لگا جیسے وہ اپنی بات پوری کرنے کی سکت نہیں رکھتیں۔

''اف، کیسا درندہ ہے، درندہ!'' وہ یکایک چیخ پڑیں اور وہی لفظ دوہرائے جو میں نے ان کے منہ سے ایک بار پہلے بھی سنا تھا۔

''دلندہ دلندہ'' ساشا نے نقل اتاری۔

وہ عجیب و غریب بچہ تھا — بڑا بے ہنگم سا۔ یہ بڑا تو سر تھا اس کا، آنکھیں نیلی نیلی بڑی شاندار۔ وہ مسکراتی ہوئی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھتا جیسے اسے کسی چیز کا انتظار ہو۔ اس نے بہت جلد بولنا شروع کر دیا۔ رونا تو اس نے سیکھا ھی نہیں تھا۔ وہ خاموش، اپنی مسرتوں میں کھویا رہتا۔ وہ اتنا کمزور تھا کہ رینگنا بھی اس کے لئے دوبھر تھا۔ لیکن مجھے دیکھ کر وہ ہمیشہ کھل اٹھتا۔ وہ چھوٹے چھوٹے بازو میری طرف بڑھا دیتا اور ننھی ننھی نرم

نرم انگلیوں سے میرے کانوں کو چھوتا - نہ جانے کیوں اس کی انگلیوں سے بنفشے کی خوشبو آتی رہتی تھی - وہ بالکل اچانک مر گیا - نہ بیمار پڑا، نہ اور کچھ ہوا - بس یونہی چل بسا - صبح کے وقت بدستور وہ خاموش مسرت میں کھویا ہوا تھا - شام کے وقت ابھی گرجا گھر کے گھنٹوں کی آواز گونج ہی رہی تھی کہ اس کی لاش میز پر ڈالی جا چکی تھی - یہ دوسرے بچے نکولائی کی پیدائش کے فوراً بعد کا قصہ ہے -

ماں نے جو وعدہ کیا تھا کہ اسکول میں سارا معاملہ ٹھیک ٹھاک کر دیں گی سو وہ اپنا وعدہ پورا کرکے رہیں - اب پھر میں نارمل طریقے سے اسکول جاتا اور پڑھتا - لیکن کچھ ایسا ہوا کہ مجھے پھر نانا کے ہاں رہنے کے لئے جانا پڑا - اس کی وجہ سنئے -

ایک دن چائے کے وقت میں صحن سے باورچی خانے میں داخل ہو رہا تھا کہ مجھے ماں کی بےبس چیخ پکار سنائی دی:

''ایوگینی ، ایوگینی، مت جاؤ، میں تمہاری منت کرتی ہوں!،،

''بکواس،، میرے سوتیلے باپ نے جواب دیا -

''میں جانتی ہوں تم اس عورت کے پاس جاتے ہو!،،

''اچھا، جاتا ہوں تو جاتا ہوں، پھر؟،،

چند منٹ تو دونوں خاموش رہے - پھر ماں نے بے تحاشا کھانستے ہوئے کہا:

''تم کیسے نکمے اور ذلیل درندے ہو!،،

میں نے طمانچے کی آواز سنی - میں بھاگتا ہوا کمرے میں گھسا - میری ماں دوزانو بیٹھی ایک کرسی پر اڑی ہوئی تھیں اور میرا سوتیلا باپ ٹھاٹ دار سوٹ میں ملبوس لمبی ٹانگ سے میری ماں کے سینے پر ٹھوکریں لگا رہا تھا - میں نے روٹی کاٹنے کی چاندی کے دستےوالی چھری اٹھائی (میرے باپ کی یہی ایک چیز میری ماں کے پاس رہ گئی تھی) اور پوری طاقت سے سوتیلے باپ کے پہلو پر وار کیا -

خوش قسمتی سے میری ماں نے جلدی سے ماکسیموف کو دھکیل دیا - چھری اس کے کوٹ کو چیرتی اور جلد کو چاٹتی ہوئی نکل گئی - وہ کراہ اٹھا اور پہلو پکڑے ہوئے کمرے سے نکل بھاگا - ماں

نے چیخ کر مجھے دبوچ لیا اور فرش پر پٹک دیا۔ سوتیلا باپ صحن سے لوٹا تو اس نے مجھے ماں سے چھڑایا۔

اسی دن جب رات بھیگ چلی اور میرا سوتیلا باپ ان سب باتوں کے باوجود چلا ہی گیا تو ماں میرے پاس آئیں۔ میں تندور کے پیچھے لیٹا ہوا تھا۔ انہوں نے بڑی نرمی اور مامتا سے مجھے گلے لگایا اور پیار کیا:

''معاف کردے میرے لال۔ میں نے تجھے دکھه دیا۔ پر بتا تجھے اس کی ہمت کیسے ہوئی؟ چھری؟''

میں ایک ایک لفظ خوب تول تول کر بول رہا تھا۔ میں نے کہا میں سوتیلے باپ کو مار ڈالوں گا اور اس کے بعد اپنی جان بھی لے لوں گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں واقعی یہ کر بیٹھتا۔ کم از کم میں اس کی کوشش تو ضرور کرتا۔ اب بھی میں پتلون کے پائینچے سے جھانکتے ہوئے پیر کو ہوا میں پرواز کرتے ہوئے اور ایک عورت کے سینے پر برستے ہوئے دیکھه رہا ہوں۔

بعض مرتبہ جب میں اس بہیمانہ روسی زندگی کا تصور کرتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ کیا روسی زندگی کا یہ وحشی پہلو اس قابل ہے کہ اس پر روشنی ڈالی جائے۔ لیکن جب غور کرتا ہوں تو دل کہتا ہے کہ یقیناً اس زندگی کو بےنقاب کرنا چاہئے کیونکہ یہ وہ زہریلی اور سخت جان سچائی ہے جس کا قلع قمع آج تک نہیں ہوا ہے۔ یہ وہ سچائی ہے جس کی جڑ کو جاننا چاہئے تاکہ اسے جڑ سے اکھاڑا جا سکے۔ ان ذلتوں کی جڑیں تک اپنی دکھی اور شرمناک زندگی کی زمین سے نوچ لینا چاہئے — یہ جڑیں تو انسان کی روح اور یاد سے بھی نوچ کر پھینک دینا چاہئے۔

اس گھناؤنی تصویر کو پیش کرنے کی ایک اور وجہ بھی ہے، زیادہ معقول وجہ۔ مانا کہ یہ حقیقتیں بڑی گھناؤنی اور بیزار کن ہیں، یہ حقیقیں ہماری روح کو کچلتی ہیں، بہت سی حسین روحوں کو دباتی اور بگاڑتی ہیں — لیکن روسی انسان کے دل میں پھر بھی اتنی تاب وتواں ہے کہ وہ ان بھیانک اور گھناؤنی حقیقتوں پر قابو پا لیتا ہے اور آخر میں وہ ان پر پوری طرح قابو پاکر رہیگا۔

ہماری زندگی حیرت انگیز ہے۔ صرف اس لئے نہیں کہ درندگی

اور وحشت سے بھری ہوئی ہے بلکہ اس لئے کہ اس درندگی اور وحشت کی تہہ میں تخلیقی قوتوں کا چشمہ چمک رہا ہے - نیکی کی سوج بڑھ رہی ہے جو وعدہ کر رہی ہے کہ ہمارے لوگ آخر بیدار ہوں گے اور ان کی زندگی حسن اور درخشاں انسانیت کی دولت سے مالا مال ہوگی -

۱۳

میں پھر ایک بار نانا کے ساتھہ زندگی گزار رہا تھا -

''اچھا بدمعاش سن،، انہوں نے گھبراہٹ میں میز پر تال دیتے ہوئے کہا - ''میں اب تجھے نہیں کھلاؤں گا - اب تو جان اور تیری نانی جانے !،،

''اچھا اچھا میں انتظام کر لوں گی،، نانی نے کہا - ''گویا یہ بہت بڑا کام تھا !،،

''اچھا تو پھر جو جی چا ہے کرو،، نانا چیخے اور پھر بڑے اطمینان سے مجھے سمجھایا ''ہم اب بالکل الگ الگ رہتے ہیں - دونوں اپنے اپنے مالک ہیں !،،

نانی کھڑکی کے پاس بیٹھی لیس بنا رہی تھیں - ان کی تیلی تکیے کے اوپر بڑے مزے میں کھٹ کھٹ بول رہی تھی جو پیتل کے پنوں سے بھرا ہوا تھا اور موسم بہار کی دھوپ میں سونے کے تار کی طرح چمک رہا تھا - نانی خود بھی پیتل سے ڈھالی ہوئی معلوم ہوتی تھیں اور ذرا بھی نہیں بدلی تھیں - لیکن نانا زیادہ دبلے ہو گئے تھے اور جھریاں بڑھہ گئی تھیں - ان کے بال اور بھی اڑ گئے تھے، حرکات و سکنات میں رکھہ رکھاؤ اور شان و شوکت کی جگہ بےقراری اور گھبراہٹ نے لےلی تھی - ان کی سبز آنکھیں ہر چیز کو شبہے کی نظر سے دیکھتی تھیں - نانی نے ہنس کر اس جائداد کے بٹوارے کا قصہ سنایا جو ان کے اور نانا کے درمیان ہوا تھا - نانا نے سارا برتن باسن، پلیٹیں نانی کو دے دیں اور بولے :

''یہ سب تمہارا ہے - اب مجھہ سے اور کچھہ نہ مانگنا، ہاں !،،

پھر انہوں نے نانی کے تمام پرانے کپڑے اور چیزیں لے لیں جن

میں لومڑی کی کھال کی کیپ بھی تھی ۔ سب لے جا کر سات سو روبل میں بیچ دیا اور روپیہ سود پر اپنے دینی بیٹے کو قرض دے دیا جو یہودی تھا اور پھل کا بیوپار کرتا تھا ۔ لالچ نے ان کو مریض بنا دیا تھا ــ وہ بےحد چھچھورے ہو گئے تھے ۔ وہ پرانے جان پہچان کے لوگوں کے ھاں جانے لگے ــ مال‌دار سوداگروں اور کاریگروں کے ھاں جن کے ساتھہ پہلے وہ کام کر چکے تھے ۔ وہ لوگوں کے ھاں جاتے اور پیسے کے لئے ان کے آگے ھاتھہ پھیلاتے اور دکھڑا روتے کہ ان کے بیٹوں نے انہیں برباد کر دیا ۔ لوگ ان کے گزرے دنوں کی لاج رکھتے ہوئے جی کھول کر ان کے کام آئے ۔ نانا گھر آتے اور ایک بڑاسا نوٹ نانی کی ناک کے آگے نچاتے اور اسکول کے لڑکے کی طرح چہکتے :

”کھوسٹ بڑھیا دیکھتی ھے؟ تو کوشش کر دیکھہ اس کا دسواں حصہ بھی تجھے مل جائے تو میرے چہرے پر ناک نہیں!“

نانا نے یہ روپیہ ایک دوسرے جان پہچان‌والے کو سود پر دے دیا ــ یہ شخص بڑا لمبا تڑنگا، گنجا تھا جس کا نام پڑگیا تھا ”چابک“ ۔ اس کی ایک بہن بھی تھی، بڑی موٹی، سرخ سرخ گالوں اور کالی کالی آنکھوں‌والی ۔ اسے نانا روپیہ بھی دیتے تھے ۔ وہ دوکاندار تھی، میٹھی اور لسلسی جیسے راب!

گھر کی ایک ایک چیز بٹی ہوئی تھی ۔ آج نانی اپنے پیسے سے کھانے پینے کی چیزیں خریدتیں تو کل نانا روٹی اور کھانے پینے کی دوسری چیزیں خرید لاتے ۔ جب نانا کی باری ہوتی تو کھانا اور بھی برا ہوتا ۔ نانی اچھا گوشت خریدتیں مگر نانا انتڑیاں اور پھیپھڑے اٹھا لاتے ۔ دونوں کے پاس چائے اور شکر کا اپنا اپنا بھنڈار تھا ۔ مگر کیتلی ایک ھی تھی ۔ اس لئے ایک ھی کیتلی میں چائے کھولتی تھی ۔ نانا ڈر کر ھانک لگاتے :

”ٹھہرنا ۔ ذرا دیکھوں تو سہی، کتنی چائے ڈال دی تو نے؟“

وہ چائے کی پتیاں ھتھیلی پر پھیلاتے اور بڑی احتیاط سے ایک ایک پتی تک گنتے ۔

”تمہاری پتیاں بڑی باریک ھیں ــ میری پتیاں موٹی ھیں ۔ میری پتیوں سے زیادہ اچھی چائے بنتی ھے، اس لئے تم ذرا زیادہ پتیاں ڈالو ۔“

وہ انکھیں پھاڑ کر دیکھتے کہ نانی کی اور ان کی چائے ایک ھی رنگ کی ھے یا نہیں۔ وہ اس کا خیال رکھتے کہ نانی کہیں ایک آدھہ پیالی زیادہ تو چائے نہیں چڑھا گئیں۔

چائے کی آخری پیالی نکالتے ہوئے نانی پوچھتیں:

''آخری پیالی، ایں؟''

''ھاں، ھم آخری پیالی تو پی ھی سکتے ھیں!'' نانا کیتلی میں جھانک کر دیکھتے ہوئے کہتے۔

یسوع مسیح کے چراغ کا تیل تک دونوں باری باری سے لاتے تھے — اور یہ سارا تماشا تھا پچاس برس ایک ساتھہ خون پسینہ ایک کرنے کے بعد۔

نانا کی ان چالوں اور تماشوں میں مجھے مزا بھی آتا اور بیزاری بھی ھوتی، نانی کو یہ باتیں صرف دلچسپ معلوم ھوتیں۔

''ارے بھلا دے یہ سب!'' وہ مجھہ سے کہتیں۔ ''اس میں رکھا کیا ھے؟ بوڑھا آدمی ٹھہرا، سٹھیا گیا ھے! سوچ تو سہی — کتنی عمر ھونے کو آئی۔ اسی برس کم ھوتے ھیں کیا! سٹھیا گیا ھے تو بلا سے — کسی کا دل تو نہیں دکھاتا نا! رھی میں، سو ھمیشہ اپنی روٹی روزی کماتی رھوں‌گی، جیسے تیسے، اپنے لئے اور تیرے لئے!''

میں نے بھی پیسہ کمانا شروع کر دیا۔ اتوار کے دن صبح تڑکے ھی میں تھیلا اٹھاتا اور سڑکوں اور احاطوں سے گائے کی پرانی ھڈیاں، چیتھڑے، کیلیں اور کاغذ بٹورتا چلتا۔ کباڑیہ ھمیں چیتھڑے، کاغذ یا دھات کے ایک پوڈ کے بیس کوپک دیتا اور ھڈیوں کے ایک پوڈ کے آٹھہ دس کوپک۔

میں اسکول کے بعد ھفتے کو بھی کباڑ جمع کرتا اور ھر سنیچر کو میں کوئی تیس سے لے کر پچاس کوپک تک جمع کر لیتا (قسمت کا ستارہ چمکتا تو اس سے زیادہ بھی کھرے ھو جاتے)۔ نانی میرا پیسہ لیتیں اور جلدی سے اپنے اسکرٹ میں چھپا لیتیں اور آنکھیں جھکائے مجھے خوب شاباشی دیتیں:

''میرے لال، میرے کبوتر وبوتر، شکریہ تجھہ پر سو جان سے صدقے! ھم اب بھوکے نہیں رہ سکتے۔ کیوں؟ ذرا دیکھہ تو سہی!''

ایک دن میں دیکھتا کیا ھوں کہ وہ میرے پانچ کوپک کے سکے

کو گھور رہی ہیں اور چپکے چپکے رو رہی ہیں۔ آنسو کا ایک بڑا سا موتی ان کی اسفنجی ناک کی نوک پر چمک رہا تھا۔

لیکن میں نے دیکھا کہ کباڑ جمع کرکے بیچنے میں اتنا فائدہ نہ تھا۔ اوکا دریا کے کنارے یا جزیرہ ''پیسکی،، (''ریت،،) سے تختہ چرا کر بیچنے میں زیادہ فائدہ تھا۔ ''ریت،، ایک جزیرہ تھا جہاں سال کے سال میلہ لگتا تھا اور دھات کا کاروبار ہوتا تھا۔ وہاں میلے کے لئے وقتی طور پر لکڑی کے تختوں کی دوکانیں کھڑی کی جاتی تھیں۔ جب میلہ ختم ہو جاتا تھا تو یہ دوکانیں گرا دی جاتی تھیں اور تختوں کا انبار لگا دیا جاتا تھا جو موسم بہار میں دریا میں سیلاب کے آنے تک یونہی پڑا رہتا تھا۔ مکان‌والے شہری ہمیں ایک ایک اچھے تختے کے دس دس کوپک دیتے۔ اور ہم دن بھر میں دو دو تین تین تختے چرا لیتے۔ لیکن یہ مہم ان دنوں کی جاتی جب بارش ہوتی رہتی یا دھند چھائی رہتی۔ ایسے دنوں میں پہرےدار گھر سے نہ نکلتے۔

لڑکوں کی ایک ٹولی تھی۔ میں بھی اس میں شریک تھا۔ سانکا ویاخیر (کبوتر) دس برس کا تھا موردووی بھکارن کا بیٹا — بڑا ہی ملنسار لڑکا تھا، نیک دل اور خاموش۔ پھر لاوارث کوستروما تھا، بالکل مریل اور بےچین۔ اف کتنی بڑی بڑی کالی کالی آنکھیں تھیں اس کی۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ لڑکوں کے سدھار گھر میں پھانسی لگا کر لٹک گیا۔ وہ دو کبوتر چرانے کے جرم میں سدھارگھر بھیج دیا گیا تھا۔ تاتاری خابی تھا، بارہ سال کا رستم۔ اس میں فولادی قوت اور نیکی اور گھلاوٹ یکجا ہوگئی تھیں۔ چپٹی‌ناک والا یاز تھا، گورکن اور قبرستان کے چوکیدار کا آٹھ سالہ لڑکا، بالکل مچھلی کی طرح بےزبان اور ہمیشہ ''کالی بیماری،، کا شکار۔ پھر ایک بیوہ کا بیٹا گریشکا چورکا تھا، بڑا ہی ایمان دار اور معقول آدمی، گھونسے بازی میں کوئی اس کا ثانی نہ تھا۔ ہم سب ایک ہی کوچے میں رہتے تھے۔

ہمارے محلے میں چوری کو جرم نہیں سمجھتے تھے۔ عام طور پر حقیر قسم کے کام کاج کرنے والے نیم فاقہ کش لوگوں کے لئے پیٹ پالنے کا خاص ذریعہ تھا یہ۔ ڈیڑھ مہینے کے سالانہ میلے پر گزر بسر ممکن نہ تھا۔ بہت سے اچھے خاصے کھاتے پیتے لوگ بھی ''بہتے دریا میں ہاتھ دھو لیتے،،۔ یعنی وہ بہتے ہوئے تختے اور کندے نکال

لیتے اور سامان لانے لے جانے کے لئے لٹھوں کے بیڑے بنا لیتے - لیکن زیادہ تر وہ چوری سے اپنا کام چلاتے — والگا اور اوکا کے کنارے وہ ''بندروں کی طرح،، مال اچکتے، بیڑوں اور کشتیوں سے سامان چراتے، دریا کے کنارے جو کچھه بھی ھاتھه لگ جاتا پار کر دیتے - اتوار کے دن بڑے بوڑھے اپنے اپنے مال غنیمت کی ڈینگ مارتے اور بچے سنتے اور سیکھتے -

موسم بہار میں، میلے کی تیاریوں اور گھما گھمی کے زمانے میں، کاریگر اور دوسرے مزدور دن بھر کام کاج کے بعد پی پلا کر مست ہو جاتے اور سڑکیں ان سے لبالب بھر جاتیں - اس وقت ضلع کے چھوکرے جیب کترنے کا کاروبار شروع کر دیتے - یہ ایک ایسا دھندا تھا جو بالکل جائز سمجھا جاتا تھا اور چھوکرے بڑی ڈھٹائی سے بڑوں کو اپنا گواہ بنا کر اپنا دھندا کرتے تھے -

وہ بڑھیوں کے ھتوڑے اڑا لیتے، مستریوں کے اوزار پر ھاتھه صاف کر دیتے، گاڑی‌بانوں کے اسکرو غائب کر دیتے - ھماری ٹولی ان چیزوں پر ھاتھه نہیں ڈالتی تھی -

''میں چوری نہیں کروں گا — میری ماں جانے نہیں دیتی،، ایک دن چورکا نے اعلان کیا -

''اور میرا تو جی ھولتا ھے چوری کے خیال سے،، خابی نے کہا -

کوستروما چوروں سے بہت کٹتا تھا اور لفظ ''چور،، کچھه عجیب انداز سے ادا کرتا تھا - اگر وہ چھوکروں کو کسی شرابی کا مال اڑاتے دیکھتا تو پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ جاتا، دور تک دوڑاتا اور خوب مسرت کرتا - بڑی بڑی آنکھوں والا یہ بگڑے دل ھمیشہ بڑوں کا پوز دینے کی کوشش کرتا - وہ قلیوں کی طرح بڑا جھومتا جھامتا چلتا اور آواز میں کھرج اور بھاری‌پن پیدا کرنے کی کوشش کرتا - کبوتر کا تو خیر ایمان تھا کہ چوری گناہ ھے -

لیکن ''ریت،، سے تختے اور کھمبے پار کرنے کا شمار چوری میں نہ ھوتا تھا - ھم میں سے کسی کو بھی اس کار خیر میں ڈر نہ لگتا - ھم نے ایک خاص طریقہ ایجاد کر لیا تھا جس کی وجہ سے کام بہت آسان ھو گیا تھا - شام کے وقت یا جب دھند چھائی ھوتی تو دن کے وقت بھی، کبوتر اور یاز ''ریت،، کی طرف جاتے ھوئے برف پر

18*

نکل کھڑے ہوتے۔ وہ ڈنکے کی چوٹ جاتے، بلکہ پوری کوشش کرتے کہ چوکیدار ان کو دیکھ لیں۔ اتنے میں ہم چاروں دوسری طرف سے چھپتے چھپاتے بڑھتے۔ چوکیدار یاز اور کبوتر پر نظر رکھنے کی کوشش کرتے، ہم مقررہ جگہ پر پہنچتے تو اپنے لئے تختے چنتے۔ پھر ہمارے اگلے دستےوالے لڑکے چوکیداروں کا منہ چڑاتے اور بھا گتے۔ دوسری طرف ہم بھی واپسی کا سفر شروع کر دیتے۔ ہم میں سے ہر ایک کے پاس ایک رسی اور کانٹا ہوتا جس میں تختے کو پھنسا کر ہم برف پر گھسیٹتے ہوئے لاتے۔ چوکیداروں کی نظر شاید ہی ہم پر پڑتی۔ اگر ان کی نظر پڑتی بھی تو وہ ہمیں پکڑ نہ پاتے۔ تختوں کو بیچ کر ہم مال غنیمت کے برابر برابر چھہ حصے کرتے۔ عام طور پر پانچ چھہ کوپک فی کس کا حصہ بنتا۔

اتنے پیسے میں ہم ایک دن تو خوب پیٹ بھر کے کھا سکتے تھے۔ لیکن کبوتر اگر وادکا نہ لاتا تو اس کی ماں خوب پٹائی کرتی۔ کوستروما ایک ایک کوپک جوڑ رکھتا۔ اسے کبوتروں کے شکار کا خواب جو پورا کرنا تھا۔ چورکا کی ماں بیمار تھی۔ اس لئے وہ اپنی ماں کی ضرورت کی چیزیں خرید لاتا۔ خابی بھی پیسے بچاتا تھا تاکہ پھر شہر واپس جا سکتے جہاں سے اس کا چچا نیژنی‌نووگورود لے آیا تھا اور آنے کے بعد فوراً ہی ڈوب مرا تھا۔ خابی شہر کا نام بھول چکا تھا۔ اس کو بس اتنا یاد تھا کہ اس کا شہر دریائے والگا کے قریب کاما ندی کے کنارے آباد ہے۔

نہ جانے کیوں ہمیں اس شہر کا خیال بڑا مضحکہ‌خیز معلوم ہوتا تھا۔ ہم ترچھی نظر والے تاتاری کو چھیڑا کرتے:

ایک ہے خوبصورت شہر،
مگرنہ جانے کدھر
ادھر یا ادھر
یا کہیں آسمان پر!

شروع میں تو خابی ہم پر بہت خفا ہوتا۔ لیکن ایک بار کبوتر نے کچھہ اس طرح چمکارتے ہوئے کہا جس سے اس کے نام کا حق ادا ہوتا تھا:

''اماں یار چھوڑ بھی، چار یار کہیں آپس میں دل میلا کرتے ہیں؟!،،

تاتاری شرما گیا۔ اس نے ڈانٹ پی لی اور اس کے بعد وہ بھی کاما کے کنارے بسے ہوئے شہر کا گیت سب کے سر میں سر ملا کر گانے لگا۔

لیکن پھر بھی ہم کباڑ جمع کرنے پر چوری کو ترجیح دیتے رہے۔ بہار آئی تو یہ کام اور بھی مزیدار ہو گیا۔ برف پگھل گئی اور میلے کے خالی میدان میں پتھروں کے راستوں کو نہلانے کے لئے بادل گھر گھر کر آنے لگے۔ میلے کے نالوں میں ہمیشہ کیلیں اور دھات کے ٹکڑے وغیرہ آسانی سے مل جاتے۔ اکثر ہمیں تانبے اور چاندی کے سکے بھی مل جاتے۔ مگر چوکیداروں کے ڈنڈوں سے بچنے کے لئے اور ان سے اپنے تھیلوں کو بچانے کے لئے ہمیں چوکیداروں کو دو کوپک دینے پڑتے اور ان کے جوتوں پر پالش کرنی پڑتی۔ عام طور پر پیسہ بنانا آسان نہ تھا۔ لیکن ہم اس دھندے کے طفیل بہترین دوست بن گئے۔ کبھی کبھی ہمارا جھگڑا بھی ہوتا۔ لیکن مجھے یاد نہیں آتا کہ ہماری آپس میں کبھی سرپھٹول یا دھینگا مشتی بھی ہوئی ہو۔

کبوتر بیچ بچاؤ کرا دیتا تھا۔ وہ ہمیشہ نہ جانے وہ بول کہاں سے ڈھونڈ نکالتا جن کو سنتے ہی ہمارا غصہ کافور ہو جاتا — اس کی باتیں بڑی سیدھی سادی ہوتیں۔ لیکن یہ باتیں سن کر ہم حیران رہ جاتے اور شرم سے پانی پانی ہو جاتے۔ جب وہ یہ باتیں کہتا تو وہ خود بھی اپنی باتوں پر حیران رہ جاتا۔

''آخر تم ایسی حرکت کیوں کرو؟،، وہ پوچھتا اور ہر ایک پر یہ بات روشن ہو جاتی کہ واقعی یہ بالکل بےمعنی اور نامعقول بات ہے۔

وہ اپنی ماں کے بارے میں کہتا ''یہ میری موردووی...،، اور ہمیں اس کی بات عجیب نہ معلوم ہوتی۔

''رات یہ موردووی گھر لوٹی تو بالکل نشے میں ٹر...،، وہ ہنستا اور اس کی چھوٹی چھوٹی گول آنکھوں میں سونا چمک جاتا۔ ''دروازے

18—1705

پر ڈھیر ہوگئی اور پڑی پڑی گلا پھاڑ پھاڑ کر گانے لگی — بھیگی سرغی!،،

''کون سا گیت؟،، چورکا سنجیدگی سے پوچھتا۔

کبوتر جھٹ گھٹنوں پر تھاپ مارتا اور اونچی باریک آواز میں ماں کا گیت گانے لگتا:

سنو قدموں کی چاپ،
وہ رہا اپنا گڈریا،
اپنا ڈنڈا کھٹکھٹاتا ہوا
اور ہم بھاگے سڑک پر، ایک دو تین!
اپنا گڈریا بورکا،
ھاں یہ شام کی روشنی، یہ بورکا
بجا رہا ھے بانسری
گاؤں کے لوگ سن رہے
بانسری کی تان دل کے کان سے۔

اسے اس قسم کے بہت سے چلتے ہوئے گیت یاد تھے اور وہ یہ گیت بہت لہک کر گاتا تھا۔

''ھاں،، وہ اپنی بات کہتا رہتا۔ ''لو وہ مزے میں وھیں دروازے پر سوگئی، ٹھنڈی ھوا گھر میں آتی رھی، مارے سردی کے اپن تو بالکل قلفی ملائی برف بن گئے... اب جو کھینچا تو ماں کسی طرح ٹس سے مس نہ ھو۔ آج صبح میں نے کہا ''آخر تم اتنا زیادہ کیوں پیتی ھو؟،، ''سب ٹھیک ھے،، یہ ھے جواب۔ ''کچھہ دن اور۔ آنکھہ بند ھونےوالی ھے، پھر تو جنجال سے چھوٹ جائے گا!،،

''ھاں یہ تو سچ ھے۔ اب وہ چند دن کی مہمان ھے۔ شراب نے اس کو جلا کر رکھہ دیا ھے،، چورکا اس کی تصدیق کرتا۔

''تیرا دل تو دکھیگا نا؟،، میں نے پوچھا۔

''بےشک،، کبوتر حیرانی کے ساتھہ جواب دیتا۔ ''ماں مجھے کتنا چاھتی ھے!،،

ھم خوب جانتے تھے کہ وہ موردووی عورت اپنے بیٹے کبوتر کی خوب مرمت کرتی ھے۔ پھر بھی ھمارا خیال تھا کہ اس کی ماں

بڑے اچھے دل کی عورت ہے - کبھی کبھی جب ہمیں کم مال‌غنیمت ملتا تو چورکا کہتا:

''آؤ ہم ایک ایک کوپک نکال دیں، کبوتر کی ماں کی وادکا کے لئے، نہیں تو مفت میں اس کی کھال ادھیڑی جائے گی!،،

صرف چورکا اور میں لکھنا پڑھنا جانتے تھے - کبوتر ہم پر رشک کرتا تھا -

''جب میری موردووی چل‌بسیگی،، وہ اپنے چوہے جیسے نوکدار کان نوچتے ہوئے کوکتا ''تو میں بھی اسکول میں پڑھوں‌گا - میں استاد کے قدموں پر سر رکھه دوں‌گا اور کہوں‌گا مجھے اسکول میں لےلو - جب اسکول کی پڑھائی ختم کر لوں‌گا تو بڑے پادری کا مالی بن‌جاؤں‌گا، کون جانے خود زار کا باغبان بن جاؤں!،،

اس موسم‌بہار میں کبوتر کی ماں وادکا کی بوتل اور ایک بڈھے کے ساتھه اس دنیا سے کوچ کر گئی - بڈھا ایک نئے گرجا گھر کی تعمیر کے لئے چندہ جمع کرتا تھا - ہوا یہ کہ کندوں کا ایک ڈھیر دھڑام سے آ رہا ان کے سروں پر - عورت کو اسپتال پہنچا دیا گیا اور چورکا نے کبوتر سے کہا:

''چل تو میرے ساتھه رہ - ماں تجھے پڑھنا سکھا دے گی!،،

چند دن بعد کبوتر چلتے چلتے سڑک پر ایک دوکان کے سامنے یکایک رک گیا -

''بطاسی کی دوکان،، اس نے بڑے غور سے سر اٹھا کر پڑھا -

''بساطی! ابے الو بساطی!،، چورکا نے اس کی اصلاح کی -

''میں جانتا ہوں مگر یہ حفر ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو جاتے ہیں - کم‌بخت - ،،

''حفر نہیں حرف!،،

''حرف بالکل اچھلنے اور ناچنے لگتے ہیں... کوئی پڑھتا ہے تو خوشی سے پھولے نہیں سماتے - ،،

اس کو درختوں اور گھاس سے اتنی محبت تھی کہ میں تو اس کا یہ لگاؤ دیکھه کر حیران رہ جاتا -

ہمارا محلہ ریت سے بھرا ہوا تھا - اس لئے وہاں ہریالی بہت کم تھی - احاطے میں کہیں کہیں مرجھاتے ہوئے بید کے درخت،

جھاڑ جھنکاڑ، رس‌بھریوں کی سڑی اور الجھی ہوئی جھاڑیاں یا چہار دیواری کے پیچھے چھپی ہوئی سوکھی گھاس دکھائی دیتی تھی۔ اگر ہم میں سے کوئی گھاس پر بیٹھ جاتا تو کبوتر فوراً ہماری جان کو آجاتا:

''آخر گھاس کو روندنے میں تم لوگوں کو کیا مزاآتا ہے؟ کیا تم ریت پر نہیں بیٹھ سکتے، ایں؟ تمہارے لئے تو ایک ہی بات ہوئی!،،

جب وہ ساتھ ہوتا تو ہم اس کے ڈر کے مارے دریائےاوکا کے کنارے ایک جنگلی پھول کو بھی ہاتھ نہ لگاتے، نہ کسی جھاڑ جھنکاڑ سے کوئی ڈنڈا کاٹتے۔

''شیطانو، تم لوگ چیزیں کیوں بگاڑتے رہتے ہو؟،، وہ حیرانی سے شانے ہلاتے اور ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہتا۔

اور یہ حیرانی ہمیں شرمندہ کر دیتی۔

سنیچر کو جو کھیل کود کا پروگرام ہوتا اس کے لئے ہم پورے ہفتے چھال کے پرانے سینڈل ڈھونڈتے رہتے۔ سنیچر کی شام کو جب تاتاری قلی سائبیریائی بندرگاہ کو چھوڑ کر جانے لگتے تو ہم کسی نکڑ پر چھپ جاتے اور ان پر سینڈل برساتے۔ شروع میں تو وہ بہت بھڑکے۔ وہ گالیاں بکتے اور ہمیں رگیدتے۔ لیکن پھر وہ خود بھی کھل کھیلے۔ آنےوالی جنگ کے خیال سے وہ بھی چھال کی پرانے سینڈلوں سے لیس ہوکر آتے۔ کئی بار تو وہ ہمارے اسلحہ خانے سے ہتھیار چرا لے گئے۔ وہ ٹوہ میں رہتے تھے کہ ہم نے اپنے ہتھیار کہاں چھپائے ہیں۔ مگر ہم نے کہا اس کی سہی نہیں۔

''یہ تو کھیل نہ ہوا!،، ہم نے شکایت کی۔

وہ چرائے ہوئے مال کو دو حصوں میں بانٹتے اور پھر دونوں طرف سے چاند ماری ہوتی۔ عام طور پر یہ ہوتا کہ وہ کسی کھلی جگہ اپنا مورچہ جماتے اور ہم ان کے چاروں طرف چیختے اور ناچتے اور اپنے بم ان پر پھینکتے۔ وہ چیختے چنگھاڑتے اور جب ہم میں کسی پر سینڈل برستے اور چوٹ کھانے والا اپنی ناک ریت میں گھسیڑتا تو حملہ‌آور خوب زور زور سے قہقہے لگاتے۔

بعض مرتبہ تو اندھیرا چھا جاتا مگر کھیل چالو رہتا۔ چھوٹے

چھوٹے کاروباری کسی نکڑ سے ہمارا تماشا دیکھتے اور شرافت کی دھائی دے دے کر ڈانٹتے ڈپٹتے۔ مگر سینڈل غبارآلود پرندوں کی طرح ہوا میں پرواز کرتے رہتے۔ کبھی کبھی ہماری فوج کے کسی سپاہی سے زنائےدار سینڈل ٹکراتا۔ مگر طاقت آزمائی کے جوش میں درد اور چوٹ کی تکلیف کا احساس بھی نہ ہوتا۔

تاتاری بھی ہماری طرح جوش میں آجاتے۔ جب جنگ ختم ہو جاتی تو ہم کبھی کبھی ان کے ساتھہ گھر جاتے۔ وہاں ہماری خاطر تواضع گھوڑے کے گوشت سے ہوتی۔ گوشت کے ساتھہ عجیب و غریب قسم کی ترکاری بھی ملتی۔ اس کے بعد چائے اور کیک کا دور چلتا۔ ہم ان دیوھیکل لوگوں پر جان دیتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک دوسرے سے بڑا دیو معلوم ہوتا تھا۔ ان کی طبیعتوں میں کوئی چیز بڑی سادہ تھی، بچوں کے بھولپن والی بات! ان کی ایک ادا سب سے زیادہ میرے دل کو بھاتی تھی۔ کسی بات پر وہ اپنا دل میلا نہ کرتے۔ سب کے سب دل کے بڑے نیک تھے اور ایک دوسرے کو آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔

سارے تاتاری خوب قہقہے لگاتے، ہنسنے پر آتے تو کوئی طاقت ان کی ہنسی کو روک نہ پاتی — ہنستے ہنستے ان کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑتے۔ ان میں سے ایک کاسیموف کا اجڈ اور اکھڑ دیہاتی تھا۔ اس کی ناک شہید ہو چکی تھی مگر طاقت میں دیو تھا۔ ایک دن تو اس نے اکیلے گرجے کے لئے ستائس پوڈ بھاری گھنٹہ جہاز سے اٹھایا اور دریا کے کنارے تک لے آیا۔ وہ ہنستے ہنستے بھونکنے لگتا اور مستقل چیختا رہتا:

''او او او! او او او! بول ایک چڑیا ہے۔ بول کیا سنا — ایک چڑیا پکڑی! سنہری چڑیا!،،

ایک دن اس نے کبوتر کو اپنی ہتھیلی پر بٹھایا اور ہوا میں اٹھا لیا۔

''جاؤ بیٹا آسمان پر، جاؤ!،، اس نے کہا۔

جس دن پانی برستا ہم قبرستان کے پاس چھوٹے سے گھر میں اکٹھے ہوتے جہاں یاز اپنے باپ کے ساتھہ رہتا تھا۔ اس کے باپ کی کمر دوہری ہو گئی تھی۔ وہ بڑا میلا کچیلا نظر آتا۔ پہ لمبے لمبے

تو اس کے بازو تھے۔ اس کے سر اور چہرے پر چکٹ بال انکڑوں کی طرح نظر آتے۔ اس کا سر گردن کی جھری دار کھال پر شلجم کی طرح ٹکا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ وہ بڑی سرشاری کے عالم میں آنکھیں میچ لیتا اور جلدی جلدی بڑبڑاتا:

''یاپروردگار اپنی پناہ میں رکھ اور بےخواب راتوں سے بچا! اووو!،،

ہم تھوڑی سی چائے، شکر، روٹی اور یاز کے باپ کے لئے ذرا سی وادکا بھی خریدتے۔

''ابے گنوار، سماوار تو کھول!،، چورکا حکم دیتا۔

گنوار ہنستا اور حکم کی تعمیل کرتا۔ جب تک جب تک پانی کھولتا ہم اپنے معاملات پر بات چیت کرتے اور وہ ہمیں صلاح دیتا:

''ذرا چوکس رہیو — دیکھنا پرسوں تروسوف کے ہاں فاتحہ اور کھانا ہے — وہاں بہت سی ہڈیاں ہوں گی!،،

''ارے تروسوف کی باورچن آپ ہی ہڈیاں سنگارتی ہے!،، چورکا کہتا جسے پورے عالم غیب کا علم تھا۔

''اب جلد ہی موسم اچھا ہوگا۔ ہم جنگل جا سکیں گے!،، کبوتر کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے کہتا۔

یاز کبھی کبھار ہی زبان کھولتا۔ وہ بڑی اداس اور بے جان آنکھوں سے ہمیں گھورتا اور کوڑے کے ڈھیر سے اکٹھے کئے ہوئے کھلونے دکھاتا — لکڑی کا سپاہی، ٹانگوں سے محروم گھوڑا، بٹن اور پیتل کے ٹکڑے۔

اس کا باپ میز پر بھانت بھانت کی پیالیاں سجاتا اور سماوار اندر لاتا۔ کوستروما چائے نکالتا۔ بڈھا اپنی وادکا انڈیلتا گلے میں اور تندور پر چڑھ جاتا۔ وہاں سے وہ الو جیسی آنکھوں سے ہمیں گھورتا اور بڑبڑاتا:

''تم سب پر خدا کی مار — تم انسان ہو، ایں؟ تھو! چوٹٹوں کا گروہ۔ یا پروردگار اپنی پناہ میں رکھ اور ہمیں بےخواب راتوں سے بچا!،،

''مگر ہم چور کب ہیں!،، کبوتر کہتا۔

''چور نہیں تو ننھے منے چور تو ہو ہی تم۔،،

جب یاز کا باپ اپنی جھک سے ہماری ناک میں دم کر دیتا تو چورکا گرجتا:

''ابے او بڈھے گنوار، بند کر زبان!''

جب بڈھا محلے کے تمام بیماروں کے نام انگلیوں پر گنواتا اور اندازہ لگاتا کہ ان میں سے کون پہلے اللہ کو پیارا ہوگا تو اس کی باتوں سے سجھیے، کبوتر اور چورکا کو بڑی وحشت ہوتی۔ بڈھا اس خیال سے ہونٹ چاٹتا نظر آتا۔ اسے ذرا بھی رحم نہ آتا۔ جب وہ دیکھتا کہ ہم اس کی باتوں سے بیزار ہیں تو وہ جان بوجھ کر چڑاتا:

''اخاہ! ارے تم ڈر رہے ہو، شیطانو! ایک بہت بڑا توندو بہت جلد اس دنیا سے کوچ کرنے والا ہے۔ مگر اسے سڑتے دیر تھوڑی لگیگی!''

ہم اس کو روکتے مگر وہ قابو میں کب آنے والا تھا۔

''تمہاری باری بھی جلد ہی آئے گی! کوڑے کے ڈھیر پر جینے والے کیا کھا کر زیادہ جیئیں گے!''

''اچھا اچھا، ہم مرجائیں گے اور آسمان والے ہمیں فرشتہ بنا دیں گے!'' کبوتر کہتا۔

''تم؟ فرشتے؟'' یاز کا باپ حیران ہوتا اور اس کے منہ سے قہقہے پھٹ پڑتے۔ پھر وہ مردوں کی بھیانک کہانیاں سنا سنا کر ہمیں ستاتا رہتا۔

لیکن بعض مرتبہ دبی دبی سی بھنبھناتی ہوئی آواز میں عجیب عجیب باتیں کہنے لگتا:

''سنو، یارو، پرسوں کی بات ہے۔ ایک عورت قبر میں سلا دی گئی۔ ان کی کہانی بھی عجیب ہے۔ میں نے سب معلوم کر لیا۔ بتاؤ کیا سمجھے؟..''

وہ اکثر عورتوں کا ذکر بھی چھیڑ دیتا۔ ہمیشہ بڑی گھناؤنی باتیں کرتا عورتوں کے بارے میں۔ مگر اس کی کہانیوں میں ایک فریاد، ایک سوال ضرور پوشیدہ رہتا تھا۔ جیسے ہم سے التجا کر رہا ہو — لوگو سوچنے میں میرا ساتھ دو، ہاتھ بٹاؤ۔ ہم بڑے غور سے سنتے۔ وہ رک رک کر بولتا۔ اکثر سوال کرنے کو رک جاتا۔ لیکن وہ جو کچھ کہتا اس میں سے کچھ حصہ تو پھانس کی طرح ہمارے حافظے میں چبھ کر رہ جاتا:

''کس نے لگائی آگ؟،، اس عورت سے پوچھا گیا۔ ''میں نے،، اس نے جواب دیا۔ ''کیسے بیوقوف؟ تم اس رات هسپتال میں تهیں۔ ،، وہ دوهراتی هے ''کہہ جو رهی هوں میں نے لگائی آگ!،، بتاؤ آخر اس نے ایسی بات کیوں کہی؟ اے پروردگار همیں بےخواب راتوں سے بچا!،،

وہ قریب قریب ان تمام لوگوں کی زندگی کی کہانی جانتا تها جن کی قبریں اس نے قبرستان میں کهودی تهیں۔ جب وہ بولتا تو ایسا لگتا جیسے اس نے هم پر تمام ارد گرد مکانوں کے در کهول دئے هیں اور هم سب ان مکانوں میں گهس گئے هیں اور مکینوں کی زندگی کا تماشہ دیکهہ رهے هیں۔ همیں اس پورے تماشے میں کسی مقدس اور اهم بات کا احساس رهتا۔ همیں لگتا کہ وہ صبح هونے تک اسی طرح باتیں کر سکتا هے۔ لیکن جیسے هی کهڑکی سے اندهیرا جهانکتا چورکا میز سے اٹهتا اور کہتا:

''میں گهر چلا — ماں گهبرا رهی هوں‌گی۔ اور کون چلتا هے میرے ساتهہ؟،،

هم سب اس کے ساتهہ هی چلے جاتے۔ یاز چہاردیواری تک همارے ساتهہ آتا، پهاٹک کا تالا لگاتا اور خدا حافظ کہتے هوئے اپنا سانولا هڈیالا چہرہ سلاخوں پر رکهہ دیتا۔ اور دبی دبی آواز میں کہتا:

''خدا حافظ!،،

هم بهی چلاتے ''خدا حافظ!،، اسے قبرستان میں چهوڑتے هوئے همارے دل میں کچهہ عجیب سا احساس جا گتا۔ ایک بار شام کو کوستروما مڑا اور بولا:

''دیکهنا ایک دن جو هماری آنکهہ کهلیگی تو معلوم هوگا وہ تو چل بسا۔ ،،

چورکا اکثر دعوی کرتا کہ یاز کا حال تو هم سے بهی زیادہ پتلا هے مگر کبوتر همیشہ اختلاف کرتا:

''همارا حال تو بالکل پتلا نہیں...،، اور میں اس سے اتفاق کرتا۔ مجهے سڑکوں اور کوچوں کی آزاد زندگی میں بہت مزا آتا تها۔ مجهے اپنے ساتهیوں سے محبت تهی۔ هماری یاری نے میرے دل میں

ایک نیا احساس جگایا۔ میرا جی چاہتا کہ ان کے کام آؤں، ان کو فائدہ پہنچاؤں۔

پھر اسکول میں مجھے مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لڑکے مجھے آوارہ اور کباڑیا کہہ کر پکارنے لگے۔ ایک بار جو جھگڑا ہوا تو لڑکوں نے استاد سے شکایت کر دی کہ میرے جسم سے کوڑے کی اتنی تیز بو آتی ہے کہ میرے پاس بیٹھنا نا ممکن ہے۔ مجھے یاد ہے اس بات سے کیسا دھچکا لگا تھا میرے دل کو اور اس کے بعد دوبارہ اسکول میں قدم رکھنا میرے لئے کتنا مشکل تھا۔ یہ شکایت محض من گھڑت اور ذلیل جھوٹ تھی۔ میں ہر صبح خوب اچھی طرح منہ ہاتھہ دھوتا تھا اور کبھی بھی ان کپڑوں میں اسکول نہیں جاتا جن میں کوڑے کے ڈھیر چھانتا تھا۔

آخر میں نے دوسری جماعت کا امتحان پاس کر لیا۔ اچھے کام کے انعام میں مجھے انجیل کی ایک جلد، کریلوف کے قصوں کی ایک جلد اور ایک کتاب ملی جس پر جلد نہ تھی۔ اس کا نام تھا ''فاتامرگانا،،۔ اس کے ساتھہ مجھے تعریفی پروانہ بھی ملا۔ جب میں یہ سارے تحفے گھر لایا تو نانا بہت خوش ہوئے اور ان پر بڑا رعب پڑا۔ انہوں نے اعلان کیا کہ ہمیں کتابوں کی حفاظت کرنی چاہئے۔ انہوں نے کہا کہ اس خیال سے میں کتابیں اپنے صندوق میں بند کر دونگا۔ کئی دن نانی بیمار رہیں۔ ان کا ہاتھہ بالکل خالی تھا۔ نانا کراہتے اور غراتے:

''تم لوگ مجھے تباہ کرکے رہوگے۔ تم لوگ مجھے کھائے جا رہے ہو۔،،

اس لئے میں نے کتابیں اٹھائیں اور بچپن کوپک میں کتابوں کی دوکان پر بیچ آیا۔ میں نے پیسے نانی کو دے دئے۔ تعریفی پروانے پر اوٹ پٹانگ لکھہ کر اس کا حلیہ بگاڑ دیا اور اس کے بعد نانا کے حوالے کر دیا۔ انہیں میری کارستانی کا پتہ نہیں چلا اور انہوں نے اسے حفاظت سے رکھہ دیا۔

جب اسکول ختم ہوتا تو میں گلی کوچوں کی زندگی کی طرف لوٹ جاتا۔ بہار جو آئی تو اس زندگی کا جادو اور بھی زوروں سے دل پر چل گیا۔ اب ہم پہلے سے زیادہ پیسے بناتے۔ اتوار کو ہمارا

پورا قافلہ کھیتوں، میدانوں اور جنگلوں کی طرف نکل جاتا۔ جب ہم رات بھیگتے لوٹتے تو ہمارے بدن میں میٹھا میٹھا درد تیرتا رہتا اور ہم ایک دوسرے سے اور قریب ہو جاتے۔

مگر یہ زندگی زیادہ دنوں قائم نہ رہ سکی۔ میرے سوتیلے باپ کو نوکری سے ہاتھ دھونا پڑا اور وہ پھر کہیں چلا گیا۔ ماں اور میرے چھوٹے بھائی کو نانا کا آسرا لینا پڑا۔ نانی ایک مالدار سوداگر کے گھر رہنے چلی گئی تھیں۔ وہ سوداگر کے لئے "یسوع مسیح کے تابوت" کے ایک غلاف پر کڑھائی جڑائی کا کام کر رہی تھیں۔ اس لئے مجھے بچے کی کھلائی کا فرض انجام دینا پڑا۔

میری خاموش اور بجھی ہوئی ماں کو شاید ہی کبھی قدم اٹھانے کی سکت ہوتی۔ میرے بھائی کے ٹخنوں میں ناسور ہو گئے تھے۔ وہ اتنا نڈھال ہو گیا تھا کہ اس میں رونے کی بھی سکت نہ رہی تھی۔ اسے بھوک لگتی تو بڑے دردناک انداز سے کراہتا۔ جب وہ بھوکا نہ ہوتا تو اونگھتا رہتا، ٹھنڈی سانس لیتا رہتا اور بلی کی طرح خرخرایا کرتا۔

"اسے اچھی غذا چاہئے۔ مگر میں تم سب کے لئے کہاں سے لاؤں کھانا؟" ایک دن نانا نے بچے کو غور سے دیکھ دا کھہ کر کہا۔

ماں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا:

"مگر کون سا اسے سنوں کھانا چاہئے!"

"اسے اتنا سا... اسے اتنا سا... ملا کر کتنا سارا ہو جاتا ہے۔ ایں؟"

نانا نے بیزاری سے ہاتھ جھٹک کر جواب دیا اور میری طرف مڑے۔

"نکولائی کو باہر دھوپ میں رکھنے کی ضرورت ہے۔ دھوپ میں، ریت پر..."

میں ایک بورا بھر کر صاف اور سوکھی ریت لایا اور اسے کھڑکی کے نیچے دھوپ والی جگہ پر رکھ دیا۔ پھر میں نے اپنے بھائی کو گردن تک ریت سے ڈھک دیا۔ نانا کا یہی حکم تھا۔ بھائی ریت میں دفن بیٹھا رہتا اور پلکیں جھپکاتے ہوئے مجھے حیران کن

آنکھوں سے دیکھتا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کی آنکھوں میں نیلی پتلیوں کے سوا کچھ نہیں جو نیلگوں ہالے سے گھری ہوئی تھیں۔

مجھے اپنے بھائی سے بڑی محبت ہو گئی۔ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے وہ میرے دل کی ساری باتیں سمجھتا ہے۔ میں گھنٹوں اس کے پہلو میں کھڑکی کے سائے میں بیٹھا رہتا۔ کھڑکی سے نانا کی چچیاتی ہوئی آواز مستقل آتی رہتی:

''مرنا کون سا تیر مارنا ہوا۔ اصل چیز تو یہ ہے کہ انسان کو جینے کا ڈھنگ آئے۔ اب...''

عام طور پر اس کے بعد ماں پر کھانسی کا دورہ پڑتا جو دیر تک قابو میں نہ آتا۔

نکولائی اپنے بازو ریت سے چھڑا لیتا اور پیلے سر کو ہلاتے ہوئے میری طرف بڑھا دیتا۔ اس کے بال بڑے باریک اور روپہلے سے تھے۔ اس کا چہرہ بڑے بوڑھوں جیسا تھا جس سے بڑی ہوشیاری ٹپکتی تھی۔

اگر بلی یا کوئی چوزہ پاس آتا تو نکولائی اس کو بڑے غور سے دیکھتا اور بڑی مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف مڑتا۔ اس مسکراہٹ سے میرا دل دھک سے ہو جاتا۔ کہیں میرا بھائی یہ تو نہیں بھانپ گیا کہ میں اس کے پاس بیٹھا بیٹھا کتنی کوفت اور اکتاہٹ محسوس کر رہا ہوں۔ کیا وہ جانتا ہے کہ میرا دل اسے چھوڑ کر بھاگ جانے اور گلی کوچوں میں اپنے یاروں سے ملنے کو مچل رہا ہے؟

احاطہ چھوٹا سا تھا اور ہر قسم کے کوڑے کباڑ سے بھرا ہوا۔ ڈربوں وغیرہ کا سلسلہ جو پھاٹک سے شروع ہوتا تھا احاطے کے پچھواڑے میں حمام تک پھیلتا چلا گیا تھا۔ چھتوں پر تختوں، کندوں، سیلی لکڑیوں اور کشتیوں کے ٹوٹے پھوٹے تختوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ یہ وہ مالِ غنیمت تھا جو بہار کے سیلاب میں دریائے اوکا سے نکالا گیا تھا۔ پورا احاطہ دریا کا پانی پی کر پھولی ہوئی لکڑیوں سے بھرا ہوا تھا۔ جب گرم دھوپ چمکتی تو لکڑیوں کی بدبو سے سر پھٹنے لگتا۔

پڑوس ہی میں ایک چھوٹا سا مذبح تھا۔ قریب قریب ہر صبح بچھڑوں کی ڈکار اور بھیڑوں کی ممیاہٹ سنائی دیتی۔ خون کی تیز بو

ہوا میں اس طرح بس جاتی کہ مجھے لگتا جیسے گردآلود ہوا میں سرخ جال تھر تھرا رہا ہے۔

جب سینگوں کے بیچ کلہاڑی کے وار سے جانور ٹھنڈا کر دیا جاتا اور اس کی چیخ سٹ جاتی تو نکولائی کے تیور پر بل پڑ جاتے اور اس کے ہونٹ مڑ جاتے جیسے وہ جانوروں کی آواز کی نقل اتارنے کی کوشش کر رہا ہو۔ لیکن اس کے منہ سے ''فو فو،، کے سوا اور کوئی آواز نہ نکلتی۔

دوپہر کے وقت نانا کا سر کھڑکی سے جھانکتا اور پکار سنائی دیتی:

''کھانا!،،

وہ بچے کو گھٹنوں پر بٹھاتے، روٹی اور آلو خود چباتے پھر اس کا نوالہ بنا کر بچے کے چھوٹے سے منہ میں ٹھونستے۔ اس کا منہ اور نکیلی ٹھوڑی لت پت ہو جاتی۔ جب تھوڑا سا کھانا اس کے گلے سے اتر جاتا تو نانا اس کی قمیص اٹھاتے اور اس کا پھولا ہوا پیٹ دبا کر دیکھتے اور کہتے:

''جانے کافی ہوگا یا نہیں؟ کیوں تھوڑا سا اور؟،،

''دیکھتے نہیں — وہ روٹی کی طرف ہاتھ بڑھا رہا ہے!،، میری ماں اندھیرے کونے سے پڑی پڑی کہتیں۔

''بچہ خود کہہ نہیں سکتا کہ اس کا پیٹ بھر گیا ہے!،،

لیکن وہ ایک نوالہ اور اس کے منہ میں ڈال دیتے۔ کھانے کا یہ طریقہ دیکھ کر میں زمین میں گڑ جاتا۔ کوئی چیز میرے گلے میں چبھتی ہوئی گلا گھونٹتی ہوئی معلوم ہوتی۔

''اچھا،، آخر نانا کہتے۔ ''اب اسے ماں کے پاس لے جاؤ۔،،

جب میں نکولائی کو بازوؤں میں لیتا تو وہ سنمناتا اور میز کی طرف ہاتھ بڑھاتا۔ ماں اتنی دبلی ہوگئی تھیں کہ بالکل چیڑ کا درخت معلوم ہوتیں جس کے پتے جھڑ گئے ہوں۔ وہ اٹھتیں اور میری طرف لمبے لمبے ہڈیالے بازو بڑھاتیں۔

وہ کبھی کبھار ہی کچھ بولتی تھیں۔ جو دوچار باتیں وہ بولتیں تو وہ بھی ان کے متلاطم سینے میں چٹختی ہوئی معلوم ہوتیں۔ دن بھر وہ کونے میں چپ چاپ پڑی گھلتی رہتیں۔ میرا دل کہتا

تھا کہ وہ سر رہی ہیں۔ میرے نانا نے یہ بات اور بھی صاف کر دی تھی۔ وہ باربار پوری ہٹ دھرمی سے موت کا ذکر چھیڑ دیتے خاص طور پر شام کو جب ہوا بدبو اور سڑاند سے بوجھل ہو جاتی۔

نانا کا بستر کونے میں قریب قریب یسوع مسیح کی شبیہوں کے سائے میں تھا۔ ان کا سرہانا کھڑکی کی طرف تھا۔ سونے سے پہلے وہ بڑبڑاتے رہتے:

''خیر۔ موت کی گھڑی آ گئی۔ واہ ہم اپنے خالق کے سامنے کیا منہ لے کر جائیں گے! ہم کہیں گے کیا؟ گویا میں زندگی بھر پلنگ ہی تو توڑتا رہا ہوں — میں نے ہمیشہ کچھ نہ کچھ کیا ہے۔ اور دیکھ لو اس کا انجام!،،

میں تندور اور کھڑکی کے درمیان فرش پر سوتا تھا۔ یہ جگہ میرے لئے بہت تنگ تھی اور مجھے ٹانگیں تندور کے نیچے پھیلانا پڑتی تھیں جہاں تل چٹے میرے پنجوں کو چاٹا کرتے۔ لیکن یہاں لیٹے لیٹے جو کچھ میں دیکھتا اس سے دل کو کچھ تسکین ہو جاتی۔ تکدرآمیز تسکین! کھانا پکانے کی کوشش میں نانا ہمیشہ کریدنی کے لمبے ڈنڈے سے کھڑکی کا شیشہ توڑتے رہتے۔ تندور سے کھانے کے برتن تو وہ اسی ڈنڈے سے کھینچتے تھے نا۔ یہ بات بڑی عجیب اور مضحکہ‌خیز معلوم ہوتی تھی کہ نانا اتنے کائیاں ہیں مگر انہیں دوسرا سرا کاٹنے کی بات کیوں نہ سوجھی۔

ایک دن جب کوئی چیز تندور سے ابلنے لگی تو انہوں نے ڈنڈے کو اتنے زور سے جھٹکا دیا کہ تندور میں رکھی ہوئی ہانڈی الٹ گئی اور کھڑکی کے دو شیشے بھی شہید ہو گئے۔ یہ اتنی بڑی بپتا تھی کہ بڑے میاں فرش پر ڈھیر ہو گئے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

''اے پروردگار، اے پروردگار،، وہ چلائے۔

جب وہ گھر سے باہر گئے تو میں نے چھری اٹھائی اور ڈنڈوں کا سرا کاٹ کر پھینک دیا۔

''لعنت ہو، پھٹکار ہو!،، نانا گھر لوٹے تو میری کارستانی دیکھ کر چیخے۔ ''آرے سے کاٹنا چاہئے تھا ابے سنا؟ آرے سے کاٹنا

چاهئے تھا! لکڑی سے بیلن بنا لیتے، ان کو بیچ دیتے! خدا کی لعنت ہو، کیسا خاندان پایا ہے میں نے!،،

''تو ھاتھہ نہ لگایا کرے چیزوں کو تو اچھا ہو،، جب نانا دوڑتے ہوئے زینے کی طرف گئے تو میری ماں نے کہا۔

ماں اگست میں اتوار کو دوپہر کے وقت چل بسیں۔ میرا سوتیلا باپ اپنی سیاحی سے حال ھی میں لوٹا تھا۔ پھر اسے کام مل گیا تھا۔ نانی اور نکولائی اس کے چھوٹے سے صاف ستھرے گھر میں آبسے تھے۔ یہ گھر اسٹیشن سے ملا ہوا تھا۔ اگلے دو تین ھفتے میں وہ لوگ میری ماں کو لے جانے والے تھے۔

جس دن ماں مریں انہوں نے صبح کو مجھہ سے بڑی مدھم مگر صاف آواز میں کہا:

''جاؤ، ایوگینی واسیلیوچ سے کہو میں ان سے ملنا چاھتی ہوں!،،

وہ دیوار کے سہارے بیٹھہ گئیں۔

''جلدی، بھاگ کر جا...،، وہ پھر تکیے پر ڈھیر ہوگئیں۔ مجھے لگا جیسے وہ مسکرا رھی ھیں اور ان کی آنکھوں میں ایک نیا نور جھلملا رھا ہے۔ سوتیلا باپ گرجا گھر میں تھا۔ نانی نے مجھے یہودن کے ھاں نسوار لینے کو بھیجا۔ یہودن کے ھاں نسوار تیار نہ تھی۔ وہ تمباکو کوٹ کر نسوار بناتی رھی اور میں انتظار کرتا رھا۔

جب آخرکار میں نانا کے گھر لوٹا تو میں نے دیکھا کہ ماں میز کے کنارے صاف ستھرے بنفشئی لباس میں بیٹھی ھیں۔ ان کے بال میں بڑی احتیاط سے کنگھا کیا گیا تھا۔ ان کے چہرے سے وھی پہلے والا غرور ٹپک رھا تھا اور تیور چڑھے ہوئے تھے۔

''جی اچھا لگ رھا ہے؟،، میں نے نہ جانے کیوں شرماتے ہوئے پوچھا۔

''یہاں آ،، انہوں نے بپھری ہوئی نگاھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کہاں مارا پھر رھا تھا تو، ایں؟،،

ابھی میں نے جواب بھی نہیں دیا تھا کہ انہوں نے میرے بال دبوچ لئے، مڑنے والا لمبا چاقو میز سے اٹھایا اور دستے سے مجھے مارنا شروع کیا۔ آخر چاقو ھاتھہ سے چھوٹ کر گر گیا۔

''اٹھا چاقو! لا مجھے دے!،،

میں نے چاقو اٹھایا اور میز پر رکھ دیا۔ ماں نے مجھے دھکا دیا اور میں تندور کے کنارے بیٹھ گیا۔ وہاں سے میں ان کو خوف‌زدہ نظروں سے دیکھتا رہا۔

وہ کرسی سے اٹھیں اور آہستہ آہستہ کونے کی طرف چلیں، بستر پر لیٹیں اور منہ سے پسینہ پونچھنے لگیں۔ ان کا ہاتھ بےجان سا حرکت کر رہا تھا۔ ان کا ہاتھ دو بار بڑے نڈھال انداز سے تکیے پر گرا اور رومال ان کی انگلیوں میں پھڑپھڑاتا رہا۔

''پانی۔،،

میں نے بالٹی سے ڈونگا بھر پانی نکالا۔ انہوں نے مشکل سے سر اٹھاتے ہوئے ایک گھونٹ پانی پیا، ٹھنڈے ہاتھ سے مجھے دور ہٹایا اور ٹھنڈی سانس لی۔ انہوں نے کونے میں رکھی ہوئی مقدس شبیہوں پر نگاہ ڈالی۔ پھر میری طرف دیکھا۔ مجھے لگا جیسے مسکرا رہی ہوں۔ اور پھر ان کی لمبی لمبی پلکیں دھیرے دھیرے ان کی آنکھوں پر گر گئیں۔ ان کی کہنیاں پہلوؤں میں چھپی ہوئی تھیں۔ ان کے ہاتھ سینے پر پھسلتے ہوئے گلے کی طرف بڑھے۔ ان کے چہرے پر ایک سایہ سا چھایا پھر دور ہو گیا۔ ان کی زرد جلد تن سی گئی اور ناک اور تیکھی ہو گئی۔ ان کا منہ حیرانی سے کھلا لیکن سانس نہ آئی۔

کئی صدیاں گزر گئیں اور میں ہاتھ میں پانی کا ڈونگا لئے وہیں کھڑا رہا۔ میں نے ماں کے چہرے کو سخت اور نیلا پڑتے دیکھا۔

نانا اندر آئے۔

''ماں مر گئیں،، میں نے کہا۔

''کیوں واہی تباہی بک رہا ہے؟،، انہوں نے بستر پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

پھر وہ تندور کی طرف گئے اور ڈنڈے سے سموسے الٹنے اور پھیرنے لگے۔ ڈنڈے اور توے کی ٹکر سے بڑی بھیانک جھنکار پیدا ہوئی۔ میں ان کو دیکھتا رہا، اس احساس کے ساتھ دیکھتا رہا کہ ماں مرچکی ہیں۔ اور میں اس وقت کا انتظار کرتا رہا جب انہیں بھی اس کا یقین آئے گا۔

سوتیلے باپ نے اندر قدم رکھا۔ وہ کینوس کے کوٹ اور سفید ٹوپی میں تھا۔ اس نے خاموشی سے کرسی لی اور اسے گھسیٹتے ہوئے ماں کے پلنگ کے پاس گیا۔ یکایک اس نے کرسی پٹک دی اور پیتل کے باجے کی طرح چیخا:

''مر گئی! دیکھو!،،

نانا کی آنکھیں نکل پڑیں اور ڈنڈے سمیت لڑکھڑاتے ہوئے ماں کے بستر پر جھک گئے۔

جب میری ماں کی قبر میں سوکھی ہوئی ریت بھری جا چکی تو نانی دوسری قبروں کے درمیان اندھے کی طرح بھٹکنے لگیں۔ وہ ایک صلیب سے ٹکرا گئیں اور ان کا چہرہ زخمی ہو گیا۔ یاز کا باپ ان کو اپنے گھرلے گیا۔ نانی زخم دھو رہی تھیں اور یاز کا باپ میرے کانوں میں ڈھارس بندھانے کی باتیں کہہ رہا تھا۔

''پروردگار ہمیں بےخواب راتوں سے بچا! کیا ہوا ہے تجھے؟ ایسی باتوں کو دل میں نہیں رکھتے۔ کیوں نانی؟ غریب ہوں یا امیر — سب ہی ایک دن خاک میں ملتے ہیں۔ کیوں نانی؟،،

اس نے کھڑکی سے کچھ دیکھا اور یکایک گھر سے باہر بھاگا۔ لوٹا تو اس کا چہرہ دمک رہا تھا اور کبوتر اس سے چپکا ہوا تھا۔

''دیکھو،، بڈھے نے ایک ٹوٹی ہوئی مہمیز دکھاتے ہوئے کہا۔ ''دیکھنا کیسی چیز ملی ہے! میں اور کبوتر تجھے تحفے میں دے رہے ہیں یہ۔ دیکھتے ہو کیا بڑھیا پہیہ ہے! ایں؟ یقین مانو یہ کسی کزاک کے جوتے سے ٹوٹ گرا ہوگا۔ میں کبوتر سے خریدنا چاہ رہا تھا۔ میں نے کہا دو کوپک لےلو...،،

''جھوٹ کیوں بک رہے ہو؟،، کبوتر بڑبڑایا اور یاز کا باپ میرے سامنے پھدکتا اور آنکھ مارتا رہا۔

''کبوتر بھی کیا بلا ہے، ایں؟ اس کے آگے کسی کی دال نہیں گلتی! خیر - میں نہیں — کبوتر دے رہا ہے یہ تحفہ تجھے... وہ...،،

جب نانی منہ دھو چکیں تو انہوں نے اپنے نیلے اور سوجے ہوئے چہرے پر رومال باندھا اور مجھ سے گھر چلنے کو کہا۔ میں نے انکار کر دیا۔

میں جانتا تھا کہ وہاں کفن دفن کے بعد رسم کے مطابق شراب کا دور چلیگا اور شاید چیخم دھاڑ اور جھگڑے ہوں گے۔ ابھی ہم گرجا گھر ہی میں تھے کہ میں نے میخائل ماسوں کو یاکوف ماسوں سے کہتے سنا تھا:

''کیوں آج ڈٹ کر پلانی ہوگی نا، ایں؟''

کبوتر میرا جی خوش کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ٹھوڑی پر مہمیز چڑھالی اور زبان سے اس کو چھونے کی کوشش کی۔ یاز کا باپ ضرورت سے زیادہ زور زور سے قہقہے لگا رہا تھا اور چیخ رہا تھا:

''ذرا دیکھنا۔ کیا تماشا رچا رہا ہے لونڈا! ہاں ذرا دیکھنا!''

لیکن جب اس نے دیکھا کہ اس سے میں بہل نہ سکا تو وہ گمبھیر ہو گیا۔ ''بس، بس! ہمت سے کام لو! ہر جاندار کو موت کا مزا چکھنا پڑتا ہے۔ چڑیاں بھی مرتی ہیں۔ سنو! اگر کہو تو میں تمہاری ماں کی قبر کے چاروں طرف گھاس لگا دوں۔ کیوں کیا کہتے ہو؟ چلو میدان میں چلیں اور گھاس جمع کریں — تم، میں اور کبوتر... اور میرا یاز بھی۔ مٹی سمیت گھاس اکھاڑیں گے اور قبر کے چاروں طرف بڑی خوبصورتی سے لگائیں گے — کوئی دوسری قبر اس کے مقابلے کی نہیں ہوگی!''

یہ بات میرے دل کو لگ گئی اور ہم میدان کی طرف چل دئے۔

میری ماں کے کفن دفن کے چند دن بعد میرے نانا نے مجھ سے کہا:

''ہاں الیکسئی، تو میرے گلے میں پڑا ہوا تمغہ تو ہے نہیں جو لئے لئے پھروں! اب تیرے لئے یہاں جگہ نہیں۔ تجھے تو کب کا دنیا میں قدم نکالنا چاہئے تھا...''

سو میں نے دنیا میں قدم نکالا اور زندگی کی شاہراہ پر چل پڑا۔

۱۹۱۳ء